''چہارسُو''

مصوّرِ تذکرے

..... اردو کے 100 نامور شاعر .....

''اردو کے ۱۰۰ نامور شاعر'' (مصورے تذکرے) کو میں نے برسوں پہلے ترتیب دیا تھا مگر اس کی اشاعت پر غیر معمولی اخراجات کی وجہ سے اسے شائع کرنے سے قاصر رہا۔ ہندوستان سے کونسل کی مالی معاونت کی بدولت میں اسے شائع کر سکا جس کے لیے میں قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے اراکین کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے عزیز دوست اور موجودہ عہد کے نامور تذکرہ نگار، ادیب و صحافی فاروق ارگلی صاحب کا بھی تہہ دل سے ممنون و شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازنے کے علاوہ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میری قدم قدم پر مدد کی۔ اب اس کتاب کو نظر ثانی و اضافے کے ساتھ دوبارہ سے پاکستان کا نامور اشاعتی ادارہ ''بک کارنر'' (جہلم) بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے بلاشبہ ڈائریکٹر امر شاہد صاحب میرے شکریے کے حقدار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُردو کی ترویج کے لیے ''بک کارنر'' کے اشاعتی پروگرام کا ایک جزو ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

..... نند کشور وکرم

قیمت: ۱۵۰۰ روپے، دستیابی: بک کارنر، جہلم، پاکستان۔

..... لفظ بولتے ہیں .....

قیصر نجفی جانے پہچانے شاعر اور ادیب ہیں۔ انہوں نے طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے اور مسلسل کام سے ادبی شناخت کا مرحلہ سر کیا ہے۔ عصری ادب کے تناظر میں اُن کی شناخت کا پہلا حوالہ تو یقیناً شاعری ہے۔ اُن کے نہ صرف متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں بلکہ سارا کلام کلیات کی صورت میں بھی مرتب ہو کر اہلِ نظر تک پہنچ چکا ہے۔ اس عرصے میں قیصر نجفی کے تنقیدی مضامین بھی تواتر کے ساتھ ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی وہ ادبی حلقوں میں اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ اس پہچان میں ان کی تجزیاتی نظر اور تنقیدی مزاج نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ وہ چاہے کسی تخلیق کار پر قلم اٹھائیں یا کسی فن پارے پر ان کی نگاہ تجزیے کے پہلو دیکھ لیتی ہے اور تنقیدی مزاج گفتگو طلب نکات پیدا کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیصر نجفی کے تنقیدی مضامین محض خامہ فرسائی کے شوق کا نہیں، بلکہ مطالعاتی ضرورت کا حاصل معلوم ہوتے ہیں۔ نقاد موضوعات کے انتخاب سے ہی اپنے تنقیدی منہاج کو واضح کر دیتا ہے۔ قیصر نجفی نے معروف ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ کچھ ایسے تخلیق کاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے، جن تک نقادوں کی نظر کم ہی پہنچتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موضوع کا انتخاب رواداری میں نہیں بلکہ داخلی مطالبے پر کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مضامین اُن کے زاویۂ نگاہ اور ادبی معیارات کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے تنقیدی مطالعات کا یہ مجموعہ اہلِ نظر سے اپنے حصے کی داد پائے گا۔

..... پروفیسر سحر انصاری

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار۔ کراچی۔

..... بوری میں بند آدمی .....

نجم الحسن رضوی کے افسانے ہم سے باتیں کرتے ہیں۔۔۔ افسانہ نگاری ان کے یہاں فنی عبادت ہی نہیں معاشرتی فریضہ بھی ہے۔ وہ ہیئت اور اسلوب کے نئے نئے تجربات کے خوگر ہیں مگر ہر نئی ہیئت اور ہر تازہ اسلوب گنجینۂ معنیٰ کا طلسم اور ترسیلِ معنیٰ کا اسم ہے۔ جدتِ طبع اور سلاست اظہار ان کے یہاں سوتین نہیں زوجین ہیں۔ خیال انگیزی اور معنیٰ آفرینی کی دُھن میں وہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرتے کہ وہ کہانی کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا فن اور بہت کچھ کہنے سے پہلے افسانہ نگاری کا فن ہے۔

..... پروفیسر فتح محمد ملک

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار۔ کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۶،شمارہ:ستمبر،اکتوبر۲۰۱۷ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِسالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

رابطہ:537/D-1،گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

ملت کا نشاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقبال بھٹی ۶
جز و کل کا سفیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۸
کلیاتِ گلزار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار دہلوی ۱۰
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۲
حسرتِ عمر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۸
اردو تہذیب کا دوسرا نام۔۔۔۔۔۔قرۃ العین حیدر ۲۴
سائنس اور شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔خواجہ احمد عباس ۲۶
صحبتِ آدمی مبارک۔۔۔۔۔۔سید ضمیر احمد دہلوی ۲۸
ہفت زبان مجموعۂ خوبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید حامد ۳۰
اردو کا سچا عاشق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احمد سہیل ۳۱
تیغِ بے نیام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاروق ارگلی ۳۲
غازئ ملت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۳۵
دلّی کی مشترکہ تہذیب۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار دہلوی ۴۱

نغمۂ محمدی

جان وولف گانگ فان گوئٹے۔ ۴۴

افسانے

شبِ ہراس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حسن منظر ۴۶
آرام گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احمد کلیم ۵۰
کھلونا جان کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بشریٰ رحمٰن ۵۳
منزل ہے کہاں تیری۔۔۔۔۔۔۔نجم الحسن رضوی ۵۵
شاک تھراپی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مہتاب عالم پرواز ۵۸

مسیحائی کا دعویٰ

محمود الحسن، آصف ثاقب، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، قیصر نجفی، رؤف خیر، نسیم سحر، عرش صہبائی، کرامت بخاری، اشرف جاوید۔ ۶۱

افسانے

کھوج کا سفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا اصغر ۶۶
آخری پڑاؤ کا مسافر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حنیف باوا ۶۷
دو نیناں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۶۹
لوح لاعی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۷۳
ہرنام داس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۷۶

جہادِ زندگانی

زیبا سعید، ایم کے بھان تمنا، شگفتہ نازلی، عطاء الرحمٰن، عارف شفیق، سیفی سرونجی، ابراہیم عدیل، امر مہکی، احسان قادر، ظہیر اقبال زیدی، ظفر علی ظفر، نوید سروش۔ ۸۰

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۴

گلیوں میں بھٹکتی بھوک

شاہ رخ حیدری، پروین شیر، یوگیندر بہل، یونس صابر، ڈاکٹر ریاض احمد، وشال کھلر، فرح کامران، آفتاب مضطر، شگفتہ نازلی، ڈاکٹر انیس الرحمٰن۔ ۹۰

آئینۂ فن

دعا زمین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیصل عظیم ۹۷
میرے کشکول میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معین کمالی ۹۸
جب تصور ماں کا ہو۔۔۔۔۔۔جاوید اختر چودھری ۹۹

ڈرامہ

کام دھنیو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلام بن رزاق ۱۰۱

زندگی نایاب ہے

ڈایالیسس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۱۰۸

عشق داجادو

ساوے پتر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سردار موہن سنگھ ۱۱۱

ایک صدی کا قصہ

ایل وی پرساد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار ۱۱۵

☆

قرطاسِ اعزاز

گلزار دھلوی

کے نام

خدا بن کر ہے کعبہ میں، صنم بن کر شوالے میں
بتِ نادیدہ کا دیکھو کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

پھول کانٹوں کو تھپیڑوں کو صبا کہتے ہو
جانے کس دور کے تم لوگ ہو، کیا کہتے ہو

کس قدر یہ غم اٹھالیتا ہے انساں دہر میں
ہے تعجب زندگیِ مختصر کو دیکھ کر

بڑھتی جاتی ہے تعصب اور نفرت کی ہوا
کچھ تدارک ایسی آندھی کا خدارا کیجئے

ان کے چہرے سے نمایاں تھی عجب گھبراہٹ
گر وہی درد مرے رخ سے عیاں ہوجاتا

خموش بیٹھے ہیں فنکار ذہن گروی ہیں
کچھ ایسی فکر کی توہین تو کبھی نہ ہوئی

زلفِ سیاہ رخ پہ ہے کاکل بھی خال بھی
ہندو چلو میں کتنے ہیں قرآں لیے ہوئے

فیصلہ ہوجائے گا ہاں! حشر میں دو دن کے بعد
شیخ! کرنے دیجئے دو دن تو من مانی مجھے

ملت کا نشاں

اقبال بھٹی
(برمنگھم)

نام — پنڈت آنند موہن زتشی
قلمی نام — گلزار دہلوی
پیدائش — ۷؍جولائی ۱۹۲۶ء، دہلی بازار سیتارام
(میٹرک کے سرٹی فکیٹ میں (۱۹۲۵ء)
تعلیم — دہلی یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی۔ ادیب فاضل (آنرز اِن اُردو) اور منشی فاضل (آنرز اِن فارسی) پنجاب یونیورسٹی لاہور) رامجس اسکول، سنکرت اسکول، ہندو کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔
والد — پنڈت تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی
والدہ — شریمتی برج رانی زتشی، بیزارؔ دہلوی المعروف وکٹوریہ زتشی۔
دادا؍دادی — پنڈت منوہر ناتھ زتشی؍رجنی رانی زتشی
بھائی — دینا ناتھ زتشی۔ جگ موہن ناتھ، جواہر موہن زتشی رتن ناتھ موہن خارؔ دہلوی۔
بہنیں — برج موہنی کول۔ انیلا کماری اُکھل
اولاد — ایک بیٹا (انوپ زتشی)۔ ایک بیٹی (بینا آگرا)
سخنی اساتذہ — پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی (جانشین حالیؔ)
نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی (جانشین داغؔ دہلوی)
پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ
مولوی عبدالحق (بابائے اُردو)
مشاغل — تحریکِ آزادی کے دوران کانگریس پارٹی کی قومی تحریک میں حصہ لیا اور جلسوں میں نظمیں پڑھتے اور تقاریر کرتے رہے، نیز مشاعروں اور ڈراموں میں شرکت بھی کی۔ ''اسٹوڈنٹ کال'' اور اندر پرستھ کی ادارت کے فرائض بھی نبھائے۔۔اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے ادارے نیشنل کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل کے ماہنامہ ''سائنس کی دنیا'' کے بانی مدیر رہے اور اسی محکمہ سے بحیثیت ڈائرکٹر سبکدوش ہوئے۔
مشاعرے — ۱۹۴۳ء سے نہ صرف ہندوستان میں مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں؛ بلکہ عالمی مشاعروں میں شامل ہوتے رہے (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء)، ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء) اور پھر لگاتار ۱۹۹۶ء سے اب تک۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور خلیجی ممالک میں متعدد بار عالمی مشاعرے پڑھے۔ لگ بھگ ۵۰ کے قریب ممالک میں مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

مطبوعات:

۱۔ گلزارِ غزل (شعری مجموعہ)
۲۔ گلزار دہلوی کی مطبوعات
۳۔ للکار (آزادی سے قبل انقلابی نظموں کا مجموعہ)
۴۔ لنکن کے دیس میں (امریکہ کا سفر نامہ)
۵۔ بیرسٹر آصف علی (شخصیت اور سوانح)
۶۔ کہکشاں (منظومات کا مجموعہ)
۷۔ کلیاتِ گلزار دہلوی

ایوارڈز و اعزازات:

۱۔ ورلڈ آف پیس فیسٹول برلن (جرمنی) میں 104 ممالک کے شعری اجتماع میں شیلڈ۔
۲۔ روپ آف آنر اور 3000 فرانک کا انعام (1951)
۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجاہدِ اردو و شاعرِ قوم کا خطاب (1952) نشانِ امتیاز پاکستان (1976)
۴۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی میموریل لکھنؤ کا میر انیس ایوارڈ اردو ہندی سنگم کا میر تقی میر ایوارڈ (لکھنؤ)
۵۔ غالب ایوارڈ (غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی)
۶۔ اقبال ایوارڈ (لاہور یونیورسٹی)
۷۔ اختر شیرانی ایوارڈ (اختر شیرانی میموریل کونسل اسلام آباد)
۸۔ مصحفی عالمی ایوارڈ (انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان)
۹۔ مرزا غالب ایوارڈ (حیدرآباد اردو اکیڈمی)
۱۰۔ ہر گوپال تفتہ ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی)
۱۱۔ فراق گورکھپوری عالمی ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی)
۱۲۔ جوشؔ ملیح آبادی ایوارڈ (جوشؔ اکیڈمی کراچی)
۱۳۔ میکش ایوارڈ (بزمِ میکش آگرہ)
۱۴۔ مولوی عبدالحق ایوارڈ (انجمن ترقی اردو ہند)
۱۵۔ رادھا رمن میموریل ایوارڈ (دہلی کانگریس کمیٹی)
۱۶۔ اندرا گاندھی میموریل کا قومی ایوارڈ
۱۷۔ سماج رتن ایوارڈ (راجیو گاندھی نیشنل فاؤنڈیشن)

۱۸۔ دبئی اور جدہ کی انجمنوں کی جانب سے خصوصی ایوارڈز

القاب وخطابات:

۱۔ بابائے اُردو (شکاگو، امریکہ سے)

۲۔ امامِ اُردو (نیویارک سے)

۳۔ شاعرِ قوم، گلزارِ خسرو (درگاہ نظام الدین، سلطان جی میں بدر پنڈت نہرو اور مولانا آزاد و پیر ضامن نظامی)

۴۔ افتخارِ اُردو، آفتابِ اُردو و غوث اُردو (امام باڑہ ایجکو کیشن سوسائٹی ممبئی)

۵۔ شمس الادب (رائے پور)

۶۔ آفتابِ نظامی (آستانہ محبوب الٰہی)

پچاسیوں خلعت، دستاریں، شال مومنٹو، ایوارڈ و تحائف، لاتعداد۔

جملہ درگاہوں پر مدعو ہوا اور اعزاز حاصل کئے:

اورنگ آباد، گلبرگہ لاہور۔ بڑا دربار اجمیر شریف، غریب نواز کی درگاہ وغیرہ۔

پتہ: سی۔۹۹، سیکٹر ۲۶ نوئیڈا۔۲۰۱۳۰۱ (اُتر پردیش)

فون: ۰۱۲۰۔۲۵۳۱۹۲۶

موبائل: ۸۸۶۰۸۴۴۰۴۳

☆ گلزار دہلوی صاحب کی حیات اور کارنامے آپ کی سہولت کے پیش نظر انتہائی اختصار سے پیش کیے گئے ہیں وگرنہ جناب گلزار دہلوی کی حیات اور کارنامے ایک سے زائد کتب کا تقاضا کرتے ہیں۔ اسّی (۸۰) برسوں پر پھیلی ہوئی علمی، ادبی، مذہبی، سماجی، اخلاقی خدمات کا احاطہ کرنا وہ بھی اختصار سے کسی کارِ دارد سے کم نہ تھا۔ ہماری کم مائیگی یا وسائل کی قلت نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ اسے قبول و منظور فرمائیں گے تو ہم اسے اپنی کامیابی سے تعبیر کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ (گ۔ج)

''کراچی میں بہار''

گلزار صاحب دہلوی سلمہٗ کراچی کیا آئے گویا بہار آ گئی۔ دلّی کی اردو، سراپا ہوکر ان کی صورت میں کراچی کی ادبی محلفوں میں چھا گئی۔ ان کی بدولت جلسوں اور مشاعروں کی خوب چہل پہل رہی۔ جگہ جگہ ان کی گل افشانی تقریر نے اردو کے آبشار بہا دیئے۔ کراچی والے ان کی زبان دانی اور قدرتِ بیان پر حیران بھی تھے اور داد و تحسین بھی کر رہے تھے۔ گلزار صاحب اردو کی جو بے لوث خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے اور ان کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے۔ مجھے یقین ہے وہ اردو ادب میں حضرت علامہ دتاتریہ کیفی وسائل دہلوی اور زار دہلوی کے جانشین و یادگار ثابت ہوں گے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا کلام شائع ہوکر جب بھی سامنے آئے گا تو اردو دنیا اس کا دل سے استقبال کرے گی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ دلّی اور ہندوستان سے اردو کبھی نہیں مٹ سکتی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

''چکبستِ ثانی''

میرے پیارے بھائی اور دوست پنڈت گلزار دہلوی خلف جناب پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی اردو کے نوجوان قومی شاعر ہیں، اپنے بزرگوں کی وضع قطع اور علم و ادب کو سرمایۂ زندگی سمجھتے ہیں۔ اردو کے فدائی اور شیدائی بھی ہیں اور باکمال شاعر ہیں میری دعوت پر آستانہ کے عرس کے جلسوں میں اور مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے ہیں۔

میں انہیں ۱۹۳۸ء سے جانتا ہوں۔ اور ان کی خداداد صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ وہ یقیناً داغ اور چکبست دونوں کے رنگ کے عظیم شاعر مانے جائیں گے۔ میں تو ان کا اب بھی قائل ہوں اور انہیں ''چکبستِ ثانی'' کہتا ہوں۔ اور ان کو اپنا دوست اور بھائی سمجھتا ہوں۔ وہ یقیناً آزادیٔ وطن کے بعد نئے دور میں اردو کے نقیب اور بلبلِ اردو تسلیم کیے جائیں گے۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

میں نے منادی میں بھی جگہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی شمس العلماء

''جزوکل کا سفیر''

(گلزار صاحب کے کلامِ عقیدت سے تبریک)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

۔ حمد ذاتِ باری ۔

تری ذات ذاتِ قدیم ہے، تری ذات ذاتِ عظیم ہے
تو ندیم ہے، تو نعیم ہے، تو کریم ہے، تو رحیم ہے

تو ہی آس ہے، تو ہی پاس ہے، تو امید ہے، تو ہی بیم ہے
تو سلام ہے، تو سلیم ہے، تو کلام ہے، تو کلیم ہے

تو ہی حسن ہے، تو ہی عشق ہے، تو ہی ابتدا، تو ہی انتہا
تو ہی کیفِ روزِ ازل بھی ہے، تو ابد کا اصل حکیم ہے

تو فرید ہے، تو حمید ہے، تو انیس ہے، تو نفیس ہے
تو ولید ہے، تو شہید ہے، تو ہی جبر ہے، تو حلیم ہے

تو ہی ملک ہے، تو ہی مِلک ہے، تو مُلک بھی ہے، تو مَلِک بھی ہے
تو ہی مالکِ شب و روز ہے، تو علمِ کل کا علیم ہے

تو حبیب ہے، تو طبیب ہے، تو نصیب ہے، تو حسیب ہے
تو شفیق ہے، تو رفیق ہے، نہ کسی کا غیر و غنیم ہے

تو حجاب بھی، تو ہی ماورا، تو ہی دینِ حق کی سنے صدا
تیرے کل مکاں، تو ہی لامکاں، تو ہی نُہہ فلک کا ندیم ہے

تو وکیل ہے، تو جلیل ہے، تو ہی مور ہے تو ہی فیل ہے
تو جمیل ہے، تو خلیل ہے، تو لحیم ہے، تو شحیم ہے

تو ہی غیب ہے، تو شہود ہے، ترے کن سے ساری نمود ہے
ترا نطق نطقِ رسول ہے، تو ہی انبیاء میں جسیم ہے

تو ہی ابر ہے، تو ہی سائباں، تو ہی قہر بھی ہے، لطیف بھی
تو حلیف بھی، تو حنیف بھی، یہی تیرا لطفِ عمیم ہے

تو مکاں بھی ہے، تو ہی لامکاں، تو زماں بھی ہے، تو ہی بے زماں
تو سمیع ہے، تو بصیر ہے، تو ہی فیضِ نورِ کلیم ہے

تری فکر ہے، ترا ذکر ہے، تری حمد ہے، تری ہے ثناء
تو ہے ہر ثناء سے بھی ماورا، یہی تیری ذاتِ کریم ہے

تو قدیر ہے، تو نذیر ہے، تو ہی جزوکل کا سفیر ہے
تو نسیمِ باغِ خلیل ہے، گلِ زآر کی تو شمیم ہے

ختم المرسلین

رسول مقبولؐ حضرت محمد ﷺ کے عکس!

... درِ نعت ...

(بہ زمین علامہ اقبال)

ع ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ہوا نور عور حقیقتاً تھا عیاں لباسِ مجاز میں — نظر آئی جس کی جھلک ہمیں تنِ ہاشمیؐ مجاز میں

بہ خدا احد ہوا جلوہ زا جو جہاں کی محفلِ ناز میں — تو چھپائے احمدؐ پاک کے نہ چھپا وہ میمِ دراز میں

نہ تھی خود فروشی و خود سری کبھی احمدؐ ہمہ ناز میں — نہ مگر جلالِ احد چھپا کبھی اس کے رنگِ نیاز میں

تو ہی ابتدا تو ہی انتہا تو ہی مصطفےٰ تو ہی مجتبےٰ — تو ہی سوز میں تو ہی ساز میں تو ہی ترک میں تو ہی تاز میں

تو ہی آنِ حق تو ہی شانِ حق تو ہی کانِ حق تو ہی جانِ حق — تھی الوہیت کی صدا نہاں صوتِ نغمہ طراز میں

تیری چشم نور ہی اصل تھی کہ بصیرتی دم وصل تھی — کہ سوئی نہ آئینہ حیرتی جو مجاز آئینہ ساز میں

تیر مکّہ کعبۂ فرش ہے تو مدینہ قبلۂ عرش ہے — کہ جہاں حبیبؐ خدا رہا تو خدا سے ناز و نیاز میں

تو ہی خضرِ راہِ پیمبراں تو ہی مرشدِ ہمہ مرشداں — ہیں زمانے بھر کے بشر سبھی تیری چشمِ لطف کی آز میں

خس و خار کی تو بہار ہے ''گلِ زارؔ'' کا تو نکھار ہے
ہے شکوہِ ابن سبک تگیں تیرے انکسار ایاز میں

○

''کلیاتِ گلزار''

گلزار دہلوی

گلزارؔ نواز اور اردو دوست قارئین سے مخاطب ہونے سے پہلے یہ اعتراف ضروری ہے کہ میرے عزیز دوست (بالکل مثل حقیقی برادر خورد کے) جناب اعجاز مقبول (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ) کی دلی خواہش اور مسلسل مطالبے اور تقاضوں پر میں اپنا بہت سا کلام جمع کر کے ان کو برائے طباعت واشاعت پیش کر سکا۔ اس ''کلیاتِ گلزار'' میں حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، نوحہ، تاریخی نظمیں، اظہار عقیدت، ہندوستان کے موسم، موسمی تہوار، ہندو، مسلم، سکھ، جین، معمارانِ قوم و وطن، ادب ساز شخصیات، فرقہ پرستی و تعصب و تنگ نظری کی مذمت، حسن سلوک و رواداری و یکجہتی، عالمگیر امن و آفاقی اخوت، غیر ممالک کے سربراہ حکام اور رہنماؤں کی آمد، تحریک ریشمی رومال، اسیران مالٹا، ہوم بنگال تحریک، خلاف تحریک، عدم تشدد و عدم تعاون کے ساتھ ساتھ انقلابی، مجاہدین اور اسی کے ساتھ حسن و جمالیات، روحانیت، توحید خالق و توحید نوع بشر، مخلوق خدا، داخلی و خارجی واردات قلب، مشاہدات و تجربات، انسانیت دشمن، وطن دشمن، اردو دشمن اور اقلیت دشمن غاصبوں اور فسطائیوں کی گوشمالی نیز سہرے، رخصتی، مبارکبادیاں، ساقی نامے، ہندوستان پر جنگی حملہ اور اسلاف کی اقدار و چلن کو اخلاف تک منتقل کرنے کی سعی میں کہا گیا کلام، کل ہند، ہندو پاک، عالمی تعلق خاطر، مشرق و مغرب، عرب و عجم سے یورپ و امریکہ تک کے سفر کی کہانیاں، اظہار تشکر اور گلزار نوازوں کا ٹوکرہ سب کچھ اس میں شامل کر دیا ہے۔

اگر گاندھی، ٹیگور، موتی لال نہروؔ کا ذکر ہے تو شیخ الہند، شیخ الاسلام، ابو حنیفہ و ہندی مجاہد ملت اور امام الہند و عمان الہند کا بھی تذکرہ ہے۔ اسی طرح میر تقی، میر انیس، غالب، داغ، اقبال، مولانا حسرت موہانی، جوش، جگر، مجروح، جعفری، حفیظ، مولانا محمد علی جوہر اور معاصرین پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

خدائے واحد، شری رام چندر جی، شری کرشن جی، رسول مقبولؐ کے ساتھ مہاویر جین سوامی، بابا گرونانک جی اور سماجی و روحانی مصلح اور پیشواؤں کو بھی خراج پیش کیا گیا ہے اور بالخصوص اردو زبان کی تخلیقی، تنظیمی، جماعتی اور قومی و سماجی خدمات کے ساتھ بھی آزادی وطن اور تقسیم ملک کی پاداش میں اردو دشمنی کی فضا کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں اردو زبان اور ادب کی ہر پہلو پر بقا، تحفظ و تبلیغ، تعلیم و تدریس اور تحریک جہاد سے وابستہ قوم پرستانہ، نظمیں رباعیات و قطعات وغیرہ جس سے اردو کا غیر متعصب، ہمہ مذہبی، ہمہ نظریاتی، ہمہ جماعتی، بین الملل، بین الریاستی و بین الاقوامی مقدمہ بھی منعکس کیا گیا ہے۔ دلی سے نیویارک (یو این او) اقوام متحدہ پر ۵۵ سے زائد ممالک میں اردو کی تبلیغ رقم کر دی گئی ہے۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت پیر ضامن نظامی صاحب نے حکومت ہند، کانگریس، جمعیۃ العلماء ہند، جمعیۃ الصوفیاء اور ادارہ نظامیہ یا انجمن ترقی اردو (ہند)، انجمن تعمیر اردو دہلی، انجمن ترقی پسند مصنفین نے جو اقدامات بھی اردو کے تحفظ و بقا کے لیے اٹھائے اس کی بھرپور تائید پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اپنے والد ماجد علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ زتشیؔ زارؔ دہلوی یادگار داغؔ (استاد عربی و فارسی و اردو)، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، بابائے اردو علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی، یادگار حالی اور ابوالعظم نواب سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی، جانشنی و داماد داغؔ، میرے اساتذہ و معلم و مدرس و اتالیق بزرگوں کو بھی خراج پیش کیا ہے۔ جن کے فیض صحبت و اصلاح و تربیت سے کچھ اعتبار ادب حاصل کر پایا جس کی تمام عالم میں اردو دنیا کے ادبی حلقوں نے مدح و تحسین فرما کر طرح طرح کے متعدد اعزازات، خطابات و القاب، ایوارڈز (شیلڈ، تمغہ، میمنٹو، سپاسنامہ، سند توصیفی سے نوازا)۔

دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ، رامپور، بھوپال، حیدر آباد (دکن)، پٹنہ، بمبئی، کلکتہ، بنگلور، کالی کٹ، کھنڈوہ، آگرہ، شاہجہانپور کے علاوہ لاہور، کراچی، اسلام آباد، جدہ، ریاض، تہران، جرمنی، روس، پولینڈ، لندن، دوبئی، دوحہ، قطر، مسقط، عمان اور شکاگو سے کیلی فورنیا اور واشنگٹن، نیویارک، کولمبس، اٹلانٹا سارے شمالی امریکہ میں ہر جگہ اعزاز و استقبال و خطاب و ایوارڈ سے نوازا گیا۔ عمر کے ۸۳ ویں سال مین پہنچ رہا ہوں (۷۔ جولائی ۲۰۱۰ء کو یہ عمر ہم آغوش ہو گی)۔ دہلی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ایل ایل بی، ادیب فاضل، منشی فاضل تک تعلیم حاصل کی۔ تحریک آزادی میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن، اسٹوڈنٹ کانگریس اور یوتھ کانگریس کا ساتھ دیا۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند کی ہر تحریک و اقدام، ہر کانفرنس اور اجلاس میں سارے ملک میں شریک ہوتا رہا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابو الکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر شنکر دیال شرما، اندرا گاندھی، وجے لکشمی پنڈت، ماتا را میشوری نہرو، پروفیسر ہمایوں کبیر، فخر الدین علی احمد، لالہ رادھا، لالہ شام ناتھ، لالہ دیش بندھو گپتا، آصف علی بیرسٹر، ارونا آصف علی، میر مشتاق احمد حضرات نے ہمیشہ نوازا اور حوصلہ افزائی کی اور ساتھ رکھا۔ پہلی کتاب بنام ''للکار'' (برطانوی سامراج کے خلاف احتجاجی اور وطن پرستی کی سیاسی و انقلابی وغیرہ) لالہ دیش بندھو گپتا جی نے اپنے روزنامہ ''تیج'' پریس سے شائع فرمائی تھی (جو ضبط ہوئی)۔

آزادی کے بعد فسادات، اردو پر پتا کا وہ دور ہوا کہ تصنیف کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔ تمام وقت تحفظ اردو کے اور انجمن تعمیر اردو دہلی کے قیام اور ادبی بساط بچھا کر اردو کا قومی یکجہتی کا بگل بجایا اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک باقاعدہ مسلسل ہفتہ وار، پندرہ

روزہ، ماہنامہ، جلسے، مشاعرے، اردو کنونشن و کانفرنس منعقد کی۔ ماہانہ طرحی مشاعرے کئے۔ ہندو پاک اور ساری دنیا کے اردو دانشوروں کو دہلی بلا کر انجمن میں استقبال کیا۔ پھر ۱۹۹۷ء میں ادارہ ''الیوم'' سے جناب محمد خضر صدیقی ایڈووکیٹ نے ''گلزار غزل'' مجموعۂ کلام شائع کیا۔ ۱۹۹۷ء میں امریکہ شکاگو میں خلیل الزماں خاں، سیکرٹری جامعہ المنائی ایسوسی ایشن کی طرف سے استقبال کیا اور ''گلزار خلیل'' کے نام سے ایک انتخاب کلام شائع کیا۔ ۱۹۸۹ء میں نیشنل بک ٹرسٹ (حکومت ہند) نئی دہلی کی طرف سے سید امان الرحمٰن اردو ایڈیٹر ''NBT'' نے ''آصف علی دہلوی'' پر میری ایک کتاب شائع کی۔ الیوم روزنامہ، تخلیقی کار دہلی، شیشہ و تیشہ، بنگلو نے خصوصی گلزارؔ نمبر شائع کیے جس میں خواجہ احمد عباس، منشی گوپی ناتھ، امن لکھنوی، سید احمد ہاشمی ایم پی، سید زادہ رضوی، مدیر آستانہ، کاوش بدری مدراسی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؔ، علامہ دتاتریہ کیفی، علامہ زارؔ دہلوی (والد ماجد) اور بے شمار دانشوروں کے مضامین، تبرکات اور پیغامات شامل کیے گئے۔ احباب کے مضامین اور نظمیں جو مجھ پر کہی گئیں اور میرا کلام ان میں شائع کیا گیا۔ الٰہ آباد سے گومکیا صاحب نے ہندی میں ۱۹۸۰ء میں میرا تعارف اور نمونۂ کلام مختصراً (دیوناگری) میں شائع کیا۔

اب اردو اکاڈمی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب فاروق اور عزیز نوجوان شاعر معین شاداب کی فرمائش پر وہ حضرات میرے انتخاباتِ کلام اور زندگی کی یادداشتیں، داستانِ حیات وغیرہ ریکارڈ کریں گے اور شائع کریں گے۔ ان سب حضرات سے پہلے جناب اعجاز مقبول صاحب نے فتح پائی اور وہ میرا وافر کافی ووافی کلام (ہفت رنگ) شائع فرما رہے ہیں جس کا نام ''کلیاتِ گلزار'' تجویز کیا گیا ہے۔

مجھے اپنے کلام اور خدمات پر کوئی فخر یا دعویٰ تو نہیں ہے مگر ہاں یہ تسلی ضرور ہے کہ میرے دس پشتوں سے آباء اجداد نے (۳۵۰ سال سے شاہجہاں بادشاہ کے دور سے شہزادوں کی اتالیقی پر مامور ہو کر کشمیر سے دلی بلائے گئے)۔ اس زمانے سے میرے والد تک جو اردو زبان، مشترکہ تہذیب، گنگا جمنی تمدن اور بین الادیان و بین المللی و بین الاقوامی چھوڑی ہیں ان کا تحفظ اور تبلیغ کر کے اخلاف تک ورثہ میں چھوڑنے کی توفیق کو مجتمع کر کے اردو دوستوں سے گفتگو کروں۔ ۸۵ سال میں سے ۸۷ سال اردو کی تخلیق و تعلیم اور ۵۸ سال اس کے تحفظ، بقاو تبلیغ میں گذارے ہیں اور اس سپاہیانہ جہادی زندگی سے موقع پا کر جو کچھ لکھ سکا اس کا بیشتر حصہ اب اعجاز مقبول صاحب ''کہکشاں ہفت رنگ'' کی شکل میں شائع کر رہے ہیں جس کا نام ''کلیات گلزار'' رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بے شمار و کثیر مضامین، مقالہ، تبصرہ، پیش لفظ، تعارف اور مقدمہ نثر میں بھی میں نے سپردِ قلم کئے ہیں نیز ان تمام علماء و زعماء، رہنماؤں اور اساتذۂ ادب جن کی قربت میں رہا ان پر بھی بے شمار مضامین تحریر کئے ہیں۔ اسی طرح نظمیں بھی خراج عقیدت میں کہی ہیں اور مزید لطف یہ ہے کہ برصغیر ہندو پاک کے برگزیدہ و اہم ادیبوں، شاعروں اور استادوں نے اور مشاہیر ہند نے مجھ پر مضامین اور منظومات کہی ہیں اور صدر، نائب صدور، وزیر اعظم اور دوسرے زعماء و رہبروں نے پیغامات ارسال کیے ہیں جو سلور جوبلی، گولڈن جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی، پلاٹیم جوبلی اور دوسرے ''جشن گلزار'' کے انعقادات کے دوران بہت سے اہم مقالہ پڑھے گئے ہیں وہ سب الگ طباعت کے متقاضی ہیں۔ اللہ توفیق دے گا تو وہ تمام نثری مضامین (میرے مضامین یا مجھ پر لکھے گئے مضامین، منظومات وغیرہ) وہ بھی عنقریب شائع کرنے کی سبیل نکالی جا رہی ہے۔ فی الحال سردست آپ حضرات اعجازؔ کا یہ مقبولؔ اقدام دیکھئے اور راقم و خادم ادب اور مجاہد اردو، کافر ہندی، مجذوب اردو، فقیر نظامی، سفیر دلّی، یاد اسلاف اور یادگار زارؔ و کیفیؔ و سائلؔ کی اضطراری کیفیات کی منظوم ترتیب سے لطف اٹھائیے:

''گر قبول افتد زہے عزّ و شرف''

ناسپاسی ہوگی اگر یہ تمہید ختم کرنے سے پہلے میں اپنے دوسرے مربّی جناب حسن ضیاء صاحب (سینئر مدیر ''ایمپلائمنٹ نیوز'') کا بھی شکریہ ادا نہ کروں، جن کی ژرف نگاہی نے اس کلیات کی کتابت و تحریر پر نظر ثانی کر کے دل و جان سے محنت کر کے اسے آخری شکل تک پہنچایا ہے۔ اگر اب بھی سہواً املا کی کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اسے اپنے حسن نظر سے درست کر لیں۔ شکریہ! مزید تعاون اور مخلصانہ کتابت (کمپیوٹرائزڈ ٹائپ) عزیزم میاں محمد پرویز عالم نے انجام دی اور بڑی توجہ اور تن دہی سے مہینوں کی محنت کے بعد اسے آخری شکل تک پہنچایا جس کا اعتراف اور شکریہ بھی یہاں ضروری ہے۔ میں اپنی اس کاوش کو اپنے سرپرست و محسن، بزرگ اساتذہ اور اسلاف کی نذر کرتے ہوئے میاں اعجاز مقبولؔ کے شکریہ پر اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ:

تاریخ اب جو ہوگی مرتب زبان کی
گلزارؔ دہلوی کو بھلایا نہ جائے گا

قابلِ ناز فرزند

میاں گل زارؔ، میرے محترم بزرگ حضرت زارؔ دہلوی کے قابلِ ناز فرزند اور نہایت ہونہار شاعر ہیں۔ ان کو تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے۔ خیالات میں جزرمد اور زبان میں روانی ہے۔ کیوں نہ ہو، خاندانی شاعر اور دہلی کے باشندے ہیں۔ گلزار صاحب کی جو روش سب سے زیادہ مجھ کو پسند ہے وہ ان کی اردو سے والہانہ شگفتگی اور مردانہ تبلیغ ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ میاں گل زارؔ شاعر کی حیثیت سے مانے اور اردو کے شیدائی کی حیثیت سے پوجے جائیں۔ اور ان کا کلام طباعت کے افق سے شائع ہو کر دنیائے ادب کو جگمگا دے۔

جوش ملیح آبادی

براہِ راست

پنڈت آنند موہن زتشی المعروف جناب گلزار دہلوی کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی خدمات کا دائرہ اس قدر وسعت کا حامل ہے کہ اگر ہم اپنی تمام تر توانائی کام میں لاتے ہوئے گلزار صاحب محترم کی کسی ایک شعبہ میں کی گئی خدمات کا احاطہ کرنا چاہیں تو اُس کے لیے چہارسو کے چند صفحات نہیں بہت سی اشاعت درکار ہوں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ ہدف کو اپنی بساط سے بڑا بلکہ بلند دیکھ کر حوصلہ ہار دیا جائے۔ مگر ٹھہریئے اول تو تن تنہا ہمارے لیے اس کوہِ گراں کو سر کرنے کی خواہش بھی ناممکنات میں شامل تھی مگر جب عالمی اردو ادب کے مدیر بھائی نند کشور وکرم نے ہماری ہمت بندھاتے ہوئے ساری زمہ داری اپنے سر اٹھالی تو نہ صرف ہمارا حوصلہ بڑھا بلکہ ہمارا سینہ بھی خوشی سے پھولنے لگا۔ فقط اس لیے کہ ہم علم وادب کی اتنی بڑی، اتنی بلند اور اتنی مہان شخصیت سے کسبِ فیض کر پائیں گے!

گلزار صاحب کا علم ایک بحرِ بیکراں ہے جس کا اندازہ اس امر سے لگا لیجیے کہ ایک مرتبہ آپ پاکستان تشریف لائے واہگہ بارڈر پر پاکستان کے دو نامور ادیب، شاعر، صحافی اور نقاد گلزار صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ جوں ہی گلزار صاحب گاڑی میں بیٹھ کر پاکستان کے دل لاہور کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو ہر دو پاکستانی اہلِ قلم نے جیب سے کاغذ قلم نکال کر وقفے وقفے سے کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ ازراہِ تفنن گلزار صاحب نے اُن دوستوں سے کہا کہ ''بھئی آپ اہلِ قلم ہو یا سی آئی ڈی کرنے والے'' مذکورہ دونوں پاکستانی دوستوں نے بیک زبان کہا ''کہ حضرت ہم صد فیصد ادب کے طالبِ علم ہیں اور صحتِ الفاظ کی نسبت آپ کے طالبِ علم بھی۔ اسی نسبت ہم اور ہمارا قلم مسلسل حرکت میں ہیں۔''

سطور بالا میں ہم نے عرض کیا کہ گلزار صاحب کی شخصیت وفن کا احاطہ مشکل ہی نہیں بہت مشکل ہے مگر ہم نے کوشش کی ہے کہ اردو ادب کی نادار و نایاب فلم کا ایسا ٹریلر آپ کے روبرو پیش کریں جس سے گلزار صاحب کی شخصیت، فن، کارنامے نکھر سنور کر آپ کے سامنے آجائیں۔

گلزار جاوید

☆ اس امر سے آگاہی کے باوجود کہ آپ کے آباء اعلیٰ علمی مناسب کے باعث شاہجہانی عہد میں شہزادوں کے اتالیق مقرر ہو کر دہلی تشریف لائے۔ آپ ہمیں یہ بتلایئے کہ آپ کے بزرگوں کا عربی، فارسی اور دیگر اسلامی علوم سے ربط ضبط کب اور کس دَور میں شروع ہوا؟

☆☆ عربی فارسی اور دیگر اسلامی علوم سے ہمارا واسطہ مغل فرما روا شاہجہاں کے زمانے سے شروع ہوا۔ ہمارے بزرگوں کی علمیت وفضیلیت سے متاثر ہو کر شاہجہاں نے انہیں شہزادوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کشمیر سے دہلی آنے کی دعوت دی تھی اور انہیں اُن کا اتالیق مقرر کیا تھا نیز انہیں مقامی زبانوں سے فارسی اور فارسی سے مقامی زبانوں میں ترجمانی کرنے کے لئے اپنا مشیرِ تعلیم مقرر کیا تھا۔ یہی نہیں انہیں جاگیروں اور خطابات سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ میرے سات آٹھ بزرگوں کو ''رائے رایان'' کا خطاب عطا کیا گیا اور انہیں دہلی، پٹیالہ، لاہور اور میرٹھ میں جاگیریں عطا کی گئیں۔

☆ اکثر لوگ اپنے آبائی حسب ونسب پر فخر کیا کرتے ہیں مگر آپ کے ہاں کشمیر کے بجائے دلّی والا ہونے پر فخر کرتے ہوئے خود کو دلّی کا روڑا گردانا جاتا ہے؟

☆☆ ہمارا خاندان صدیوں سے دہلی میں سکونت پذیر ہے اور دہلی ہماری نس نس میں سمائی ہوئی ہے۔ دہلی کا بازار سیتا رام میرے سگھر دادا پنڈت سیتا رام زتشی کے نام سے موسوم ہے اور اس گلی میں جہاں میرے بزرگوں کی حویلیاں ہیں اُس گلی کو ''گلی کشمیریاں'' کہا جاتا ہے۔ دہلی سے اس رشتے کے باعث ہی میں اپنے آپ کو دہلی کا روڑا سمجھتا ہوں۔

☆ باقاعدہ شعر کہنے کی ابتدا کب اور کس تحریک پر ہوئی اور آغازِ سفر میں کس صنف کی جانب رجحان رہا؟

☆☆ مَیں نے ۳۴-۱۹۳۳ء میں باقاعدہ شاعری کی ابتدا کی۔ ۱۹۳۸ء سے علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی جانشین وداماد داغ دہلوی سے تلمذ اور فیضان واکتساب حاصل کیا۔ پنڈت امرناتھ ساحرؔ زائرِ غالب بانی بزمِ سخن دلی اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب ایسی ہستیوں سے فیض حاصل کیا اور ان کے ہی دولت کدے میں صحبت وتربیت میں اسلاف کی قدروں کو اپنایا۔ اور شعروسخن کی ان عظیم شخصیات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا تھا۔

مَیں نے بچپن ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنا کلام اپنے والد ماجد حضرت زارؔ دہلوی کو دکھاتا رہا اور لڑکپن میں ہی مشاعرے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ کل انجمن ترقی اُردو (ہند) کی کانفرنس ۲۸، ۲۹، ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو ٹاؤن ہال دہلی میں منعقد ہوئی تھی تو اُس کا افتتاح میری نظم سے ہی ہوا تھا۔ اس کانفرنس کی شائع روداد میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا تھا کہ اس

مشاعرہ کا افتتاح جناب تربھون ناتھ زارؔ دہلوی کے خوردسال صاحبزادے پنڈت آنند موہن زتشی دہلوی کی نظم سے ہوا۔اس ہونہار کی عمر دس گیارہ سال کے قریب ہے مگر اپنے بزرگوں کی طرح فصیح اردو لکھتا اور بولتا ہے۔اس نے نہایت تیز اور تخلیقی طبیعت پائی ہے اور گلزارؔ تخلص کرتا ہے۔اُن دنوں چونکہ شاعروں کا رجحان زیادہ تر غزل کی جانب تھا لہذا مَیں نے بھی ابتداء میں زیادہ تر غزلیں ہی کہیں۔

☆ ۱۹۳۶ء میں آپ کی عمر صرف دس گیارہ برس بنتی ہے۔اتنی کم سنی میں آپ کی شخصیت اور شاعری کا چرچا کچھ لوگوں کے ہاضمے پر گراں نہیں گزرا؟

☆☆نہیں لوگ اس کم سنی میں میری شاعری سُن کر مجھے شاباشی دیتے تھے۔اور اُس دور کے اساتذہ کی موجودگی میں جب مَیں کلام پڑھتا تھا تو سبھی اُس کی تعریف کرتے تھے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی ایسی ادبی شخصیات شامل ہیں۔مولوی عبدالحق صاحب نے تو میری شاعری کے بارے میں یہاں تک کہا تھا کہ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات''۔ہمیں یقین ہے کہ جلد ہی یہ نوجوان مطلع ادب پر درخشاں ستارہ بن کر چمکے گا۔اسی طرح حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے مجھے ''چکبستؔ ثانی'' کا خطاب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''مَیں انہیں ۱۹۳۸۔۴۰ء سے جانتا ہوں اور اُن کی خداداد صلاحیتوں سے واقف ہوں۔وہ یقیناً داغؔ اور چکبستؔ دونوں کے رنگ کے عظیم شاعر مانے جائیں گے۔وہ یقیناً آزادیِ وطن کے بعد نئے دور میں اُردو کے نقیب اور بلبلِ اُردو تسلیم کئے جائیں گے۔اور جگرؔ صاحب بھی میری شاعری کو خراجِ تحسین دے چکے ہیں۔

☆ آپ نے جن اساتذہ، ادبا، شعرا، حکما اور دانشوران سے کسب فیض کیا اُن کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس مختصر گفتگو میں تمام کا ذکر ممکن نہ ہے۔آپ ہمیں اُن اصحاب کے اسمائے گرامی بتلایئے جن کا آپ کی شخصیت وفن کی تعمیر میں نمایاں کردار رہا؟

☆☆ میری شخصیت وفن کی تعمیر میں میرے والد علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ زتشی زارؔ یادگارِ داغؔ، بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی یادگار حالی اور ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، حضرت بیخود دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، مولانا احمد سعید خواجہ محمد شفیع، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا آزاد، ایسی بزرگ اور نامور ہستیوں کی صحبت و قربت کا اثر ہے جن کے فیض وصحبت واصلاح وتربیت سے مَیں نے استفادہ کیا اور جن کی بدولت میں اُردو دنیا میں شہرت وعزت اور انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔

☆ آپ کے والد محترم کی علمی، ادبی اور شعری خدمات آپ کے لیے فخر کا باعث ہونا چاہیے مگر آپ کی والدہ ماجدہ کا اُردو زبان وادب اور شاعری کا شغف بھی لائق احترام ہے۔آپ ہمیں والدہ محترمہ کی اُردو سے رغبت اور والدین کے آپ کی شخصیت پر اثرات سے آگاہی دیجیے؟

☆☆ میرے والد علامہ تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی تو معروف شاعر تھے ہی۔ان کے علاوہ اُن کی اہلیہ یعنی میری والدہ ماجدہ محترمہ برج رانی بھی شاعری کرتی تھیں اور اُن کا تخلص بیزارؔ تھا اور وہ اُس دَور کے مشہور اُستاد شاعر حضرت نواب سائلؔ دہلوی کی شاگردہ تھیں۔ان کا کلام اور تذکرہ آگرہ سے مغیث الدین فریدی صاحب نے تذکرہ شاعرات میں شائع کیا ہے۔یہی نہیں میرے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی اُردو شعروادب سے وابستہ ہیں۔میرے ماموں پنڈت گردھاری موہن کول عاشقؔ بھی صاحب دیوان شاعر تھے نیز میرے بڑے بھائی پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خارؔ دہلوی کا شمار معروف شعراء میں ہوتا ہے، اور اُن کے شعری مجموعے ''خلش'' اور ''خارزارؔ'' شائع ہوکر دادِ تحسین پا چکے ہیں۔اسی طرح میرے بڑے بھائی پنڈت دینا ناتھ زتشی ریڈیو، ٹی وی اور سنیما کی معروف ہستی تھے جنہوں نے متعدد اُردو ڈراموں کے علاوہ فلم ''گرم ہوا'' میں بھی اپنی اداکاری کی دھاک جمادی تھی۔

☆ آپ کے والدِ محترم نے کم گوئی کے استفسار پر کنور مہندر سنگھ بیدی کو یہ جواب کیوں دیا ''بولنے کا فریضہ میں اور میرے کُل خاندان نے اپنے چھوٹے فرزندِ جگر بند گلزار دہلوی کے حوالے کیا ہوا ہے؟''

☆☆ میرے والد ماجد اور میرے سبھی بھائی کم گو تھے وہ لوگ بڑی مختصر بات کرتے تھے اور مَیں بولنے میں بڑا تیز طرار تھا اور مسلسل گھنٹوں بولتا تھا اور آج بھی بولتا ہوں لہذا میرے والد نے کنور صاحب کے سوال کے جواب میں ایسا فرمایا ہوگا۔

☆ لالہ سرشنکر لال کے تعلیمی مشیر بننے میں آپ کی کس قابلیت کا دخل تھا اور آپ نے اس حیثیت میں کس طرح مفید خدمات انجام دیں؟

☆☆ سرشنکر لال بہت قابل اور جہاندیدہ شخصیت تھے۔انہوں نے میری علمیت اور شاعری کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے اپنا مشیر مقرر کیا اور وہ مشاعروں کے انعقاد کے بارے میں مجھ سے صلاح ومشورہ کرتے تھے اور ان مشاعروں کی کامیابی میں میرا بھی ہاتھ تھا۔

☆ مولانا ابوالکلام آزاد سے آپ کا تعارف کب اور کس وسیلہ سے ہوا اور مولانا نے آپ کی کونسی خوبی سے متاثر ہوکر ''کونسل آف سائنٹیفک انڈسٹریل ریسرچ سنٹر'' کا ڈائریکٹر مقرر کیا اور آپ نے اس اہم ادارے کے پلیٹ فارم سے کیا مفید خدمات انجام دیں؟

☆☆ مولانا آزاد سے میرا رابطہ بہت پرانا ہے اور اُن سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔۱۹۳۷ء میں آصف علی صاحب نے مجھے اپنے گھر پر مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے ملوایا تھا۔جواہر لال مجھے پہلے سے جانتے تھے۔اس موقع پر انہوں نے میری شاعری کی تعریف کی اور اس کے بعد مَیں مولانا آزاد کے کافی نزدیک آگیا لہذا جب ۱۹۵۸ء میں اُن کی سرپرستی میں کل ہند اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تو مَیں نے اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مولانا نے ہی مجھے مذکورہ کانفرنس کا سیکرٹری بنایا تھا۔پھر اُن ہی کی ایما پر ۱۹۵۳ء میں نے آئی ایس آر ا

جوائن کیا۔

☆ اسی ادارے کے تحت آپ نے رسالہ ''سائنس کی دنیا'' بھی جاری کیا۔ ''سائنس کی دنیا'' کا دورانیہ اور خدمات پر روشنی ڈالیے؟

☆☆ جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں مَیں نے ۱۹۵۳ء میں مولانا آزاد کی ایما پر آئی ایس آر جوائن کیا اور ۱۹۷۳ء میں سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی ایما پر اُردو مشاورتی بورڈ برائے سائنس کا معتمد اور مدیر مقرر کیا گیا۔ بحیثیت ایڈیٹر سائنس کی دنیا کے میری اتنی شہرت ہوئی کہ لوگ مجھے سائنسی شاعر کہنے لگے۔ اس رسالے کے۔ توسط سے مَیں نے اُردو والوں کو سائنس ایسے مضمون سے متعارف کرایا جس سے وہ اس مضمون میں بھی دلچسپی لینے لگے۔

☆ کچھ روداد ''انجمنِ تعمیرِ اُردو'' کی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایئے؟

☆☆ تقسیم کے بعد دہلی کی یہ واحد علمی، ادبی اور تہذیبی تنظیم تھی جس نے اُردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انجمنِ تعمیرِ اُردو کی ہفتہ وار نشستوں میں شریک ہونے والے اپنی نئی تخلیقات پیش کرتے تھے جن پر بحث ہوتی تھی۔ شاعری، افسانہ اور مضامین اور مقالات، سب پر اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ انجمن نے سینکڑوں قلمکاروں کی تربیت کی ہے۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائی میں ہند و پاک کی کوئی ایسی بڑی شخصیت نہیں جس نے انجمن تعمیرِ اُردو کی نشستوں میں شرکت نہ کی ہو۔

☆ آپ کو سائنسی شاعر کہنے والے یہ دعویٰ کس بنیاد پر کرتے ہیں؟

☆☆ مَیں جس وقت ادارۂ سائنس کی دنیا سے وابستہ ہوا، اُس وقت تک سائنس پر لکھنے والے نہیں تھے۔ مَیں نے خود بھی نثر و نظم میں سائنسی موضوعات پر لکھا اور دوسرے ادباء و شعراء کو اس طرف راغب کیا۔ اس حوالے سے بھی لوگ سائنسی صحافی اور شاعر کہنے لگے۔

☆ اور جو لوگ ''مجاہدِ آزادی'' کا خطاب دیتے ہیں وہ آپ کی خدمات کا ذکر کیوں نہیں کرتے کہ آپ نے کب، کہاں اور کس میدان میں جنگ آزادی میں حصہ لیا؟

☆☆ مَیں بچپن سے لے کر آج تک کانگریس، تحریک آزادی اور نہرو پریوار خصوصاً جواہر لال نہرو، اندرا جی اور راجیو گاندھی سے وابستہ رہا ہوں۔ اسی لئے مجھے مجاہدِ آزادی کے خطاب سے نوازا گیا۔

☆ ہماری اطلاع کے مطابق آپ اُردو زبان کے پہلے ادیب ہیں جنہیں یو۔این۔او۔ نے اردو میں خطاب کا شرف بخشا۔ اگر موقع اور مناسبت سے آگاہ فرمائیں تو عنایت ہوگی؟

☆☆ ۲۰۰۰ء میں اقوامِ متحدہ نے ۳۶ ممالک کے شعراء کی کانفرنس کا امریکہ میں انعقاد کیا تھا جس میں مَیں نے ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے علاوہ اس کانفرنس کی صدارت بھی کی تھی۔ مَیں پہلا اُردو شاعر تھا جس نے اس موقع پر اُردو میں تقریر کی اور تمغۂ اعزاز حاصل کیا۔ یہی نہیں مجھے ۱۹۵۱ء میں جرمنی کے شہر برلن میں منعقد تیسرے عالمی میلہ برائے نوجوانانِ عالم میں بھی مدعو کیا گیا تھا جس میں مجھے ''امن عالم'' موضوع پر ادبی مقابلہ جیتنے پر ''یوتھ لاریٹ'' کا اعزاز اور تین ہزار جرمن مارکس بطور انعام ملے تھے۔

☆ آپ جیسا قادر الکلام، بلند خیال اور بلند اخلاص شاعر ہندوستان بھر میں ڈھونڈے نہ ملے گا اس کے باوجود آپ کے کلام کی طباعت میں تاخیر باعث تعجب ہے؟

☆☆ ہے تو حیرانی کی بات لیکن اس میں میری سستی اور بے توجہی بھی ایک وجہ ہے۔ حالانکہ کئی احباب و رفقاء بھی اس طرف توجہ دلاتے رہے۔ اور انہوں نے میرے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ میرا شعری مجموعہ بھی مَیں نے نہیں میرے عزیز دوست اور مخلص محمد عتیق صدیقی مدیر روزنامہ الیوم کو میرا کلام شائع کرنے کی دھن تھی اور ان کی کاوشوں سے ہی میرا پہلا مجموعہ ''گلزارِ ادب'' آج سے ۱۷ سال پہلے ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا ورنہ شاید وہ شائع نہ ہو پاتا۔ پھر ۲۰۱۰ء میں میرا کلیات بعنوان ''کلیاتِ گلزار دہلوی'' منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ سفرنامہ ''لنکن کے دیس میں'' وغیرہ بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ موتی لال نہرو منظوم کتابچہ بھی میری کاوش ہے۔

☆ آزاد ہندوستان میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کی ترقی کے لیے جس قدر سرگرم آپ رہے ہیں وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے مگر تاریخ کے اس روشن باب کا محفوظ نہ ہونا بھی اپنی جگہ بڑا المیہ ہے؟

☆☆ ایسی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں اردو کے حوالے سے مجھے بہت عزت دی گئی ہے اتنی کہ جس کا میں مستحق بھی نہیں تھا۔ اب یہ جو آپ کی جستجو ہے یہ بھی میرے لیے باعث اعزاز ہے جس کے لیے میں آپ کا شکریہ اس لیے ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ کے توسط سے پاکستان کے نوجوان قلم کاروں سے میرا تعارف ہوگا بلکہ پاکستان ہی کیا ہندوستان میں بھی نئی نسل کے قلم کار آپ کی کاوش سے فیضیاب ہوں گے اور یہی میرا انعام ہے اور یہی ایوارڈ ہے۔

☆ آزادی کے بعد اردو دشمن ذہنیت سے محاذ آرائی کا سبب کیا تھا نیز کیا آزادی سے قبل اس طرح کے لوگ مصروفِ کار نہ تھے؟

☆☆ اُردو دشمن عناصر آزادی سے پیشتر بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ مگر آزادی کے بعد ماحول بالکل بدل گیا۔ اور ہندی کے قومی زبان بننے کے ساتھ ہی ملک میں بہت سے عناصر اُردو کے خلاف ہو گئے۔

☆ آپ نے ہندوستان میں وسیع المشربی اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جس قدر خدمات سرانجام دیں اُسی قدر آپ دونوں پڑوسی ممالک کے تعلقات پر توجہ دیتے تو حالات مختلف نہ ہوتے؟

☆☆ مَیں نے بحیثیت ایک خادم اور اپنی بساط بھر برِ صغیر کی قدیم گنگا جمنی تہذیب، امن و اتحاد اور انسانی قدروں کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی ہے۔ رہا دونوں پڑوسی ملکوں کے تعلقات کا سوال تو اس کا جواب اربابِ سیاست ہی دے

سکتے ہیں۔

☆ آپ کی شہرت، ناموری اور بلند اقبالی میں اقتدار کی قربت یعنی پنڈت جواہر لعل نہرو سے ذاتی تعلق بھی اہمیت کا حامل گردانا جاتا ہے۔

☆☆ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ نہرو خاندان سے میرا قریبی تعلق ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو اور میری نانی کے رئیل کزن تھے۔ نہرو خاندان تحریک آزادی میں پیش پیش تھا۔ مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا۔ ۱۹۳۷ء میں جواہر لال کو چہ چیلان میں واقع بیرسٹر آصف علی کے گھر ٹھہرے تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں دیکھ کر آصف علی صاحب سے کہا تھا۔ ''اِس لڑکے کو دیکھو۔ یہ انقلابی نظمیں لکھتا ہے۔'' پھر مَیں نے ان حضرات کے سامنے اپنی نظم سنائی۔

☆ پنڈت جواہر لعل نہرو اور کانگریس سے آپ کا عشق آخری حدوں کو چھوتا رہا ہے اس کے باوجود بابری مسجد کے انہدام پر آپ دونوں سے لاتعلق ہو جاتے ہیں؟

☆☆ مَیں کبھی اس افسوسناک سانحے سے لاتعلق نہیں رہا۔ میرا آج بھی کہنا ہے کہ اس کے سب سے بڑے ذمہ دار اُس وقت کے کانگریسی حکومت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ تھے، جن کی تنگ نظری اور سیاسی نااہلی نے دوسری طاقتوں کو اُبھرنے کا موقع دیا۔ مَیں نے ملک میں سیاسی اختلافات کے زوال کو دیکھتے ہوئے ہی قومی سیاست، بالخصوص کانگریس پارٹی سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا۔

☆ کچھ لوگ آپ کے مزاج کو جلالی گردانتے ہوئے اسے اقتدار کے ایوانوں کی قربت کا کرشمہ گردانتے ہیں اور کچھ اسے مثبت انداز میں محسوس کرتے ہوئے آنجہانی راجیو گاندھی کے دور میں وزیراعظم ہاؤس کے مشاعرے کی مثال بھی دیا کرتے ہیں جس میں آپ نے شاعروں کے سیکیورٹی چیک پر سخت احتجاج کرتے ہوئے مشاعرہ ملتوی کرنے کی دھمکی دے ڈالی تھی؟

☆☆ یہ سچ ہے۔ میرے مزاج میں اقتدار کے ایوانوں کی قربت کا کوئی اثر نہیں۔ ایک کھرے دِلی والے کی طرح غلط بات برداشت نہیں کرتا اور برملا اس کا اظہار کرتا ہوں۔

☆ بہت سے ناآشنا لوگ آپ کو اردو کے عشق میں غلطاں و پیچاں دیکھ کر اپنی مذہبی تعلیمات سے بیگانہ بھی گردانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر آپ آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی آخری رسومات کی تفصیل بیان فرمائیں تو معاملے کی وضاحت بھی ہو جائے گی اور ہمارے سوال کا جواب بھی مل جائے گا؟

☆☆ مَیں ایک سچا ہندوستانی ہوں۔ جس طرح اپنی تعلیم و تربیت اور زبان کے واسطے سے اسلامی علوم سے واقف ہوں۔ اسی طرح اپنے ہندو مذہب کے امور، رسوم اور رویات سے بھی کماحقہ آگاہ ہوں۔ مرحوم جگن ناتھ آزاد کی آخری رسومات کے تعلق سے واقعہ یہ ہے کہ نذرِ آتش کرتے وقت جو منتر وغیرہ پڑھے جاتے ہیں، شمشان کا پنڈت غلط پڑھ رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی جگہ لے لی اور صحیح طریقے سے یہ رسم انجام دی۔

☆ آپ سچے ہندو برہمن ہونے کے باوصف اسلامی تعلیمات، قرآنی آیات، احادیث اور بزرگانِ دین سے دلی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی کشادہ قلبی کا منبع کیا ہے نیز دیگر مذاہب کے اکابرین آپ کے اس عمل کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ مَیں ایک سچا ہندو ہوں مگر مَیں دیگر مذاہب کا بھی دل و جان سے احترام کرتا ہوں اور ہندوؤں کے ساتھ میرے بہت سے مسلمان دوست بھی ہیں۔ اور شاید ہندوؤں سے بھی زیادہ۔

☆ ماہِ صیام میں ایک روزہ رکھنا اور بڑے پیمانے پر روزہ کشائی کا اہتمام کے مقاصد کیا ہیں۔ آج کل یہ سلسلہ کس مرحلے میں ہے۔ کچھ لوگ آپ کے اس عمل کو اکبر کے دینِ الٰہی سے مشابہ کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ مَیں شروع سے ہی مسلم علماء اور صوفیا سے بہت قریب رہا ہوں۔ میرے والد اور حضرت امرناتھ مدن ساحر دہلوی سے حضرت خواجہ حسن نظامی ثانی کی بہت قربت تھی۔ خواجہ صاحب ویدانت سے بہت متاثر تھے، مجھے ان احباب کی گفتگو سننے کا موقع ملا ہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک مَیں خواجہ حسن نظامی صاحب کی محافل تصوف و روحانیت میں مسلسل شریک ہوتا رہا۔ آج بھی آستانہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء سے میرا قلبی تعلق برقرار ہے۔

☆ گزشتہ سات دہائیوں سے آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے مزارات کے انتظامیہ ٹرسٹ کے ممبر چلے آتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی آپ کی خدمات اور روحانی کیفیات کا جاننا ہمارے لیے باعث اشتیاق ہے؟

☆☆ مَیں ۱۹۴۵ء سے ادارہ نظامیہ ٹرسٹ کا رُکن رہا ہوں۔ اور مَیں درگاہ محبوب الٰہی نظام الدین اور حضرت امیر خسرو سے عملی اور روحانی طور پر منسلک رہا ہوں اور لگ بھگ سات دہوں سے طریقت و تصوف اور دیگر متبرک اجتماعات میں سجادگان، صاحبزادگان اور پیرزادگان کے ساتھ سرگرم عمل رہا ہوں۔

☆ آخری تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر کے ہاتھوں دہلی کی تاریخی ''رام لیلا'' کا آغاز ہوا تھا۔ قریب نصف صدی سے آپ اُس کے حفاظتی دستے کے سالار کی ذمہ داری بھی نباہ رہے ہیں۔ آج کل ''رام لیلا'' کا یہ جشن کس پیمانے پر منایا جاتا ہے اور اس سے کس طرح کے نتائج حاصل ہو رہے ہیں؟

☆☆ آج کل دہلی میں رام لیلا پہلے سے بھی بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی ہے اور اب ایک نہیں اس وسیع و عریض دہلی کے متعدد علاقوں میں رام لیلا منعقد کی جاتی ہے جن میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔

☆ وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اردو غزل کے ناقدین کی تعداد میں بھی اُسی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ کے خیال میں اردو غزل کا سفر ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اردو غزل میں بڑی بات یا بڑا پیغام سمانے

کے امکانات سرے سے موجود ہی نہیں اور کچھ تو اردو غزل کو وحشی اور نیم وحشی صنف تک گردانے لگے ہیں؟

☆☆ غزل انسان کے داخلی رخارجی، ہر جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔غزل کی حیثیت تمام اصنافِ سخن میں راجہ رانی جیسی ہے۔یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔میرا ماننا ہے کہ غزل ہر جذبے اور فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔نظم کے تیس پینتیس شعروں میں وہ بات نہیں آتی جو غزل کے ایک دو اشعار میں بیان کی جاسکتی ہے۔

☆ اردو شاعری میں نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔آپ ہمیں آزاد غزل یا آزاد نظم کے بارے میں اپنی رائے بتلایئے اور اس عمل کے اردو شاعری پر پڑنے والے اثرات سے بھی آگاہ کیجیے؟

☆☆ مَیں نے اس سوال کا جواب آپ کے استفسار پر پہلے ہی دے دیا ہے

☆ انڈو پاک کے بہت سے جذباتی یا عاقبت نااندیش اپنی، اپنی طرف کے ادب اور ادیب کی بابت مغالطوں پر مبنی دعویٰ کیا کرتے ہیں۔آپ ہمیں تقسیم ہند سے قبل اور بعد کی صورت حال کے ساتھ سمندر پار تخلیق ہونے والے ادب اور ادیب کی بابت صحیح راہ دکھلایئے؟

☆☆ عزیزِ محترم آپ نے اس سوال کا جواب عاقبت نااندیش کہہ کر خود ہی دے ڈالا ہے۔میرے خیال میں مزید حاشیہ آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں۔

☆ گزشتہ دنوں ہندوستان کے ایک بڑے شاعر سے بات ہوئی تو انہوں نے بتلایا کہ ہندوستان میں روزانہ درجن بھر آل انڈیا مشاعرے ہوتے ہیں اور ہر مشاعرے کے لیے کم وبیش تین سے چار درجن شعرا درکار ہوتے ہیں۔نتیجتاً یہ شعبہ ایک طرح سے شوبز کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کے باعث بے شمار متاشاعر یا گویّے دوسروں سے لکھا کر کلام گا یا پڑھ رہے ہیں۔اگر آپ اس تجزیے کو درست گردانتے ہیں تو اردو شاعری کی اس تباہی کے حوالے سے آواز بلند کیوں نہیں کرتے؟

☆☆ آپ کے سوال کے دو پہلو ہیں ایک طرف آپ درجن بھر مشاعروں کی نوید سنا رہے ہیں جس میں ہزار ہا لوگ بطور سامعین شامل ہو کر مستفید ہوتے ہیں دوسری طرف آپ چند ایسے لوگوں کی نشاندہی کر رہے ہیں جو شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی شاعر کا روپ بھر کر مشاعروں میں نمودار ہوتے ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اتنے ڈھیر سارے شعراء اور سامعین کے مقابلے ان چند لوگوں کو اہمیت دینا چاہیے۔آج نہیں تو کل اگر ان لوگوں میں تخلیقی جوہر ہوا تو راہ راست پر آجائیں گے اور جن میں اس طرح کی خوبی سرے سے ناپید ہے وہ خود ہی بددل ہو کر اپنی راہ لیں گے۔دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کالی بھیڑیں کس شعبے میں نہیں ہوتیں۔

☆ ایک بحث آج کل اردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے ہر محفل کا موضوعِ خاص ہوا کرتی ہے۔آپ جیسے محبِ ونگہبانِ اردو کا اس حوالے سے نکتہ نظر کیا ہے؟

☆☆ میرا اُردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں نظریہ ہے کہ اسے فارسی رسم الخط میں ہی لکھا جانا چاہیے اگر اسے دیوناگری میں لکھا جائے گا تو اُردو ختم ہو جائے گی۔اسے فارسی رسم الخط میں ہی لکھا جانا چاہیے۔اُردو زبان کی زندگی اور روح فارسی نستعلیق رسم الخط میں متحرک ہے۔رسم الخط کی تبدیلی کا مطلب ہے اُردو کا قتل، آج اُردو دنیا ۳۵ سے زیادہ ملکوں میں پڑھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔رسم الخط اس میں بنیادی کردار ہے۔

☆ آپ کے خیال میں اردو زبان مستقبل میں کیا رُخ اختیار کرے گی مثلاً ہندوستان میں کیا رنگ وروپ ہوگا۔پاکستان میں کس طرح کی شکل وصورت ہوگی اور سمندر پار اس کا لب ولہجہ کیا ہوگا؟

☆☆ اُردو ایک زندہ اور بین اقوامی زبان ہے اور اس کے مستقبل کے روشن ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں۔ہندوستان میں آزادی کے بعد اس کی تعلیم میں کمی واقع ہوئی ہے۔مگر امید کرنی چاہیے کہ اس کا مستقبل بتدریج بہتر ہوتا جائے گا۔لیکن اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سہ لسانی فارمولہ کو سختی سے لاگو کرنا پڑے گا کیونکہ اس وقت اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جا رہی۔جہاں تک پاکستان کا سوال ہے وہاں اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور جو زبان روزگار سے جڑی ہوتی ہے اسے بلاشبہ فروغ حاصل ہوتا ہے۔

☆ مغلوں کے زمانے کی تعمیرات ابھی تک جوں کی توُں اپنی جگہ قائم ہیں مگر آپ کے آباء کی بازار سیتا رام میں تعمیر کردہ حویلیاں اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں اور آپ دلّی چھوڑ کر نوئیڈا میں آبسے؟

☆☆ آزادی کے بعد حالات بالکل بدل گئے۔آبادی کے غیر معمولی بدلنے سے نئی کالونی اور بستیاں بھی منظر عام پر آئیں اور پھر نئے سائنسی دور میں نئی نسل نے پرانی تنگ وتاریک گلیوں میں آباد حویلیوں کے بجائے نئے کشادہ، ہوادار اور صاف ستھرے ماحول میں رہنے کو ترجیح دی۔اس لئے زیادہ تر لوگ خصوصاً نئی نسل نے پرانے علاقوں پر نئی کالونیوں اور بستیوں میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دی۔لہٰذا مَیں بھی بازار سیتا رام سے نوئیڈا منتقل ہو گیا۔

☆ دارالعلوم دیوبند سے آپ کا تعلقِ خاص رہا ہے۔آج کل یہ عظیم دینی درسگاہ طرح طرح کے الزامات کے باعث ایک طرح سے محاصرہ کی کیفیت میں ہے۔کبھی آپ نے اِن حالات اور مضمرات کی بابت غور فرمایا ہے؟

☆☆ برِصغیر کی تحریکِ آزادی میں دارالعلوم دیوبند کا جو اہم کردار ہے، وہ تاریخی حیثیت کا ہے۔مجھے خوشی ہے کہ میرا تعلق اکابرینِ جمعیت العلماء اور دارالعلوم سے بہت قریبی رہا ہے۔۱۹۴۵ء میں جب جنگِ آزادی شباب پر تھی تو شیخ الاسلام مولانا محمود مدنی صاحب نے مجھے اپنا ایسوسی ایٹ اور معاون بنایا۔اُس دَور میں جمعیتہ کا کوئی خاص اجلاس یا میٹنگ میرے بغیر نہیں ہوتی تھی۔جب صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد دارالعلوم دیوبند آئے تھے تو استقبالیہ مَیں نے ہی پیش کیا تھا۔

☆ اس خیال کی بابت آپ کیا فرمانا پسند کریں گے کہ مسلمان قوم کا

عالمی سطح پر منظم طریقے سے گھیراؤ کیا جارہا ہے اور ہندوستان بھی اس عمل میں برابر کا شریک ہے؟

☆☆ برادرم میں تو علم وادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ یہ سوال تو کسی دانشور، مفکر اور سیاست دان سے کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

☆ حکومتِ پاکستان کی جانب سے ''نشانِ پاکستان'' جرمن حکومت کی طرف سے امنِ عالم کا ''یوتھ لاریٹ'' حاصل کرنے والے کو حکومت ہند نے کن اعزازات وانعامات کا حقدار گردانا؟

☆☆ مجھے ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ مجھے نواب چھتاری، نواب رامپور نے سونے کے تمغے سے نوازا۔ حکومت ہند نے مجھے پدم شری،، پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۱ء میں مجھے برلن (جرمنی) میں منعقد تیسرے عالمی میلہ برائے نوجوانانِ عالم میں ادبی مقابلہ بہ موضوع ''امن عالم'' میں ادبی مقابلے بہ موضوع ''امن عالم'' میں یوتھ لاریٹ کا اعزاز اور تین ہزار جرمن مارکس کا انعام ملا تھا اور کئی اداروں نے بھی مجھے انعامات واعزازات عطا کئے ہیں۔

☆ احباب کے بقول اب تک آپ کو جس قدر اعزازات، انعامات اور خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے اردو کے کسی صاحبِ قلم کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوسکا ہے۔ شُنید یہ ہے کہ آپ کے دولت کدے پر ان تمام اعزازات، انعامات اور خلعت کو رکھنے کی جگہ دستیاب نہیں ہے تو پھر یہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟

☆☆ یہ صحیح نہیں ہے کہ میرے گھر میں اعزازات اور خلعتوں کو رکھنے کے لئے جگہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں انہیں رکھنے کے لئے مناسب جگہ نہیں لہذا انہیں ایک محفوظ کمرے میں رکھا گیا ہے جہاں میری کتابیں، دستاویزات وغیرہ رکھی ہوئی ہیں۔

☆ آپ کے خاندان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کا مقابلہ بڑے بڑے ادارے بھی نہیں کرسکتے۔ اگلی پیڑھی میں اردو زبان و ادب اور انسانی خدمات کا رجحان کس حد تک اطمینان بخش ہے؟

☆☆ ہمارے خاندان مین کئی پشتوں سے اُردو فارسی جاری رہی ہے۔ لیکن آزادی کے بوجوہ اُردو کی تعلیم کی جانب ہندو تو ہندو مسلمان بھی کم دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور لوگ انگریزی پڑھنے میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجون نسل میں انگریزی پڑھنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور اُردو زبان وادب کی جانب توجہ کم ہوتی جارہی ہے۔ جہاں تک انسانی خدمات کا رجحان ہے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

☆ آپ کے بڑے بھائی کے پوتے کی شادی معروف فلمی اداکار عامر خان کی بہن سے ہوئی ہے۔ آپ بین المذاہب شادیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور ہندوستان میں اس بڑھتے ہوئے رجحان کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ آزادی کے بعد سیکولرازم اور گلوبلازیشن نے ہر ایک کو متاثر کیا ہے اور اب آہستہ آہستہ بین المذہبی شادیوں کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔ اور اس رجحان کو آپ چاہ کر بھی نہیں روک سکتے۔ زمانہ بہت آگے کی جانب بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ اس میں گھر کے افراد خوشی سے شامل ہوئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی۔

☆ ۹۱ سال میں ستاسی سال اردو کی خدمت کے بعد آپ کے محسوسات کیا ہیں، مزید کیا کچھ کرنے کے ارادے ہیں اور کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ مَیں نے اپنی زندگی اُردو زبان وادب کے لئے وقف کررکھی ہے اور مَیں اردو کے حقوق کے لئے آخر دم تک نبرد آزما رہوں گا۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ اُردو کے ساتھ انصاف نہیں ہورہا ہے اور اسے اس کے حقوق سے محروم رکھا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور میرا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اس زبان کو تقسیم سے پہلے والے عروج تک پہنچایا جائے۔ اور ایسے حالات نہ پیدا کئے جائیں کہ یہ گنگا جمنی زبان ہندوستان میں صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے۔

''اردو میں سائنس کی دنیا''

یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ علماء واسلافِ اسلام سے قربت اور اردو شعر وسخن وعلم وفن کی خدمت اور جہادِ اردو میں سعی کرتے کرتے اب آپ نے اردو میں نئی دنیا بھی تلاش کرلی ہے۔ اور وہ اردو میں ''سائنس کی دنیا'' کا عام فہم مجلّہ قائم و جاری کرنے کی مفید ومثبت خدمت ''کاؤنسل آف سائنٹیفک ریسرچ'' نے آپ کو اس رسالے کا مدیر ومعتمد بنا کر صحیح انتخاب کیا ہے۔ آپ کا پہلا مجلّہ ''ڈاکٹر حسین ظہیر نمبر'' او دوسرے چند شماروں کے بعد اب آپ نے ''اوہام شکن نمبر'' نکالنے کا جو ارادہ کیا وہ صالح ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔

اسلام اور سائنس کا کبھی تضاد نہیں رہا۔ اسلام نے حقیقی اور مفید علم کی ہمت افزائی کی ہے۔ سائنس کے جدید انکشافات اسلامی حقائق کی تائید ہی کرتے جارہے ہیں۔ پیغمبروں کا کام ہی بھٹکے ہوئے عوام کو اوہام اور خرافات سے نکال کر حقیقت کی راہ پر لے آنا اور سچائی کا پیغام پہنچانا ہے۔

میں آپ کے ''اوہام شکن نمبر'' کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی بے پناہ صلاحیتوں، اعلیٰ شاعری اور زبان کی خدمت، تخلیق وتبلیغ ہر سطح پر جاری رکھیں گے اور ''سائنس کی دنیا'' مجلّہ آپ کی ادبی صلاحیتوں میں مزید اضافہ کرے گا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

''حسرتِ عمر''

(جناب گلزار دہلوی کے کلام سے کشید)

فاری شا (راولپنڈی)

☆

فلاحِ آدمیت میں صعوبت سہہ کے مر جانا
یہی ہے کام کر جانا یہی ہے نام کر جانا

جہاں انسانیت وحشت کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہو
جہاں تذلیل ہے جینا وہاں بہتر ہے مر جانا

یوں ہی دیر و حرم کی ٹھوکریں کھاتے پھرے برسوں
تری ٹھوکر سے لکھا تھا مقدر کا سنور جانا

سکون روح ملتا ہے زمانہ کو ترے در سے
بہشت و خلد کے مانند ہم نے تیرا در جانا

ہماری سادہ لوحی تھی خدا بخشے کہ خوش فہمی
کہ ہر انسان کی صورت کو مافوق البشر جانا

یہ ہے رندوں پہ رحمت روزِ محشر خود مشیت نے
لکھا ہے آبِ کوثر سے نکھر جانا سنور جانا

چمن میں اس قدر سہمے ہوئے ہیں آشیاں والے
کہ جگنو کی چمک کو سازشِ برق و شرر جانا

ہمیں خارِ وطن گلزار پیارے ہیں گل تر سے
کہ ہر ذرے کو خاکِ ہند کے شمس و قمر جانا

○

☆

اس ستم گر کی مہربانی سے
دل الجھتا ہے زندگانی سے

خاک سے کتنی صورتیں ابھریں
ڈھل گئے نقش کتنے پانی سے

ہم سے پوچھو تو ظلم بہتر ہے
ان حسینوں کی مہربانی سے

اور بھی کیا قیامت آئے گی
پوچھنا ہے تری جوانی سے

دل سلگتا ہے اشک بہتے ہیں
آگ بجھتی نہیں ہے پانی سے

حسرت عمر جاوداں لے کر
جا رہے ہیں سرائے فانی سے

ہائے کیا دور زندگی گزرا
واقعے ہو گئے کہانی سے

کتنی خوش فہمیوں کے بت توڑے
تو نے گل زار خوش بیانی سے

○

علم وفن و ادب کا جناں چھوڑ جاؤں گا
اردو کی خوشبوؤں کا جہاں چھوڑ جاؤں گا

صدیوں رکھے گی یاد جسے نسل بعدِ نسل
شعر وسخن کے ایسے نشاں چھوڑ جاؤں گا

جس سے ملے گا لہجۂ اسلاف کا پتہ
ایسی زبان ایسا بیاں چھوڑ جاؤں گا

جس پر یقیں کو ناز رہے گا تمام عمر
میں حرف حرف ایسا گماں چھوڑ جاؤں گا

ذہنوں پہ جس کی کاہکشاں منعکس رہے
لفظوں کے ایسے تیر وکماں چھوڑ جاؤں گا

چرچا رہے گا جس کا سدا لامکاں میں
آوازِ بازگشتِ مکاں چھوڑ جاؤں گا

سرسبز ایسا جس پہ ضعیفی نہ آ سکے
باغ زباں کا حسنِ جواں چھوڑ جاؤں گا

سطروں میں جس کے بحرِ معانی ہوں موجزن
کوزے میں فکر وفن وہ نہاں چھوڑ جاؤں گا

ہو مستقل بہارِ ادب جس میں خیمہ زن
باقی وہ مرغزارِ زباں چھوڑ جاؤں گا

ترسیں گے جس کے واسطے سب شیخ وبرہمن
ناقوس کی صدا میں اذاں چھوڑ جاؤں گا

جب بھی کروں گا گلشنِ دنیا سے میں سفر
سروِ فن و ادب کو رواں چھوڑ جاؤں گا

جس مرغزارِ شعر میں خوفِ خزاں نہ ہو
گلزارؔ اس آشیاں کے نشاں چھوڑ جاؤں گا

☆

خوب ہو یا خراب خراب پیتے ہیں
روز جامِ شراب پیتے ہیں

محتسب سے حساب کیا ہوگا
خیر سے بے حساب پیتے ہیں

ان کی آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
زندگی کی شراب پیتے ہیں

ہم پئیں تو گناہ کیا کہنا
شیخ صاحب ثواب پیتے ہیں

دستِ نازک میں آتشیں ساغر
آپ اپنا جواب پیتے ہیں

شیخ صاحب ہیں میرِ میخانہ
کیا خبر تھی جناب پیتے ہیں

آپ کا یہ کتاب سا چہرہ
اور اہلِ کتاب پیتے ہیں

حسنِ فانی ہے ریت کے دیوار
شیخ ہم آفتاب پیتے ہیں

صرفِ گلزارؔ پر نہیں موقوف
شیخ پیتے ہیں شاب پیتے ہیں

○

☆

رسم و رہ بڑھ کے چاہ تک پہنچے
چاہ ان کی نباہ تک پہنچے
میری فردِ عمل کو تاب کہاں
ان کی زلفِ سیاہ تک پہنچے
طُرّۂ امتیازِ شانِ حسن
کاش اس کج کلاہ تک پہنچے
عدل ان کا عدالتیں ان کی
مدعی کیا گواہ تک پہنچے
کتنے یوسف ہیں غرقِ آب ابھی
قافلہ کوئی چاہ تک پہنچے
نقدِ جاں بھی نثار کر دیں گر
رونقِ خانقاہ تک پہنچے
زہد بے راہِ عشق ناممکن
حسن کی بارگاہ تک پہنچے
جستجو میں تری ہم آوارہ
منزلِ مہر و ماہ تک پہنچے
کس کو ہے ذوقِ آبلہ پائی
کون الفت کی راہ تک پہنچے
اتنی توفیق آہ کو کب ہے
آپ کی بارگاہ تک پہنچے
سجدے کر کے ثواب کے قرنوں
یہ ملائک گناہ تک پہنچے
ہم سراپا گناہ پہلے دن
منصبِ عزو جاہ تک پہنچے
حالتِ زار بُلبُلِ گلزار
کاش گُل کی نگاہ تک پہنچے

○

☆

عمر جو بے خودی میں گزری ہے
بس وہی آ گہی میں گزری ہے

کوئی موج نسیم سے پوچھے
کیسی آوارگی میں گزری ہے

ان کی بھی رہ نہ سکی دار آئی
جن کی اسکندری میں گزری ہے

آسرا ان کی رہبری ٹھہری
جن کی خود رہزنی میں گزری ہے

آس کے جگنوؤ سدا کس کی
زندگی روشنی میں گزری ہے

ہم نشینی پہ فخر کر ناداں
صحبت آدمی میں گزری ہے

یوں تو شاعر بہت سے گزرے ہیں
اپنی بھی شاعری میں گزری ہے

میر کے بعد غالب و اقبال
اک صدا، اک صدی میں گزری ہے

○

☆

ایک کھٹکتے ہوئے سونار نے لوٹا ہوگا
عشق میں لذتِ آزار نے لوٹا گا

سرو قامت بتِ طرّار نے لوٹا ہوگا
چشم و رخسار و لبِ یار نے لوٹا ہوگا

جھپنی جھپنی تری مستانہ نگاہوں کی قسم
غصّہ آلود تیرے پیار نے لوٹا ہوگا

یا تو باتوں نے تیری مثلِ زبانِ سوسن
یا مجھے نرگسِ بیمار نے لوٹا ہوگا

تیری زلفوں نے کہیں مجھ کو بسانِ سنبل
تیرِ مژگاں کے کہیں وار نے لوٹا ہوگا

یاد نے تیری کبھی طفل تسلی دے کر
یا کبھی خواب میں دیدار نے لوٹا ہوگا

تیری الفت کی قسم تیری محبت کی قسم
کیا کسی کو تیرے انکار نے لوٹا ہوگا

ہم جفاؤں کے ستم کیش، رہے صید سدا
ہاں مزہ لطف کا اغیار نے لوٹا ہوگا

کیا ملاقات میں پائے گا کوئی لطف کبھی
جو مزہ ہجر میں گلزارؔ نے لوٹا ہوگا

○

☆

پاس رہتا ہے دور رہتا ہے
دل انہی کے حضور رہتا ہے

جل گیا گرچہ دل مگر اس میں
جلوۂ کوہِ طور رہتا ہے

تیری آنکھوں کی مئے فشانی سے
رات دن اک سرور رہتا ہے

عاشقی میں شعار لازم ہے
اس کا ہر دم شعور رہتا ہے

تیری آنکھوں کی روشنی کے سبب
میری آنکھوں میں نور رہتا ہے

مستی مئے سے تیری آنکھوں کی
دل بھی نشّے سے چور رہتا ہے

اتنا بے چین کس لیے ہر دم
اے دل ناصبور رہتا ہے

چشم مئے گوں سے میرے ساغر میں
کہکشاؤں کا نور رہتا ہے

یہ ہے گلزارؔ پہ کرم ان کا
رات دن اک سرور رہتا ہے

○

طرحی مشاعرہ ''یوم برق'' ۲۳۔مارچ ۱۹۵۸ء
(بہ رنگِ قدیم)

ظلمت کدہ کی اپنے بھی زینت ہے آپ سے
کوچہ بہ کوچہ اپنی بھی شہرت ہے آپ سے

کھلوایئے نہ منہ مرا بس رہنے دیجیے
میری خموشی، حسن عقیدت ہے آپ سے

کیا جانیے عدو پہ کرم کس لیے ہوا
ورنہ کسے امیدِ عنایت ہے آپ سے

کندن سا جسم، سرو سا قد، چشم نرگسی
کہتے جسے چمن ہیں عبارت ہے آپ سے

عشوہ، ادا و شوخی و انداز و ناز و سحر
جملہ فسون و غمزہ روایت ہے آپ سے

جی ہاں، وہ بات یہ ہے، نہیں کچھ نہیں، معاف
کیسے کہوں کہ مجھ کو محبت ہے آپ سے

حورِ ارم کی شیخ بہ ظاہر تسلیاں
دراصل خود فریب تجارت ہے آپ سے

میں جانتا ہوں آپ یقیناً برے نہیں
دشمن مری، عدو کی قرابت ہے آپ سے

منہ تک جو بات آ ہی گئی ہے خطا معاف
کہہ دوں کہ بے رخی کی شکایت ہے آپ سے

دنیا میں اور بھی ہیں حسیں، مہ جبیں مگر
ملتی کہاں کسی کی شباہت ہے آپ سے

اعدا، رقیب جتنے ہیں سب ہیں وفا شعار
لے دے کے ایک ہم کو عداوت ہے آپ سے

گلزار دہلوی کے تخیل کے شوخیاں
جیسے تصورات میں صحبت ہے آپ سے

○

(بمبئی، ۱۹۔نومبر ۱۹۹۹ء فی البدیہہ)

جب سے نہیں رندوں کو رہا فضلِ خدا یاد
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

دیتا ہے اذاں شیخ مرے شغل سے پہلے
آتا ہے یہ خوش بخت کو کس وقت خدا یاد!

دو روز جو ہنس کھیل کے گزرے ہیں ترے ساتھ
تا عمر رہے گی وہ تری مجھ کو وفا یاد

اقرار جو کچھ تو نے کیا اپنے خدا سے
شاید تجھے آ جائے کبھی ''قالو ابلا'' یاد

ہم کھاتے رہے ٹھوکریں کیوں دیر و حرم کی
تُو دل میں ہی موجود ہے یہ بھی نہ رہا یاد

ہر چہرے میں آتا ہے نظر آپ کا چہرہ
کچھ ہم کو نہیں جلوۂ واحد کے سوا یاد

ہو دیر، کے مئے خانہ، شبستاں کہ حرم ہو
ہر در کو ہے اب تک تیرے دامن کی ہوا یاد

ہر بار ہر اک در پہ تو مایوس نہ ہوتے
بہتر تھا ہم رکھتے حسینوں کی جفا یاد

ہر لغزشِ پا دیتی ہے گلزار سہارا
خود اپنے ہی دل کی اگر آ جائے صدا یاد!

○

☆

آدمی وقفِ ذات ہو جائے
تو سراپا صفات ہو جائے

اپنی زلفیں بکھیر کر دیکھو
ساری دنیا میں رات ہو جائے

لطف جب ہے کہ آج محفل میں
آنکھوں آنکھوں میں بات ہو جائے

آج اک جام ہی سے بسم اللہ
شیخ والا صفات ہو جائے

رخ بدل کر چلو جو کوئی چال
اک زمانے کو مات ہو جائے

ان کا دامن ہو اور مرے آنسو
زندگی میں نجات ہو جائے

اور کیا چاہیے غریبوں کو
آپ کا التفات ہو جائے

تم نوازو جسے اسے حاصل
دولتِ شش جہات ہو جائے

آپ کا غم جسے میسر ہو
اس کی دنیا میں بات ہو جائے

تم جو گھونگھٹ ہٹاؤ چہرے سے
منجلی کائنات ہو جائے

ان کی میٹھی نظر کے صدقہ میں
زہر آبِ حیات ہو جائے

صحنِ گلزار میں جو آنکلو
حسن کا سومنات ہو جائے

○

(راما گنڈم، جنوبی ہند، ریل کے سفر میں ۹۔جولائی ۱۹۶۹ء)

ع: دیکھئے سلسلۂ عشق کہاں تک پہنچے

جاں کو سودا ہے یہیں جانِ جہاں تک پہنچے
لامکانی کے تجسس میں مکاں تک پہنچے

لاکھ بہکایا انہیں دیر و حرم نے شب و روز
تیرے دیوانے مگر کوئے بتاں تک پہنچے

برہمن پہنچا وہاں اور نہ شیخ والا
لغزشوں سے تیرے مستانے جہاں تک پہنچے

ہم سے رندانِ خوش انفاسِ محبت کے سوا
کس کو توفیق درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

جس کو مطلوب ہو حسینِ یقیں کی منزل
وہ مرے مرتبۂ وہم و گماں تک پہنچے

رنجش زخم جگر کوئی اٹھائے پہلے
تب کہیں بات مرے حسنِ بیاں تک پہنچے

دل بھی حیران و پریشان اسی فکر میں ہے
پا بہ زنجیر کسی سروِ رواں تک پہنچے

پھر سے کونین ہوں مست مئے عرفانِ الست
میری آواز اگر دونوں جہاں تک پہنچے

للہ الحمد ہمارے ہی سہارے آخر
آج واعظ بھی درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

عشق میخانہ سے کل روک رہے تھے ہم کو
آج خود شیخِ حرم کیسے یہاں تک پہنچے

میری مٹی کو ملا حسنِ نیابت تیرا
جن کو تھا نازِ عبادت وہ کہاں تک پہنچے

ترجماں صرف ہے اردو ہی رواداری کی
کس کو دعویٰ ہے محبت کی زباں تک پہنچے

رشکِ گلزارِ اِرم کیوں نہ چمن ہو اپنا
کیوں نہ ہر غنچہ و گل باغِ جناں تک پہنچے

○

اردو تہذیب کا دوسرا نام

قرۃ العین حیدر

(●)

مجھے وادیٔ کشمیر میں کسی جگہ ایک طویل القامت پروہت دکھلائی دیا جو ایک سنسان پگڈنڈی پر تنہا چلتا ہوا شیو مندر کی طرف جا رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی جسے ایک آبشار کی آواز منتشر کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لمحات میں مجھے ہزاروں برس قبل کے مصری اور آشوریائی معبد اور ان کے دراز قد پراسرار پروہتوں کا خیال آیا جو گویا ۱۹۸۱ء کے اس کشمیری پروہت کے ہم عصر تھے۔ کیونکہ سارا وقت ایک ہے مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ مصرِ قدیم کے وہ پروہت ہزاروں برس قبل معدوم ہو چکے لیکن کشمیر کے ان پروہتوں کا ایک پڑپوتا، ایک برہمن زادہ یعنی اقبال رمز آشنائے روم وتبریز نکلا۔ میرا خیال ہے کہ اس برصغیر کے باشندوں کو جس حد تک اپنے ماضی کی ہمہ گیری کا احساس ہے تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد زائل ہو گیا۔ ہمارے یہاں اپنے اپنے ماضی کے شدید احساس نے مختلف فرقوں میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے جن سے مختلف نتائج برآمد ہوئے۔ بحرحال وہ سرخ پوش طویل القامت پروہت اپنے راستے پر گامزن ہے اور کمبل پوش کشمیری صوفی بھی چنار کے درخت کے نیچے جائے نماز بچھائے بیٹھا ہے۔ یہ دو فیگر منجمد بھی ہیں اور متحرک بھی۔ آج کے دور میں جب کہ وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی جن کا نام ہی اس ساری تاریخ کا مظہر ہے وہ جس روایت کی نمائندگی کرتے ہیں وہ عالمگیر ہیومن ازم کی ایک درخشاں روایت ہے۔ اردو شاعری کی کشادہ مشربی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس کی تلمیحات (Establishment) کی ہمیشہ سے مخالف رہی ہیں۔ اور اسی روایت نے دونوں فرقوں میں ایک سے ایک اعلیٰ اہلِ قلم شاعر، ادیب، موسیقار اور مصور پیدا کیے۔ مخدوم جہانیان جہاں گشت کی پڑپوتی یہ ناچیز مشرق ومغرب کے مختلف ملکوں کی سیر کر چکی ہے لیکن کہیں ایسی رنگا رنگ کثیر الجہت تہذیب نہیں دیکھی جو برصغیر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں موجود ہے۔ سارے لڑائی جھگڑوں، بیوقوفیوں اور حماقتوں کے باوجود یہ تینوں گاڑیاں چھک چھک چلے جا رہی ہیں۔

کچھ بات ہے جو ہستی مٹتی نہیں ہماری

ذاتی طور پر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اس بزرگ صوفی کی قائل ہوں جنہوں نے کہا تھا کہ ''میرا کام قینچی سے کاٹنا نہیں بلکہ سوئی دھاگے سے جوڑنا ہے'' لہٰذا یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گلزار دہلوی اس مثبت درخشاں روایت کے امین ہیں۔

علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی یادگارِ داغ جنہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد اندر پرست کالج دہلی میں ۳۹ سال اردو فارسی پڑھائی اور مجھے فخر ہے کہ اس کالج میں پنڈت جی میرے استاد رہے جہاں دہلی یونیورسٹی کے بی اے میں انگلش کے ساتھ اردو کا ایک پرچہ بھی لازمی تھا۔ اور ایک دلچسپ بات جو آج کے لوگوں کو بہت انوکھی معلوم ہوگی وہ یہ تھی کہ پنڈت جی باضابطہ مولوی صاحب کہلاتے تھے اور ساری دلّی میں وہ مولوی صاحب کے لقب سے ہی مشہور تھے۔ چنانچہ جاننا چاہیے کہ ہندو مسلم اتحاد سرکاری پالیسی، سیمینار اور کانفرنسوں کے ذریعے تخلیق نہیں کیا جاتا یہ ایک خودرو گلشن ہے جو صدیوں کی رواداری اور تہذیبی یگانگت کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد میں پنڈتانِ کشامیر کی آبادیاں اسی فراخ دل اور رچی ہوئی تہذیب کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور معالج جو کشمیری پنڈت تھے۔ ان کی بیٹی کا بیاہ ایک اور کشمیری پنڈت سے ہو رہا تھا۔ منڈپ میں پھیرے پڑنے والے تھے۔ شادی کی ساعت جو برہمنوں نے اپنے علم کے ذریعے نکالی تھی وہ آیا ہی چاہتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہماری دوست کے خاندانی پیر جن کا انتقال ہو چکا تھا ان کی کھڑاویں کشمیر سے اب تک لکھنؤ نہیں پہنچیں تھیں جن کے گرد گھوم کر پھیرے ڈالے جاتے۔ کیونکہ کشمیر میں سیاسی گڑبڑ شروع ہو چکی تھی اور وہ لڑکا ابھی تک لکھنؤ نہیں پہنچا تھا۔ سارے منڈپ میں شدید پریشانی اور اضطراب کا عالم طاری تھا جب اچانک آ گیا آ گیا کا شور مچا اور وہ نوجوان شاداں وفرحاں منڈپ میں داخل ہوا۔ چنانچہ اگنی کے گرد پھیرے ڈالنے کے بعد دولہا دلہن نے پیر صاحب کے کھڑاؤں کا بھی طواف کیا تب شادی کی رسوم مکمل ہوئیں۔

آج کے دور میں جب زیادہ تر رویے منفی رجحانات کے مظاہر ہیں اس تہذیبی ہم آہنگی کو اگر اپنے معاشرتی رویوں کے ذریعے از سرِ نو دریافت اور اجاگر کیا جائے تو ہمارے بیشتر معاملات خود بخود سلجھ جائیں گے۔ اردو شاعری میں استاد اور شاگرد کا یہ سلسلہ کسی شاہی خاندان کے نسب نامے سے کم اہم نہیں۔ اہلِ مغرب روایت کے اس تسلسل کی معنویت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ استاد اور شاگرد کی یہ کلچر مغرب میں مفقود ہے۔ جب معاشرے میں امن وآسائش کی فراوانی تھی مختلف اساتذہ کے شاگردوں کے مابین آویزش بھی رہتی تھی۔ شعر و شاعری اور شعر گوئی اعلیٰ تمدن کی خصوصیت تھی۔ جس طرح جاپان کی رسمِ چائے نوشی ان کے فلسفہ زین کی نمائندگی بھی کرتی ہے ہمارے یہاں اردو فارسی شاعری تصوف کی انسان دوستی کی علامت تھی اور استاد وشاگرد کا سلسلہ گویا ایک مابعد الطبیعاتی سلسلہ بھی تھا۔ انگلستان یا یورپ میں آپ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا کہ اس کے پردادا جان کیٹس کے شاگرد تھے وہاں کی تہذیب ہی مختلف ہے۔

چنانچہ ہمارے یہاں حضرت گلزار دہلوی کی شخصیت اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر ادبی روایت کے رکھوالے ہیں۔ آزادی کے بعد

ہندوستان سے ہجرت کر کے ممالکِ غیر میں آباد ہونے والے ہندوستانیوں نے کینیڈا سے لے کر آسٹریلیا تک اردو کی چھاؤنیاں چھائی ہیں۔ جہاں چند اردو والے جمع ہوں وہاں ایک مشاعرہ بھی ضرور ہوگا اور آج کل سات سمندر پار منعقد ہونے والے مشاعروں کے میر محفل گلزار دہلوی کی موجودگی اس شعر کی تفسیر ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

اردو شاعری محض ادب ہی نہیں آدابِ محفل کی آئینہ دار اور بذاتِ خود ایک تہذیب ہے۔ ایک پابند وضع اردو مشاعرے سے مشابہ ایک اور اعلیٰ مدنیت کی نمائندگی راقم الحروف نے جاپان کی رسمِ چائے نوشی میں دیکھی جو ان کے فلسفۂ زین کی شارح ہے۔ اسی طرح اردو شاعری تصوف کی بنیادی انسان دوستی کی مفسر ہے۔ کشمیر کی شعری روایت اس انسان دوستی کی پیغامبر ہے اور پنڈت گلزار دہلوی اس انسان دوستی یا Humanism کے ایک نمائندے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ انسان دوستی ایک صدا بہار موسم گل ہے اور گلزار دہلوی اس کے ایک ہر دل عزیز سفیرِ کبیر۔ خدا کرے موصوف کے ایسے اور ان گنت جنم دن گلستانِ اردو میں منائے جائیں۔ آمین۔

☆

''محسنِ اردو''

میں تو آپ کی ادب دوستی، ذہانت، شاعری اور فن تقریر کا ۱۹۴۶ء جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے دور ہی سے قائل ہوں۔ آپ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ اردو کے محسن ہیں۔ آپ اردو کے ممتاز اہلِ زبان کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ فن آپ کا خاندانی ہے۔ علامہ زار زتشی دہلوی یادگارِ داغ اور نواب سائل نے آپ کی تربیت کی ہے۔ گلزار دہلوی بجا طور پر ان کے جانشین کہلانے کے حقدار ہیں۔ ان کا تخلیقی، برجستہ شاعری، ٹکسالی زبان اور اردو زبان کی تحریک میں نمایاں کردار پانی کے بھرے کٹورے میں گلاب کی پتیوں کی طرح اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ ادھر ''سائنس کی دنیا'' نکال کر تو انہوں نے ہر طرف اپنا لوہا منوالیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی اردو کانفرنسوں اور انجمن تعمیرِ اردو کی دلّی میں اردو تحفظ کوششوں نے آپ کو اردو دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ اب سے بہت پہلے ان کا کلام چھپ جانا چاہیے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کے کچھ احباب اب یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ میں ان کی کامیابی اور ان کے مجموعہ کلام کی مقبولیت میں پورا یقین رکھتا ہوں۔

پروفیسر آل احمد سرور

''قادرالکلام شاعر''

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار فرزند علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی یادگارِ داغ ایک خاندانی و موروثی شاعر ہیں۔ اہلِ زبان ہیں۔ دلّی کی ٹکسالی زبان بولتے ہیں۔ میں ۴۲-۱۹۴۰ء سے اُن سے واقف ہوں۔ اُنہیں ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل ہے۔ غزل، نظم، رُباعی، قطعہ، نعت و منقبت ہر میدان میں انہوں نے دادِ سخن دی ہے۔ وہ سائل و کیفی کی یادگار اور زار صاحب کے جانشین ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں وہ ہر جگہ مقبول ہیں۔ میں نے سینکڑوں شاعروں میں اُن کا کلام اور تقاریر سُنیں ہیں۔ اللہ نے اُنہیں ایک دردمند اور انصاف پسند دل بھی عطا کیا ہے۔ وہ اُردو کے مجاہد ہیں۔ وہ پندرہ سولہ سال مشاعروں میں میرے ہم سفر بھی رہے ہیں۔ میں نے ہر صحبت میں انہیں مہذب، نیک انسان، روادار اور عاشق رسولؐ پایا ہے۔ اُردو پر تو ان کی رُباعیاں بے مثال ہیں۔

جس طرح اُنہیں مجھ سے محبت ہے، اس سے زیادہ میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ اس دور میں ایسے لوگ کہاں؟ یہ سب اُن کے والد اور والدہ کی تربیت کا نتیجہ ہے یہ گلزار صاحب نہ صرف ایک کامیاب اور مقبول غزل گو شاعر ہیں بلکہ اعلیٰ انسانی قدروں اور اُردو کی ہچکولے کھاتی نیّا کے محافظ بھی ہیں۔ مجھے گلزار ان کا کلام اور اُن کی سرگرمیاں سب بہت عزیز ہیں۔ میں نے ۱۹۴۳ء سے اب تک پندرہ برس میں کبھی اُن کا کوئی دعوت نامہ رد نہیں کیا۔ انجمن تعمیرِ اردو، اُردو مردم شماری کمیٹی اور آل پارٹی اردو کنونشن (۱۹۵۹ء) میں ہمیشہ اُن کی استقبالیہ و انتظامیہ کا رُکن رہا۔

میرا خیال ہے اب یہ زمان اور اس کردار کے سانچے ڈھانچے اُن کی ذات پر ختم ہیں۔ یہ دلّی کی محفلوں کے آخری روشن چراغ ہیں۔ میں اُن کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

جگر مرادآبادی

سائنس اور شاعری

خواجہ احمد عباس

(●)

گلزار زتشی جو مجھ سے صرف نو برس چھوٹے ہیں مگر انسٹھ برس کی عمر میں کالج کے ایک خوبصورت لڑکے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر ہیں جنہوں نے درجنوں رباعیات سنائی ہیں جن کی ہر رباعی میں اردو، قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کا ذکر ہے۔ کئی ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں، ابھی حال ہی میں پاکستان کے دورے پر ہو کر آئے ہیں۔ سرکٹ ہاؤس اودے پور میں میرے ہمسایہ تھے جہاں ان کی زندگی کی نئی نئی جھلکیاں سامنے آئیں۔ اردو زبان پر ان کی قدرت، بلا کی فصاحت و بلاغت، ہر صنفِ سخن پر عبور اور اردو سے والہانہ عشق زبردست متاثر کرنے والا تھا۔ اور کیوں نہ ہو جب والد علامہ پروفیسر زار دہلوی، یادگارِ داغ کے فرزند ہیں اور معہ والدہ حضرت بیزار دہلوی کے سارا خاندان شاعر ہے۔

عام طور سے سائنس اور شاعری کو ایک دوسرے کا متضاد سمجھا جاتا ہے جو شاعری کے رسیا ہیں وہ سائنس سے کوسوں دور رہتے ہیں اور جو سائنس کے دلدادہ ہیں وہ شاعری سے پرے رہتے ہیں مگر دس برس ہوئے سویت یونین میں ایک معرکتہ الآرا مذاکرہ ہوا تھا جس میں سائنس والوں اور شاعروں دونوں نے حصہ لیا۔ اور سائنس کے دور میں شاعری کی ضرورت اور اہمیت کے حق میں اظہارِ خیال کیا گیا۔ کیونکہ سائنسی دماغ کے لیے مفید اور ضروری مواد شاعر کی زبان ہی دے سکتی ہے۔ دلی سے جناب گلزار دہلوی کی برسوں کی کوشش کے نتیجے میں کونسل آف سائنٹیفک وانڈسٹریل ریسرچ (حکومتِ ہند) نے سائنس کو عام فہم اور ہر دلعزیز بنانے کے لیے ان کی ادارت و انتظام میں ایک سہ ماہی مجلّہ ''سائنس کی دنیا'' اردو میں شائع کرنا شروع کیا ہے جو بارہ سال سے آب و تاب اور کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ رسالہ برصغیر ہندو پاک میں اپنی نوعیت کا واحد و بے مثل رسالہ ہے اور اس کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک شاعر دانشور کی زیرِ ادارت نکلتا ہے۔ اور ملک کے متعدد انعامات و اعزازات حاصل کر چکا ہے۔ یہ شاعر اپنی لگن اور اردو میں سائنس کی واقفیت کی تڑپ کی وجہ سے اس کے بانی، مدیر، ناشر و تابع ہیں اور ہمہ تن اس کی ترقی سے وابستہ ہیں۔ حکومتِ ہند کے کتنے ہی اردو رسالے مرکز اور صوبوں سے نکلتے ہیں جس میں با آسانی ایک مشہور شاعر اور قلم کار اور نامور ادیب کو جگہ مل سکتی ہے مگر اردو کو سائنسی علوم سے مالا مال کرنے کا یہ جذبہ اور کوشش گلزار صاحب ہی کے حصے میں آتی ہے۔ جس کا انہوں نے لاجواب حق ادا کیا ہے۔ یہ شاعر ہیں ادیب ہیں اور بے بدل صحافی اور سائنس کے مربّی ہیں۔

علامہ پنڈت پروفیسر زار دہلوی (یادگارِ داغ) کے صاحبزادے پنڈت گلزار زتشی دہلوی جو ساٹھ کے ہونے پر بھی خوب رو، جامہ زیب، کالج کے نوجوان و حسین صاحبزادے معلوم ہوتے ہیں۔ نوجوانی ان کے سرخ و سفید چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ حال ہی میں میں نے اودے پور کے ایک مشاعرے میں بجلی کی طرح چمکتے، کڑکتے نوجوان ترین شاعر کی صورت میں دیکھا۔ اگرچہ وہاں دس بارہ ان سے کم عمر شاعر بھی موجود تھے مگر گلزار صاحب اپنی باتوں سے اپنے باوضع انداز، پڑھنے کے اسٹائل، بیان کی روانی اور اپنے خیالات کے باغیانہ اسلوب سے نوجوان ہی لگتے تھے۔ الفاظ ان کے آگے دست بستہ کھڑے تھے۔ یہ امر جوانی انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے ورثے میں پائی ہے۔ مزاج کی تیزی بھی پنڈت جی کی دین لگتی ہے۔ اور مزاج کی عقلیت بھی، جس کی بنا پر انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو میں سائنس کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ جو ایک مفید اقتضائے وقت اور معروضی و پائیدار مثبت خدمتِ زبان و ادب ہے۔ مگر شاعرانہ طبیعت انہوں نے اپنے والد علامہ پنڈت زار دہلوی سے پائی جو حضرت داغ دہلوی کے ارشد اور اولین شاگرد تھے۔ ان کی والدہ بھی دہلی کی اہلِ زبان مانی جاتی ہیں اور شاعری میں نواب سائل دہلوی سے تلمذ رکھتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ دلی کی عورتوں کی ٹکسالی زبان سننا ہو تو اس پنڈ تائن سے سنو۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن (ناظم عمومی جمعیت العلمائے ہند) کہتے تھے کہ اگر دلّی آ کر گلزار دہلوی کی والدہ سے نہیں ملے تو دلّی ہی نہیں دیکھی۔ مولوی پنڈت زار (استادِ عربی و فارسی) کے ہم عصر اور نئی نسل کے سینکڑوں ہندو، مسلمان، ادیب، شاعر، صحافی طلبہ اور طالبات اس گھرانے سے اردو عربی میں اکتسابِ فیضِ علم اور فیضانِ زبان و سخن حاصل کرتے تھے۔ اور نئی نسل کے ادب اور شعراء جو گلزار دہلوی کے ہم عصر یا چھوٹے تھے ان کی تو گنتی ہی نہیں۔ علامہ زار نے اپنی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کوئی اڑتیس برس اندر پرسٹ کالج و دلّی یونیورسٹی میں اردو، فارسی و عربی پڑھائی۔ نوے برس کی عمر تک کالج میں درس دیتے رہے۔ حضرت داغ کے رشتے سے گلزار دہلوی اردو زبان کی گود میں پلے ہیں اور آج انہیں ''غازی اور شہیدِ اردو'' کہا جاتا ہے۔ ان کے بچپن کے بزرگوں اور استادوں میں مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (یادگارِ حالی)، نوح ناروی، احسن مارہروی، علامہ اقبال، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی ایسے باکمال اساتذہ و شعراء شامل ہیں جن کی ہم نشینی و فیض صحبت سے گلزار دہلوی آسودہ ہوئے۔ گویا شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔

ابتدائی کلام اپنے والد کو دکھایا اور سات برس کی عمر میں نواب سائل و آٹھ برس کی عمر میں پنڈت دتاتریہ کیفی کے شاگرد ہوئے۔ مولانا روم و اسلامی دینیات سائل صاحب اور مفتی کفایت اللہ سے حاصل کی۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے بھی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک نصابی و اکتسابی دریاست حاصل کیے۔ ایم اے ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی، ادیب فاضل و منشی فاضل ہوئے۔

''چہارسُو''

اردو کے عاشقِ بے بدل ہیں جیسے صوفی بزرگ عشقِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں وہ گلزار دہلوی کی حالت اردو کے ساتھ ہے اسی لیے انہیں ''گلزار خسرو'' کہا جاتا ہے جو خطاب انہیں نیشنل خسرو اکاڈمی آستانہ حضرت نظام الدین اولیاء سے ملا ہے۔ خود جیسا کہ انہوں نے اپنی رباعیوں میں کہا ہے کہ وہ یا تو غازیِ اردو کہلانا چاہتے ہیں یا شہیدِ اردو۔ اور اس کے علاوہ انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اردو کے حق، تحفظ، تبلیغ میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے انجمن تعمیرِ اردو اسی مقصد سے چلا رہے ہیں۔ یہی اردو کا بے پناہ عشق ان کو سائنس کی دنیا تک لے آیا۔ مولانا آزاد کے ایما پر وہ ۱۹۵۳ء سے سی ایس آئی آر سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں اندرا گاندھی کے ایماء پر اردو کے مشاورتی بورڈ برائے سائنس کے معتمد اور سائنس کی دنیا کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اس بورڈ کے پہلے صدر پنڈت آنند نرائن ملا تھے۔ دیگر اراکین میں ڈاکٹر سید حسین ظہیر، پروفیسر رئیس احمد، انور جمال قدوائی، دیوان آنند کمار، پروفیسر سروپ سنگھ، حکیم عبدالحمید، شری پی این ہکسر اس کے ممبر ہوئے۔ انہوں نے یہ مجلّہ جاری کر کے مولوی عبدالحق اور پنڈت دتاتریہ کیفی سے کیے گئے اپنے عہد کو پورا کیا۔ تاکہ سائنسی علوم اور معلومات کو عام اردو طبقے تک پہنچایا جا سکے اور معاشرے میں سائنسی مزاج اور سائنسی رویہ پیدا ہو سکے جس میں وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔

گلزار صاحب نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۳ء تک دنیا کے متعدد ممالک کا، مشرقی یورپ اور عوامی جمہوریتوں کا سفر بھی کیا اور برلن (جرمنی) کے نوجوانوں کے میلے میں نوجوان شعرائے عالم کے مقابلے میں یوتھ لاریٹ کا خطاب اور تین ہزار جرمن مارکس اور امنِ عالم پر نغمۂ انسانیت کے نام سے ایک نظم میں دوسرا انعام جیتا جس کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ وہاں بابلو نرودا، ناظم حکمت، اوشنسن اور ریمون دین ایسے عالمی مشاہیر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ میاں افتخار الدین (پاکستان) اور ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے (ہندوستان) عالمی جیوری میں شامل تھے۔ وہ پاکستان اکثر بلائے جاتے ہیں۔ وہاں وہ اپنی شاعری کے محاکات اور خدماتِ اردو کے لیے عوام وخواص میں یکساں مقبول ہیں۔ روزنامہ جنگ، نوائے وقت اور دوسرے روزناموں ویکلی اور ماہنامہ اخبارات و رسائل میں پورے پورے صفحات پر ان کے رنگین اور باتصویر انٹرویو، مضامین اور کلام شائع ہوئے ہیں۔

گلزار زتشی دہلوی صاحب سے میری ملاقات بڑی یادگار رہی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم کی جولانیوں سے اردو ادب اور شاعری کو اور عوام کے لیے سائنسی علوم کو اسی طرح اگلی صدی تک جگمگاتے رہیں گے اور اسی خدمت سے وہ یادگارِ زمانہ لوگ کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو والے یقیناً جلد یا بدیر ان کی سہی قدر افزائی کریں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اگلی آنے والی نسلوں میں کوئی دوسرا گلزار بھی آئندہ پیدا ہوگا؟

''مستند و فصیح شاعر''

تقسیم ہند کے بعد خاص طور پر جس جوش اور ولولے اور جذبے کی نوجوانوں میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اسے گلزار دہلوی میں بدرجہ اتم پا کر طبیعت کو اطمینان ہوا۔ کانگریس ہو یا جمیعتہ العلمائے ہند یا دارالعلوم دیوبند کے جلسے، گلزار دہلوی کو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسن احمد مدنی کی سرپرستی اور ہماری تحسین واعانت حاصل رہی ہے۔ انجمن تعمیرِ اردو کے ذریعے ان کا جہاد اردو جہادِ تحریک آزادی سے کم جذبہ نہیں رکھتا۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی کوشش ہو یا دلی صوبے میں اردو کی بحالی کی وہ ہمیشہ ہمارے شانہ بشانہ قدم بہ قدم ہم نوا رہے ہیں۔

مسلم ممالک کے جتنے سربراہ، شہنشاہ، صدر، وزیراعظم یا دوسرے رہنما جن جن ہستیوں کا جمیعتہ العلماء ہند یا حکومت ہند اور کانگریس نے استقبال کیا ہے گلزار دہلوی نے ہمیشہ ان تقاریب میں منظوم سپاسنامہ استقبالیہ پیش کر کے علماء واکابر سے داد پائی ہے۔

دلّی کی سماجی، سیاسی، ادبی اور روحانی مجلسوں میں ان کی ذات ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور ہمارا ان کا تعاون مستقل ہو چکا ہے۔ بیس برس سے وہ ہمارے ہم سفر ہیں۔

میں ان کی قادرالکلامی اور پختہ گوئی اور شاعری کا دل سے معترف اور قائل ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو یا مسلمانوں کے لیے، دلّی میں جن لوگوں نے بے دریغ سینہ سپر ہو کر کام کیا ہے گلزار دہلوی اس کے سربراہ ہیں اور سارے ملک میں اردو اور دلّی کے نقیب ہیں۔ وہ خود رمضان المبارک میں ایک روزہ رکھ کر ایک تقریب روزۂ رواداری کی، آزادی سے پہلے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کی اس تقریب رواداری میں ہم سب دل وجان سے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے اور اردو کو ایک مستند و فصیح شاعر کی ادبی وقومی خدمات سے مالا مال رکھے۔ آمین۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن

صحبتِ آدمی مبارک ہو

سید ضمیر حسن دہلوی
(دہلی، بھارت)

محفل کے کسی کونے سے سبک، شیریں طراز، دل کی نگری میں طوفان بپا کرنے والی کوثر وتسنیم کی دُھلی سمندر کے جوار بھاٹے کی طرح اترتی، چڑھتی گاہ مقفّی و مسجع گاہ محاوراتی، روزمرہ برجستہ برمحل اشعار سے آراستہ، شین قاف کی کھنک اور پیچوان کا تڑا قا لیے ہوئے بے تکان، متواتر سکون اور ٹھہراؤ سے بے نیاز گفتگو کان میں پڑے تو سمجھ لیجیے کہ گلزار دہلوی تشریف فرما ہیں۔ دلی کی لسانی تاریخ میں سب سے زیادہ مستند، بے تکلف، رواں، ٹکسالی زبان حضرت داغ کی تھی۔ گلزار کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی، داغ کے شاگرد تھے۔ ان کے حصے میں بوساطتِ داغ قلعۂ معلّٰی کی جو دولت آئی تھی وہ جناب گلزار دہلوی بڑی دریا دلی سے لٹاتے پھرتے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے علامہ زار دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موصوف بڑے کم سخن آدمی تھے۔ ایک مرتبہ کنور صاحب نے ان سے کہا حضور آپ بہت کم بولتے ہیں اور ہمیں یہ موقع نہیں دیتے کہ آپ کے ارشادات سے استفادہ کرسکیں وہ فرمانے لگے ''بیدی صاحب یہ بولنے اور متواتر بولتے رہنے کا فریضہ میں نے اور میرے کُل خاندان نے میرے چھوٹے بیٹے فرزندار جمند جگر بند گلزار کے حوالے کیا ہے۔ باپ کی اس سونپی ہوئی ذمہ داری کو بیٹا کس خوش اسلوبی سے نباہ رہا ہے اس کا اندازہ میری طرح سامعین کرام کو بھی ہوگا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے میرے تعارفی کلمات کے بعد ان کا نزول ہوگا تو وہ آپ اپنا لوہا منوالیں گے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب شنیدہ کہ بود مانند دیدہ۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر وجواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے

کشمیر کی کلی، شہابی رنگ، جیسے روح افزا کے ساتھ ملک شیک کو ہتا ہے، بلوری کنچوں جیسی شریر آنکھیں، سر پر چھوٹے چھوٹے گھنگریالے بال سیاہ اور چمکدار خدا جانے رنگے ہوئے یا قدرتی؟ ستواں کھڑی کھڑی ناک چہرے کی مناسبت سے موزوں اور متوازن، گوش بر آواز متجسس کان غزالانِ ختن کے کانوں کی مانند متوجہ اور مستعد، تیکھے خدوخال، کشادہ پیشانی، زعفران کے پھولوں کی طرح تروتازہ، چہرے پر جھریوں کا کہیں نام ونشان نہیں۔ ڈاڑھی مونچھ صاف ایسا خط بناتے ہیں کہ بارہ برس کے سن کا مزاگالوں سے لے لیجیے۔ چار پہر کھونٹی ٹٹولئے گا سوا مایوسی کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ جلد ملائم، مہین، مرغن ریشم کی طرح پھسلواں، قدرے لمبوترا چہرہ، گردن نہ چھوٹی نہ بڑی نازک پتلی اور شفاف، پان کھائیں تو پیک جھلکے سرتال سے پوری طرح درست گلا، ذرا چھدری بھویں اور ننھی ننھی چلمن جیسی پلکیں، ہلکا پھلکا، ڈیل ڈول چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ابھرا ہوا سینہ پچکا ہوا پیٹ سڈول گاؤدم پنڈلیاں، بھرے بھرے بازو، اٹھے ہوئے کندھے، ایسی اچکن کا بوجھ کہ پوری ہمت حوصلے اور ذمہ داری سے سنبھالے ہوئے جو بفضل خدا ان جیسے دو آدمیوں کو اپنے اندر سنبھالنے کی استعداد رکھتی ہے۔ پاؤں میں زریں کفش کی جوڑی اور ٹانگوں پر چوڑیدار پاجامہ، گھٹنوں سے ٹخنوں تک وائل کے دوپٹے کی طرح چنا ہوا۔ گلدستہ جیسے ہاتھ میں ریشمی رومال جس سے وہ بار بار اپنے کچنار کی کلی جیسے سکڑے ہوئے تنگ دہانے اور گلاب کی پتیوں جیسے پتلے پتلے ہونٹوں کو رگڑتے رہتے ہیں۔ یہ ہے اس شخص کا سراپا جس کی آواز سن کر ہر ذی حس صاحب سماعت اس کی طرف توجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سنا ہے غیر ملکی سیاحت کے دوران جب یہ تقریر دلپذیر چھیڑتے ہیں تو اجنبی لوگ محض لب ولہجے کے اتار چڑھاؤ میں سرتال کا مزا ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور عش عش کرتے ہوئے حال کھیلنے لگتے ہیں۔ ہم دہلی والوں کے لیے گلزار کا دم بڑا غنیمت ہے۔ حسن پرستی کی تسکین بھی ہوتی ہے اور اگر کوئی پوچھتا ہے کہ جادو بیانی کا کیا مطلب ہے، دلی والے اپنے تئیں موجد باب فصاحت کیوں کہتے ہیں۔ لب ولہجہ کی جھنکار کیا ہوتی ہے، تو ہم اسے گلزار دہلوی سے بھڑا دیتے ہیں۔ دلی کی چھتنار درخت تو آندھیوں کی نذر ہوگئے۔ نہ سخنور ہے نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی البتہ ان کے ہوتے ہوئے دلی نہیں مرسکتی یہی ایک شہر میں قاتل بچا ہے۔ جس محفل میں گلزار نہیں وہ بھلا کیا محفل ہوئی سونی سونی بے رنگ بے مزا اور جہاں آں جناب تشریف رکھتے ہیں وہاں فرشتے بھی دوزانو بیٹھ جاتے ہیں، ان کے مرحبا کہنے کی آواز کانوں کو صاف سنائی دیتی ہے۔

ہائے وہ پھول سے رخسار وہ قد بوٹا سا
جس جگہ بیٹھتے ہیں گلزار لگا دیتے ہیں

گلزار دہلوی کے اجداد تین صدیوں پہلے کشمیر سے دہلی آئے تھے۔ ان کے خاندان میں اکثر بزرگوں نے تعلیمی پیشے کو اپنایا علم اور خصوصاً زبان کے علم کا انہیں اچھا خاصا سرمایہ ورثے میں ملا ہے۔ خود بھی ماشاءاللہ ایسا ذوق رکھتے ہیں جو اکتساب فن کے معاملے میں کبھی مطمئن نہیں ہوتا چنانچہ دہلی اور بیرون دہلی کی ادبی نشستوں، مذاکروں اور مشاعروں میں بنفس نفیس حاضر باش رہتے ہیں۔ طبیعت مرنجان ومرنج پائی ہے صوفیوں کی محفل میں انہیں دیکھ لیجیے، سائنسدانوں کی بزم آرائی میں یہ موجود، اہل سیاست کے منصوبوں اور مشوروں میں انہیں دخل، مشاعروں اور مراختوں کے یہ روح رواں، غرض یہ کہ جہاں گلزار نہیں ہوتے ہم دہلی والے اسے محفل ہی نہیں گردانتے۔

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا چراغ ہر ایک بے حضور تھا

دلی ہمیشہ کا فلک زدہ شہر رہا ہے۔ اس کی حدود چالیس چالیس میل کے قطر میں ادھر اُدھر گھومتی رہیں۔ جو لوگ دلی کی تاریخ سے واقف ہیں وہ ان انقلابات کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے اندر پرستھا سے شاہجہاں آباد تک اس اجڑے دیار میں لوگ آتے رہے۔ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا دلی کے

جانباز مکین بھی بڑے سخت جان ہیں۔ غدر میں انگریزوں سے داخلے کا پروانہ لے کر موت کے منہ آتے رہے۔ پھانسیاں پائیں، سولی چڑھے، دردر کی بھیک مانگی مگر دلی کی خاک پاک سے رشتہ نہ توڑا تقسیم وطن کے بعد جو ہنگامے ہوئے مارکاٹ کا بازار گرم ہوا اس میں ثابت قدم رہے جو بے چارے زبردستی نکال دیے گئے وہ سرحد کے اس پار دلی پیاری کو یاد کرتے کرتے موت کی آغوش میں جا سوئے جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے، کسی نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی خاک منگا کے آنکھوں میں لگائی کوئی خواب میں شاہجہان کی مسجد جہان نما کے مینار دیکھتا رہا۔ جنہیں توفیق ہوئی وہ مرتے کٹتے وطن مالوف کو لوٹ آئے غرض یہ کہ دلی اور دلی والوں کی کہانی بڑی دردناک ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

سننے کے لیے لوہے کا کلیجہ چاہیے۔ اب ایک تازہ افتاد اس شہر خموشاں پر یہ آن پڑی کہ اہل تجارت نے اسے منڈی بنالیا ہے۔ دلی والوں نے ہوت کی پریشانیاں تو سدا دیکھی تھیں۔ ہوت کی پریشانیاں اب دیکھی ہیں پورا شہر کاروباری سرگرمیوں سے اٹا پڑا ہے۔ سانس لینے کے لیے ہوا کو بار نہیں۔ جن گلیوں کو ذوق چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے وہاں طرح وضع کی صنعتیں لگا رکھی ہیں۔ مزدور پیشہ دنیا کے کونے کونے سے آ کر یہاں آباد ہوئے اور دلی والوں کی بربادی کا سبب بنے۔ نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہ بات چیت کا شعور، ست بچھڑی فحش گالیوں سے آلودہ زبان، پاس پڑوس کا ذرا لحاظ نہیں۔ اندھادھند کمانے سے کام، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کے نام پر ساپرسی رام ہوگیا۔ جس کی گانٹھ میں نہیں ہو پیسہ وہ بھلا مانس کیسا۔ دلی کا لٹا پٹا قافلہ ایک بار پھر سے چھپانے کے لیے نیا کونا تلاش کرنے لگا جس کے جہاں سینگ سمائے نکل بھاگا جان پر بنے تو جھیل جائے۔ عزت آبرو، شرافت، زندگی کے ضابطے، ادب آداب اور معاشرت کا ستھرا پن کیسے داؤں پر لگادیں۔ شہر میں افراتفری کا عالم ہے۔ سیلاب کی طرح افسانوں کے ریلے روز بروز چلے آتے ہیں وہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات۔ اسی آفت کے مارے جناب گلزار دہلوی بھی اس دیار میں تشریف لے آئے جہاں احقر پہلے سے گوشہ نشین ہے۔ گھر کو چراغ مل گیا بچھڑوں کی اپنوں سے ملاقات ہوئی۔ ہم پیشہ وہم مشرب وہم راز ملا۔ ہم سخن اور ہمزباں ہاتھ آیا تو جی میں شوق اور گدگدی پیدا ہوئی اور یہ کلمات آپ کی سماعت کے لیے جناب گلزار دہلوی کو بطور نذرانہ پیش کیے۔

گر قبول افتد زہے عزّ وشرف

مکرمی آنند نرائن ملا نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ اگر مجھے مذہب یا اردو زبان میں سے کسی ایک کو چھوڑنا پڑے تو میں اپنے مذہب کو چھوڑ سکتا ہوں اردو زبان کو نہیں۔ ملا کی یہ بات ہندوؤں کے برگزیدہ طبقے کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جو اردو کا دلدادہ ہے اور اسے مشترکہ تہذب کا گرانقدر ورثہ جانتے ہوئے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

مشترکہ تہذیب ہندوستان کے ایک ہزار سالہ ہندو مسلم اشتراک، میل محبت، جذباتی ہم آہنگی اور رسم ورواج کے لین دین کی پیداوار ہے۔ چنانچہ ہر ذی فہم ہندوستانی اس کی قدر کرتا ہے۔ گلزار دہلوی بھی اردو اور مشترک تہذیب کے تناور درخت کی ایک مضبوط شاخ ہیں۔ ان کی جڑیں عرب، عجم، بغداد، قسطنطیہ، سمرقند اور بخارا تک پھیلی ہوئی ہیں اسی لیے وہ بھی اردو زبان اور مشترکہ تہذیب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ بیک وقت رام لیلا کی تقاریب اور حضرت نظام الدین اولیاء کے آستانے پر کیے جانے والے عرس کی انتظامی مجالس سے عملی طور پر وابستہ ہیں۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسلام سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ عرس، وعظ، سیرت کے جلسے، نعتیہ مشاعرے، پندوموعظت کی محفلیں سب ان کی معیت اور سرپرستی وصدارت میں منعقد ہوتی ہیں۔ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے۔ کسی کے عمل نیک پر شک کرنا اسلامی تعلیمات کی رو سے ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ گلزار دہلوی کو دیکھ کر مسلمانوں کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور بدباطن اور متعصب لوگ مانند موئے آتش دیدہ حسد سے بل کھانے لگتے ہیں۔

دلی ہمیشہ دل والوں کی بستی رہی ہے۔ اس نے باہر سے آنے والے بے سہارا لوگوں کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ دلی شہر کو بائیس خواجگان کی چوکھٹ بھی کہا جاتا ہے۔ درویشوں کے قدوم میمنت لزوم نے دلی کو یہ شان امتیاز بخشی ہے کہ یہاں کسی قسم کی تنگ نظری تعصب اور تنفر کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ جو دلی میں آ گیا تو وہ اپنا ہو گیا جو اس سعادت سے مرحوم رہا دلی نہیں آسکا وہ بھی اپنا ہے۔ اولادِ آدم سے بلا امتیاز فرقہ بندی دلی والوں نے محبت کرنا سیکھا ہے۔ انسان دوستی، اخوت، بھائی چارہ، تہذیبی رنگارنگی، طبیعتوں کا رچاؤ مزاجوں کی ہم آہنگی، دردمندی، ایثار، سب دہلوی تہذیب کی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ ہے۔ یہ شہر عہد وسطی میں بغداد اور اصفہان سے زیادہ پسندیدہ رہا۔ دنیا زمانے کے لوگ کھینچ کھینچ کر یہاں آتے رہے اور کچھ دن بعد یہیں کے ہو رہے۔ اس شہر کا بین الاقوامی کردار، اس کی تہذیبی رواداری، وسیع النظری، کشادہ قلبی تاریخ میں ایک روشن اور پائندہ مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ گلزار دہلوی اسی تہذیبی ادارے کے پروردہ ہیں وہ جہاں بھی رہیں گے دلی کے زریں اصولوں، آئین، جوانمردی اور تہذیبی اختلاط کو فروغ دیتے رہیں گے۔ یہ ان کا مشن ہے۔ ہر دلی والے کا نصب العین ہے۔ چنانچہ ایک نئی بستی یعنی نوئیڈا کے لیے ایک مبارک شگون ہے کہ انہوں نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ ضرور اس خطے کے نصیب ان کے فیضان سے جاگیں گے۔ لوگ کہتے ہیں انہوں نے اور میں نے دلی چھوڑ دی یہ غلط ہے۔ شاہین کی طرح ہم آسمان کی بلندیوں پر کہیں بھی پرواز کریں ہمارے دل ہمارے آشیانے دہلی میں پڑے رہیں گے۔ ہم نے دلی کو ایک نئی وسعت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جمنا کے اس پار مغرب اور جنوب میں دلی ہمیشہ پھیلتی اور پھولتی رہی ہے۔ اب مشرق کی باری ہے۔ مشرقی افق سے ایک نیا سورج طلوع ہوگا اور سارے جہاں کو روشنی بخشے گا۔ آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا۔

مومن آیا ہے بزم میں تیری
صحبتِ آدمی مبارک ہو

ہفت زبان مجموعۂ خوبی

سید حامد
(علی گڑھ، بھارت)

اس دور میں بمشکل چند صورتیں ایسی نظر آئیں گی جو مکمل طور پر مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر ہوں اور اخلاقِ حمیدہ کا پیکر ہوں۔ اگر سیکولرازم کی صحیح تصویر دیکھنا ہو اور اردو ہندی فارسی زبان، سنسکرت اور عربی کا کلچرل ورثہ، کشمیر پنجاب دلی اور یو پی کا سنگم ایک نظر اور ایک شخص میں دیکھنا مقصود ہو تو گلزار دہلوی صاحب کو دیکھ لیجیے۔

گلزار صاحب ایک بلند پایہ شاعر، ایک ذی علم ادیب، ایک مخلص و نادر صحافی اور ایک شعلہ بیان و گل فشاں مقرر ہیں۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نہ صرف اپنے والد ماجد قادر الکلام علامہ پروفیسر پنڈت تربھون زتشی زارؔ دہلوی یادگار داغؔ کے ہی جانشین نہیں ہیں بلکہ حضرت بیخود دہلوی، حضرت نواب سائل دہلوی اور علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی و مولوی عبدالحق کے بھی صحیح جانشین و یادگار ہیں اور ادب میں داغ و حالی کے ادبی خانوادے کے مایۂ ناز نبیر ہیں۔ اردو کے شیدائی و فدائی، مجاہد و مبلغ بھی لاثانی اور جماعتی، تنظیمی، قومی و ملی، ادبی و تخلیقی کاموں میں کامل فنکار اور انسانیت پرست ہندوستانی ہیں۔ انجمن تعمیرِ اردو اور ادارۂ نظامیہ کے ۱۹۶۴ء سے بانی مبانی اور روح رواں ہیں۔

گلزار صاحب ایک اعتبار سے اقبال سے مماثلت و نسبت رکھتے ہیں۔ دونوں کشمیری برہمن زادے، دونوں کو داغ دہلوی سے نسبت اور دونوں اردو زبان کے شاعر، ان کا تعلق نہ صرف اقبال سے ہے بلکہ ایک رخ سے سرسید احمد خان سے بھی ہے۔ دونوں دہلوی، دونوں نے اردو میں سائنس کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ اردو نثر پر سرسید کا اتنا ہی بڑا احسان ہے جتنا اقبال کا اردو شاعری پر۔ پہلی بار سرسید کی سادہ، پرزور اور مدلل نثر کے امکانات کو روشن کیا۔ اسی روش کو آگے بڑھاتے ہوئے گلزار صاحب نے ادبی انشاء پردازی، مضمون نویسی، تنقیدی مضامین اور شاعری پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں پہلا عام فہم اور ہردلعزیز موقر جریدہ ''سائنس کی دنیا'' قائم و جاری کر کے آزاد ہندوستان میں ایک تاریخی اور بڑا کامیاب تجربہ کیا جو جدید دور میں اردو پر عظیم احسان ہے۔ اردو میں سائنس کو روشناس کرانے کا کام اس دور میں اور کسی کو نہ سوجھا۔ گلزار صاحب نے اس خارزار کو بھی گلزار بنا کر رکھ دیا۔

جس طرح فصیح و بلیغ اور آبشار کی روانی کی طرح ان کی شاعری اور تقاریر سجیلی اور ٹکسالی ہوتی ہے وہی زبان و بیان کا کرشمہ ان کی سائنسی اردو مضامین، ادارت، صحافت اور ترجمہ کا حصہ ٹھہری ہے۔ ان کی تقریر و تحریر دونوں کرشمہ ہیں۔ زور بیان، شکوہِ الفاظ، سائنس کی نپی تلی اصطلاحیں اور موزوں و برمحل الفاظ یہی کہتے ہیں:

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

گلزار صاحب کے یہاں فنکارانہ دیانت و اخلاص اور جرأت مند اظہار خیال کے ساتھ سائنسی تحریروں میں ضبط و تحمل اور معروضی انداز بیان ہے۔ وہ ایک فراخ دل، روشن خیال، وسیع المشرب، روادار، سخن سنج، اسلام دوست، موحدّ عاشقِ رسول اور ایک اعلیٰ صفت مشاہد، جستجو کار اور تجربہ و تفکر کا حسین امتزاج ہیں۔ گویا انہوں نے سرسید اور اقبالؔ کے کام کو بھی آگے بڑھایا اور داغؔ و آزاد اور سائلؔ و کیفیؔ و زارؔ کی روایات وضع داری کو بھی۔ اردو کی دنیا میں سائنس کی اشاعت اور ''سائنس کی دنیا'' میں اردو کی اشاعت کامیابی سے کر کے دس بارہ برس میں یہ ثابت کر دیا کہ:

یہ ہر کارے کہ ہمت بستہ کردد
اگر خارِ بود گلدستہ کردد

عام طور پر لوگ شاعر کو صرف شاعر اور صوفی منش چشتی نظامی وابستگی کو صرف تصوف، فلسفہ اور ادب و فن کی حدود تک ہی متصور کرتے ہیں مگر گلزار صاحب نے یہ بھی دکھا دیا کہ

''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے''

اور شاعری کے ساتھ سائنس کا مجلّہ نکال کر دونوں دنیاؤں سے، اردو سے بھی اور سائنس سے بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ یہ دراصل واقعی ایک بڑا اور تاریخی کام ہے۔ جس کا سہرا ان کے سر ہے۔

انہوں نے اپنی متنوع اور رنگارنگ خدمت سے کئی حدیں پار کیں اور اردو کا Pardoxe یا قولِ محال کو ثابت کر کے دکھا دیا۔ خاص طور پر وضع اصطلاحات اور انگریزی کی تکنیکی اصطلاحوں اور الفاظ کے مناسب اردو میں قریب ترین معنی و مفہوم و ترجمے شائع کر کے بھی وہ اردو داں طبقے کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گلزار صاحب نہ صرف کہنہ مشق اور فصیح اہلِ زبان اور بلند پایہ شاعر کی حیثیت ہی سے بلکہ اردو کے خادم اور سائنسی صحافت کے بانی کی حیثیت سے زندۂ جاوید رہیں گے۔

چہارسو

ایسے بھی کچھ ادیب ہیں کہ جنہیں
علم و زر جب نصیب ہوتے ہیں
بانٹتے ہیں چہارسو وہ مفت
آدمی یہ عجیب ہوتے ہیں

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

اردو کا سچا عاشق

احمد سہیل
(کینیڈا)

میری پچھلے دنوں دہلی میں سفید شیروانی کی جیب میں گلاب کا پھول، سفید چوڑی دار پاجامہ اور سر پر نہرو کٹ ٹوپی میں زیب تن اردو کے باغ و بہار شاعر گلزار دہلوی سے یادگار اور دلچسپ ملاقات رہی۔ گلزار دہلوی کا پورا نام پنڈت آنند کمار موہن زتشی گلزار دہلوی ہے۔ ۷۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں پرانی دہلی کے محلے کشمیرن میں ولادت ہوئی۔ نسلاً کشمیری ہیں۔ ان کے والد کا نام پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی تھا جو خود بھی شاعر تھے ان کی ابتدائی تعلیم رام جیشن اسکول اور بی۔ وی، جے سنسکرت اسکول میں ہوئی۔ انہوں نے ہندو کالج سے ایم۔ اے کیا اور قانون کی سند حاصل کی۔ گلزار صاحب نے انجمن ترقی اردو ہند سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور علامہ دتاتریہ کیفی کے بہت قریب رہے۔ ان کا کہنا ہے ''اردو محض زبان نہیں ہے یہ محبت اور امن کی زبان ہے جو اصل ہندوستان کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو شخص اردو بولتا ہے کہ وہ اپنے خاندان میں گھر کے افراد کو اردو سیکھائے اور چھٹی جماعت تک اردو بولنا، لکھنا اور پڑھنا سیکھنا چاہیے۔'' وہ ہندو مسلماں کے اتحاد کی علامت ہیں۔ آزادی کے بعد ہندیم کے جدیری ''ویگان پریتی'' کے وقائع نگار بنے۔ بھارت کے پہلے وزیر تعلیم نے انہیں اردو کے پہلے سائنسی جریدے ''سائنس کی دنیا'' کے مدیر کی خدمات سونپی۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''کلیاتِ گلزار'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بہت بذلہ سنج انسان ہیں۔ اچھے لطیفہ گو ہیں۔ جس محفل میں ہوں اسے گل و گلزار بنا دیتے ہیں۔ داستان گوئی کے انداز میں پرانے واقعات سناتے ہیں۔ ان کا ایک دلچسپ لطیفے نما واقعہ سن لیں:

علی گڑھ نمائش کا مشاعرہ تھا۔ انور صابری اور گلزار دہلوی ایک ساتھ ہی آئے تھے۔ مشاعرہ میں بے ضرورت ہونگ چل رہی تھی۔ ناظم مشاعرہ نے حالات (اور طلبہ) پر قابو پانے کے لیے گلزار دہلوی کو دعوت کلام دی۔ وہ مشاعروں کے سرد و گرم چشیدہ تھے۔ انہوں نے جگہ، موقعہ اور سامعین کا لحاظ کرتے ہوئے نعتیہ قطعات پڑھنے شروع کیے مگر سامعین میں موجود لڑکے ہلڑ کے موڈ میں تھے۔ آخر انور صابری مائک پر آئے اور لڑکوں شرم و غیرت دلائی کہ ایک غیر مسلم نعتیہ قطعات پڑھ رہا ہے اور آپ لوگ چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ بات درست تھی۔ طلبہ شرمندہ ہوئے اور اتنے کہ گلزار دہلوی کو داد دینے کے لیے بھی کسی نے لب نہ ہلائے۔ انور صابری پر اس بات کا بھی تاثر ہوا۔ چنانچہ جب ان کو بلایا گیا تو انہوں نے مکدر مزاجی کے لیے ناسازی طبع کا بہانہ بنا کر کہا بس دو شعر پڑھوں گا۔

مجمع میں سے ایک دل جلے طالب علم نے آواز ماری:

''دو روپے ملیں گے''

طلبہ میں قہقہہ پڑا اور انور صابری نے دو شعر بھی نہ سنائے۔ بعد میں گلزار دہلوی کی درخواست پر انہوں نے بے دلی سے چند شعر سنا دئے تھے۔ ان کے اشعار سن لیں:

حسن توحید کا خزینہ ہیں
خاتمِ علم کا نگینہ ہیں
ہر طرف تو خدا کا جلوہ ہے
میرے دل میں شہ مدینہ ہیں

زندگی تیرے دم قدم سے ہے
زیست کا لطف تیرے غم سے ہے
مجھ کو فردوس کی ضرورت کیا
میری جنت تو تیرے دم سے ہے

جہاں انسانیت وحشت کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہو
وہاں تذلیل ہے جینا وہاں بہتر ہے مرجانا

مٹ مٹ کے ابھرتی ہیں قسمت کی لکیریں
ہم وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے رہے ہیں

''پیروی''

1937ء، انڈیا میں کانگریس کی حکومت بنی تو مہاتما گاندھی نے اپنے وزیروں کو سادگی کی زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''میں آپ کو شری رام چندر اور شری کرشن بھگوان کا حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ قناعت اور سادگی کی مثال کے لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام پیش کروں وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے مگر انہوں نے اس کے باوجود فقیروں والی زندگی گزاری اور ہر وقت اپنی سلطنت کے عام آدمی کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر رہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ لوگ بھی حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی پیروی میں ایسا نمونہ پیش کریں کہ آنے والے حکمرانوں کے لیے ایک مثال بن جائے۔''

تیغِ بے نیام

فاروق ارگلی

(دہلی، بھارت)

قرآن کریم اور گیتا کے تقدس کا پرتو، اسلامی آگہی کا عکس، سادھوسنتوں کا پریم گیان، بزرگانِ دین کی عقیدتوں سے منور قدیم ہندو مسلم مشترکہ تمدن کا چمکتا، دمکتا اور چہکتا ہوا خوبصورت چہرہ، میر، غالب، ذوق، مومن اور داغ کی فصاحتوں کا جھرجھر بہتا ہوا آبشار، کوثر و تسنیم اور گنگا جمنا میں دھلے شفاف لب وہ لہجے میں بولتی ہوئی دہلوی تہذیب اور چلتا پھرتا قلعۂ معلیٰ..... یہ ہیں نازشِ اردو، گلزارِ خسرو، شاعرِ قوم، طوطیِ نظامی، بلبلِ ہند، مجاہدِ آزادی اور جانثارِ اردو پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی۔

راشٹریہ سہارا کے مدیر باتدبیر جناب عزیز برنی کا موبائلی ہدایت نامہ صادر ہے کہ فخرِ ادب گلزار دہلوی صاحب کی سالگرہ پر لکھنا ہے، قوتِ فکر معطل اور خامہ انگشت بدنداں ہے کہ کیا کہیے اور کیا لکھیے، کہاں سے شروع کروں، کہاں ختم کروں، جسے ساری دنیا جانتی ہو اس کا تعارف کیونکر کراؤں؟ پچھلے ستر اسّی برسوں میں جس طرح اس بلبل ہزار نغمہ کو دیکھا سنا اور جانا ہے وہ سب بیان کرنے کو تو ایک کتاب بھی کافی نہ ہو، چہ جائیکہ اخبار کا یہ چھوٹا سا صفحہ اور یہ مختصر سا مضمونچہ۔ قارئین بس یہ تصور فرمالیں کہ اردو کی اس مایۂ فخر شخصیت کے تئیں یہ محض ایک مختصر خراجِ محبت ہے۔

پنڈت آنند موہن زتشی کشمیری پنڈتوں کے اس معزز خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اسلاف اپنے علم و فضل کی بناء پر عہد شاہجہانی میں مغلیہ شہزادوں کے اتالیق ہوئے اور مناصب و جاگیریں پائیں۔ فارسی، عربی اور ہندوستانی علوم ان کی میراث بنے، اردو زبان اپنے ارتقائی دور سے ہی ان باکمال پنڈتوں سے وابستہ رہی ہے۔ اور اس طرح گلزار دہلوی پشتینی اور خاندانی اردو والے ہیں، اردو تہذیب ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور دہلویت ان کی رگ و پے میں بسی ہے۔ اس عروس البلاد میں ان کی جڑیں کتنی گہری ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پرانی دہلی کا مشہور محلّہ بازار سیتارام ان کے جدِّ اعلیٰ پنڈت سیتارام زتشی کے نام پر آباد ہوا تھا اور گلی کشمیریان اس نام سے یوں مشہور ہوئی کہ وہاں اس خاندان کی حویلیاں تھیں، وہ حویلیاں تو نہ رہیں، وقت نے ہر عظمتِ پارینہ کو کھنڈروں میں تبدیل کردیا ہے مگر گلزار دہلوی اسی رعایت سے خود کو ''دلّی کا روڑا'' کہتے ہیں۔ انہیں بجا طور پر اپنے وطن دہلی اور اپنی ٹکسالی زبان پر ناز ہے:

دس پشت سے پالا ہے مرے آبا نے
اردو کی حسیں طرز و طرح ڈالی ہے
اردو کے بگڑتے ہوئے ماحول میں بھی
جو لفظ زباں پر ہے وہ ٹکسالی ہے

گلزار دہلوی نے 7 جولائی 1926 کو دہلی کے نامور شاعر پنڈت تربھون ناتھ زتشی آرزو دہلوی کے گھر میں جنم لیا۔ خار صاحب فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے عزیز شاگرد تھے۔ آپ اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی زبان و ادب کے علاوہ ریاضی، اسلامیات اور ویدانت کے بھی جیّد عالم تھے، انہوں نے اورینٹل کالج لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد سے اکتساب علم کیا تھا۔ گلزار صاحب کی والدہ محترمہ برج رانی صاحبہ بھی قادر الکلام شاعرہ تھیں اور بیزار دہلوی کہلاتی تھیں۔ انہیں یادگار داغ نواب سائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ گلزار دہلوی کے ماموں پنڈت گردھاری لعل کول عاشق بھی مشہور شاعر تھے۔ ایسے گھرانے میں ہوش سنبھالنے والے بچے پر شعر و سخن کا اثر پڑنا فطری امر تھا۔ گلزار صاحب کو پیدائشی اور نجیب الطرفین شاعر کہا جانا حق بجانب ہے، یہ صرف 8 سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد نواب سائل دہلوی اور حالی کے شاگرد پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی زائرِ غالب اور بابائے اردو مولوی عبدالحق سے فیضان علم و فن کے مواقع انہیں نصیب ہوئے۔ اردو زبان و تہذیب سے والہانہ اور مجنونانہ عشق کی وراثت بزرگوں سے ملی۔ انہیں مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، علامہ راشد الخیری، مولانا سعید اکبر آبادی، مولانا حسین احمد مدنی، جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کی بابرکت قربتوں نے علم و آگہی کی دولتوں سے مالا مال کر دیا۔ قدرت نے ذہانت و فطانت کا خزانہ ودیعت کیا تھا۔ بحیثیت شاعر 1936 سے یعنی دس سال کی عمر سے ہی معروف ہونے لگے تھے لیکن مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ انہوں نے دلّی یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل و منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ گلزار صاحب نے اپنے بزرگوں کی طرح اپنے کیریر کا آغاز درس و تدریس سے کیا تھا، وہ دلّی کے مختلف اسکولوں کالجوں میں جز وقتی طور پر اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ بعد میں وہ دہلی کلاتھ ملز کے ویلفیئر ٹرسٹ میں لالہ سر شنکر لعل کے تعلیمی و ثقافتی مشیر بھی رہے مگر 1952 میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نظروں میں آئے جو مرکزی وزیر تعلیم و سائنسی امور تھے، مولانا کے دور وزارت میں ہی کاؤنسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کا محکمہ قائم ہوا تھا۔ گلزار صاحب اس ادارے کے اشاعتی ڈائریکٹوریٹ سے وابستہ ہوئے۔ یہاں تک کہ 1990 میں انہوں نے اسی محکمے کے تحت اردو ادب و صحافت کی تاریخ کا منفرد کارنامہ انجام دیا۔ گلزار صاحب نے اردو زبان کو سائنس سے جوڑنے کے لیے اس محکمے کی جانب سے رسالہ 'سائنس' کی دنیا جاری کیا اور 12 برسوں تک اس کے مدیر رہے۔ سائنسی علوم کو اردو زبان میں عام کرنے میں ان کا سائنسی مزاج اور غیر معمولی ذہن کارفرما تھا۔ ان کی یہ کوشش تاریخ کا حصہ بن گئی۔ انہیں ''سائنسی شاعر'' بھی کہا جاتا ہے۔

گلزار صاحب کی پوری زندگی غیر معمولی مصروفیتوں او رہمہ جہت سرگرمیوں میں گزری ہے۔شعروشاعری، تعلیم و تعلّم، آزادی کی جدوجہد، سرکاری ملازمت اور آزادیِ وطن کے بعد ایک مخصوص اردو دشمن ذہنیت سے مسلسل معرکہ آرائی، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔تقسیم کے بعد جب ہندوستان میں اردو کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب رہا تھا،گلزار دہلوی انجمن تعمیر اردو کے ذریعہ 1947 کی لٹی پٹی دہلی میں اردو کے چراغ روشن کر رہے تھے۔ نئے ہندوستان میں اردو کے نئے درو بام تعمیر کرنے کی یہ کوشش نا قابل فراموش رہی،ان کی انجمن کے پروگراموں میں اس عہد کے تقریباً تمام ہی مشاہیر نے حصہ لیا ہے۔انجمن تعمیر اردو کے معمار کی حیثیت سے گلزار صاحب کی علمی ، ادبی ، تنظیمی اور تہذیبی خدمات گزشتہ نصف صدی سے، حالات وماحول کے تغیر وتبدل کے باوجود اب بھی کسی نہ کسی نہج سے جاری ہیں۔

ایک عہد ساز شاعر کی حیثیت سے ان کی ہمہ گیر مقبولیت محتاج تعارف نہیں ،اپنے شعری وتخلیقی سفر کے بارے میں گلزار صاحب لکھتے ہیں۔

''اپنے والد کے معاصرین یعنی داغؔ، حالیؔ اور آزاد کے اشرف تلامذہ، اساتذہ فن ودیگر اہلِ زبان ہیں جن کے ساتھ فخر ہم نشینی اور فخر خورد ونوش کے علاوہ جن کے ساتھ مشاعروں میں حاضر رہ کر امتیازِ ہم کلامی وسخن گستری کا موقع ملا ان میں چند نامور ہستیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

''مولانا حسرتؔ موہانی، بیخودؔ دہلوی، آغا شاعر قزلباش، نواب مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، نوحؔ ناروی، سیمابؔ اکبرآبادی، دلؔ شاہجہاں پوری، ناطقؔ گلاؤٹھی ، وحشتؔ کلکتوی ، ندرتؔ میرٹھی ، جوشؔ ملسیانی ، تجمؔ آفندی ، محوی صدیقی، حیرت بدایونی ، جوشؔ ملیح آبادی ، جگر مرادآبادی ، حفیظؔ جالندھری، فراقؔ گورکھپوری ، آنند نارائن ملا، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا عبدالمجید سالک، خواجہ حسن نظامی دہلوی ، مولانا راشد الخیری، خواجہ عبدالمجید، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی کفایت اللہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ دہلوی، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مآنیؔ جائسی، احسان دانشؔ ، بہزادؔ لکھنوی ، مجید لاہوری، ظریف جبلپوری، مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی، ادیب سہارنپوری، سراج لکھنوی، قدیرؔ لکھنوی ، مجاز لکھنوی ، علی سردار جعفری ، وامقؔ جونپوری، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی ، روشؔ صدیقی، ساغرؔ نظامی ، شمیمؔ کرمانی ، راغبؔ مرادآبادی ، منوہر سہائے انورؔ، حمایت علی شاعرؔ، فرقتؔ کاکوروی، جمیل الدین عالیؔ، صابر دہلوی ، اقبالؔ صفی پوری ، حبیب جالبؔ، افتخار عارف، شوکت تھانوی ، نذیرؔ بنارسی ، سید محمد جعفری ، مجروحؔ سلطانپوری، سید سجاد ظہیر، کیفی اعظمی ، ساحرؔ لدھیانوی، بسملؔ سعیدی، ہری چند اختر، منورؔ لکھنوی، طالبؔ دہلوی، عرشؔ ملسیانی، جگن ناتھ آزادؔ، مولانا انورؔ صابری، محشر بدایونی، خمارؔ بارہ بنکوی، پرویزؔ شاہدی، عالمؔ فتحپوری، رازؔ مرادآبادی، رئیس امروہوی، رفعتؔ سروش، امیر احمد خسرو، سلیمان اریب، مخدوم محی الدین، نیاز حیدر، سکندر علی وجدؔ، مشیرؔ جھنجھانوی، عزیزؔ وارثی، رام کشن مضطرؔ، خورشید جامی اور انجمن تعمیر اردو (جس کا میں 1947 سے تاحال بانی وصدر ہوں) میں شریک ہونے والے ادیب شاعر، اہلِ قلم جو 1956 سے 1982 تک میری ہی انجمن میں شریک ہو کر دلی سے رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھائے اور مختلف یونیورسٹیوں کالجوں اور اداروں، مشاعروں اور مذاکروں کی روح رواں بن کر آج مشہور عوام وخواص ہو چکے ہیں۔''

(خودنوشت سوانح)

بحیثیت شاعر گلزارؔ دہلوی ایک خاص لب ولہجہ کے حامل ہیں، ان کے کلام میں اردوئے معلیٰ کی لطافت اور ان کی مخصوص جمالیاتی فکر کے پرتو کے ساتھ ساتھ عصری حسیّت ،قومی یکجہتی اور محبوبہ اردو سے مجنونانہ عشق کے جذبات پوری شدت سے نمایاں ہیں ۔حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی کلام میں عقیدتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔گزشتہ نصف صدی سے وہ عالمگیر سطح پر مشاعروں مذاکروں اور ادبی محفلوں کی جان بنے ہوئے ہیں۔ان کی مرصع گفتگو اور پڑھنے کا جوشیلا انداز سامعین کو اسلاف کی یاد دلاتا ہے۔

گلزار دہلوی سیاسی طور پر جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔1945 میں وہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے وابستہ ہوئے تھے۔ ان کے بعد رئیس الاحرار مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے انتقال تک جمعیۃ سے ان کا رشتہ مسلسل قائم رہا۔گلزار دہلوی سے مولانا مدنیؒ اتنے متاثر تھے کہ ایران ترکی اور سعودی عرب وغیرہ کے سربراہان جب ہندوستان تشریف لاتے تو ان کی شان میں سپاسنامے اور خیر مقدمی نظمیں انہی سے پڑھواتے تھے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو سے ان کا خاص تعلق رہا۔1958 میں پنڈت جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں دہلی میں جو تاریخی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے گلزار صاحب سکریٹری تھے۔انہوں نے اردو زبان اور تہذیب وثقافت کی ترویج وترقی کے لیے لالہ مہیشور دیال، جمنا داس اور سید سجاد ظہیر جیسے مشاہیر کے ساتھ یادگار اجتماعات منعقد کیے ۔گلزار صاحب نے اپنی شعلہ بار جذباتی تقریروں اور دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی نظموں سے مسلسل آدھی صدی تک اردو عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔آزاد ہندوستان میں اردو زبان کے لیے عوامی اور بین الاقوامی سطح پر آواز بلند کرنے والوں میں گلزار دہلوی کی ذاتِ گرامی سب سے نمایاں ہے۔وہ بیک وقت ایک نامور شاعر، ادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے عالمی سفیر اور سب سے بڑے وکیل بھی ہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت برصغیر کی سرحدوں سے باہر 40 سے زائد ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے 'نشانِ پاکستان' سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔

گلزار صاحب دنیا کے تقریباً 50 ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔1951 میں برلن (جرمنی) میں منعقد تیسرے عالمی میلہ برائے نوجوانانِ عالم میں ادبی مقابلہ بہ موضوع ''امنِ عالم'' میں ''یوتھ لاریٹ'' کا اعزاز اور 3000 جرمن مارکس کا انعام ملا تھا۔اقوام متحدہ کی جانب سے 36 ممالک کے شعراء کی کانفرنس کے موقع پر گلزار صاحب نے ہندوستان کی نمائندگی کی، وہ پہلے اردو شاعر وادیب

ہیں جنہوں نے یواین او میں اردو زبان میں تقریر کی اور تمغۂ اعزاز حاصل کیا۔ ہندو پاک اور دنیا بھر کے ممالک کی انجمنوں، اکیڈمیوں اور اداروں کی جانب سے انہیں اس قدر ایوارڈز، اعزازات اور سپاسنامے پیش کیے جا چکے ہیں کہ ان کے گھر میں انہیں رکھنے کی جگہ کم پڑ گئی ہے۔

گلزار دہلوی صاحب مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے زمانے سے ہی درگاہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ سے عملی اور روحانی طور پر وابستہ ہیں، وہ گزشتہ نصف صدی میں محافلِ اعراس، طریقت وتصوف کے مذاکرات اور دیگر متبرک اجتماعات میں سجادگان، صاحبزادگان اور پیرزدگان کے ہمدوش سرگرم نظر آتے رہے ہیں۔ آپ 1945 سے ادارہ نظامیہ ٹرسٹ سے وابستہ ہیں۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ نے دہلی کی تاریخی رام لیلا شروع کی تھی جو آج بھی ہر سال بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتی ہے ۔ گلزار صاحب 35 برسوں سے اس مذہبی ادارے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آپ رام لیلا کمیٹی کے تشکیل کردہ حفاظتی رضا کار دستہ کے کمانڈر بھی ہیں۔ ان کی قیادت میں جو حفاظتی دستہ کام کرتا ہے۔ اس میں ہندوؤں کے ساتھ مسلم نوجوان بھی خاصی تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔ جناب گلزار دہلوی نے اس طرح شہر دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا مؤثر راستہ نکالا ہے۔ ان کے تربیت یافتہ رضا کاروں کا یہ دستہ جس میں ہندو نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس شریف میں بھی زائرین کی خدمت انجام دیتا ہے۔ گلزار صاحب کی کوششوں سے بھرت ملاپ کے موقع پر ایک ایسے جلسے کا انعقاد بھی شروع ہوا جس میں ہندو صاحبان کے ساتھ ہی مسلم عمائدین بھی حصہ لیتے ہیں، 1947 کے بعد دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا یہ نیا دور گلزار صاحب کی بدولت ہی شروع ہوا۔

اسلامی تعلیمات اور مسلم تہذیب سے گلزار دہلوی کس درجہ متاثر ہیں اس کا اندازہ ان کی گفتگو اور روزمرہ کی زندگی سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی، احادیث مقدمہ اور بزرگان دین کے ملفوظات تکیۂ کلام ہیں ۔ سالہا سال سے رمضان المبارک میں ان کے روزہ رواداری کی تقریب افطار دھوم دھام سے منائی جاتی ہے جس سے ہندو مسلم سکھ عمائدین بڑی محبت سے شریک ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ و آہنگ سے بہت سے لوگ ان کو ایک ثقہ اور متشرع مسلمان سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سچے ہندو برہمن ہیں اور اپنے مذہب کی تمام قدروں سے آگاہ ہیں۔ وہ رامائن گیتا اور ویدوں کا پاٹھ بھی اسی روانی سے کرتے ہیں جس طرح وہ قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو نذر آتش کیے جاتے وقت کا وہ منظر راقم السطور نے خود دیکھا تھا جب چتا میں آگ دی جا رہی تھی اور آخری رسوم ادا کرنے والا پنڈت ٹھیک عمل نہیں کر رہا تھا، اس وقت پنڈت گلزار دہلوی نے شدھ سنسکرت کے اشلوک روانی سے پڑھتے ہوئے کرم کانڈ مکمل کرایا۔ شمشان کا پنڈا شیروانی پوش پنڈت گلزار صاحب کی پنڈتائی دیکھ کر حیران تھا۔

میرے ناقص خیال میں گلزار دہلوی سوا سو کروڑ کی آبادی والے ہندوستان میں ایسے سچے ہندو ہیں جن کی شخصیت اس ملک کی تاریخ ساز مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کی روشن روایات کا مجسم نمونہ ہے۔

گلزار صاحب اب 90 سالہ بزرگ ہیں لیکن نوجوانوں کی طرح شوخ وشنگ، پھرتیلے اور سرگرم نظر آتے ہیں۔ تحریر وتقریر میں وہی جوش وخروش ہے جو 70 سال پہلے تھا، اردو دشمنوں کے لیے آج بھی وہ شمشیر برہنہ ہیں اور محبوں کے لیے شجر سایہ دار۔ 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ کانگریس پارٹی اور سیاست سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو گئے۔ گلزار صاحب نے ایک شاندار اور فعال ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ ان کے صاحبزادے ایم بی اے ہیں اور ممبئی کی ایک بڑی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی صاحبزادی پنڈت نہرو اور سروجنی نائیڈو کے خاندان میں بیاہی ہیں، جو اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں، لطف کی بات ہے کہ دونوں ہی اردو زبان اور شعروشاعری کے دلدادہ ہیں۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت رتن موہن ناتھ خارؔ دہلوی معروف شاعر ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائیوں نے لکھنؤ میں رہائش اختیار کی ہے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی کے پوتے راج زتشی کی شادی فلم اسٹار عامر خان کی بہن سے ہوئی ہے۔ پورا خاندان خدا کے فضل سے خوشحال اور معزز ہے۔ گلزار صاحب کو اگر کوئی غم ہے تو وہ اردو تہذیب کے زوال اور اردو والوں میں اپنی زبان وروایات کے تئیں عدم بیداری و بے عملی کا غم ہے۔

بحیثیت مجموعی گلزار صاحب کی شخصیت اتنی پہلودار ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر اردو میں لسانی، تہذیبی، حسیاتی، محاکاتی اور جذباتی عصری عجوبوں کی کوئی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ یا ''عالمی بیاض تمثال'' مرتب ہوتی تو سرفہرست یہی نام ہوتا، پنڈت گلزار دہلوی۔ اردو زبان، احترامِ آدمیت، روایتی وضع داری اور سیکولر اقدار کے تئیں استواری کی ہر شرط پر کھری اترنے والی ان کی وفاداری دیکھ کر تو میں اکثر سوچنے لگتا ہوں کہ غالبؔ کے سامنے گلزار صاحب جیسا کوئی برہمن ضرور رہا ہوگا جس کو انہوں نے بت خانے میں مرنے کے باوجود کعبہ میں گاڑے جانے کے لائق سمجھا تھا۔

''گل وگلزار''

میں تو آپ کی فصاحت، قادر الکلامی، زبان دانی اور مشّاقی کا پہلے سے قائل ہوں آپ کا دم اس زمانے میں غنیمت ہے۔ ادھر آپ کی تین طویل نظمیں نظر سے گزریں۔ امنِ عالم، مولانا ابو الکلام آزاد اور آبروئے دکن۔ ان میں آپ کی روانی مطبع اور جولانی اور شعری صنعتیں پورے شباب پر ہیں۔ آپ کی زبان وبیان کا اور فنکاری کا میں اور بھی قائل ہو گیا۔ گلزار صاحب خدا آپ کو گل وگلزار اور سدا بہار رکھے اور آئندہ نسلوں کو اگلی صدی تک آپ سے استفادہ وفیض حاصل کرنے کا موقع ملے۔

علامہ نیاز فتح پوری

غازیٔ ملت

محترم گلزار دہلوی کے نظمیہ کلام کا عکس

عطیہ سکندر علی (سکھر)

بادشاہ خان

(سالارِ اعظم سرخ پوشاں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی ہندوستان آمد پر ۱۹۶۹ء)

اے مجاہدِ غازیٔ ملّت دھنی کردار کے
ہار پہناتا ہوں تجھ کو دکھ بھرے اشعار کے

داستانِ گاندھیؔ و نہروؔ یہاں دہرایئے
بے وفا ملت میں بھی پھر خان بابؔا آیئے

محوِ حیرت ہوں کہ کس منہ سے کروں سواگت ترا
مجرمانہ طور پر ہم نے تجھے رسوا کیا

طوطا چشمانِ وطن پھر تیرا نظارہ کریں
جشنِ صد سالہ پہ گاندھیؔ جی کے کفّارہ کریں

وہ سبھی مجرم ہیں جو تقسیم کر بیٹھے قبول
ایک قومی نظریہ کے قتل کو کر بیٹھے اصول

اتحاد قوم کی ذلت کے ذمہ دار ہیں
صوبہ سرحدؔ کی مروّت کے سبھی غدّار ہیں

ہم نے بھولا اور بھلایا تیری بھگتی کا سبق
یاد ہے تاریخ میں تیری جدائی کا ورق

حملے جو گاندھیؔ پہ بھی کرتے رہے اب تک رکیک
وہ بھی ہیں اب ماشاء اللہ خیر مقدم میں شریک

کیوں نہ ایسی قوم کا دنیا میں پھر بیڑا ہو غرق
کیا منافق اور مخلص میں رہا باقی نہ فرق

اجملؔ و انصاریؔ و آزادؔ کی تصویر ہے
پھر بھی کتنی مختلف ان سے تری تقدیر ہے

قصّہ خوانی کے مجاہد تو بڑا غم کوش ہے
سرخ پوشانِ وطن کا بادۂ سرجوش ہے

بستی بستی میں روا ہے اب تعصّب کا رواج
کون کر سکتا ہے بابؔا اس تشدد کا علاج

کرب میں سوز دروں ہے جس سے ہم شرمندہ ہیں
کیا تجھے دیں گے صلہ ہم نیم مردہ زندہ ہیں

داستانِ درد کو کس واسطے اب دیجئے طول
پاس دو اشکِ ندامت ہیں اسے کیجیے قبول

یہ برہمن زادۂ کشمیرؔ کی آواز ہے
گویا گلزارؔ وطن کا اک شکستہ ساز ہے!!

○

ڈاکٹر ذاکر حسینؔ

(سابق صدر جمہوریہ ہند)

اے وطن کے اتحاد و آدمیت کے نقیب
اے غنی روح آزادیٔ طبیعت کے غریب

ماہرِ تعلیم ہندیؔ اے حکیم نکتہ داں
مہرباں تجھ پر خدا ہو اے علیم سخت جاں

دین و دنیا کے مشاغل میں ہمہ ذاکرؔ تھا تو
فقر پر اپنے زمانے میں سدا فاخر تھا تو

قوم کی یکجہتی کامل کو تجھ پر ناز تھا
اہل علم و فن میں بھی تیرا جدا انداز تھا

جو بھی خدمت قوم نے جس وقت بھی سونپی تجھے
کس وفا کیشی سے تا تکمیل پہنچایا اسے

یوں تو جب بھی صدر تھا جب تھا امیر جامعہؔ
صدر بھارتؔ ہو کے بھی تو فردِ جامع ہی رہا

بعدِ آزادی سنبھالی تو نے اردو انجمنؔ
گرچہ آڑے آئے اس میں بھی سخن اندر سخن

تیرے ہی دم سے علی گڑھ میں ہوئی تجدیدِ عشق
صور بیداری وہ پھونکا ہو گئی تائیدِ عشق

منتظر تھے گاندھی و نہرو نصیحت کے لیے
تو امام الہندؒ کا ثانی تھا ملت کے لیے

برسوں پیچھے پھری تیرے وزارت کس طرح
تو نے ہر عہدے کو بخشی تھی طہارت کس طرح

تو گورنر اور نائب صدر بھی برسوں رہا
بال بیکا کر سکا منصب نہ کوئی بھی ترا

خود کو وقفِ شمعِ ملت مثلِ پروانہ کیا
اس لیے تجھ کو وطن نے صدر فرزانہ کیا

تو نے دل جیتے تھے ہندو اور مسلماں کے یوں
جیسے جادو گر کا ہو محفل کی محفل پر فسوں

دلّی میں تو نے پہلے خدمتِ غالبؔ جو کی
تیری ہستی تا دمِ آخر سدا غالب رہی

تو محمدؒ اور شوکتؒ کی نئی آواز تھا
اجملؒ و انصاریؒ و خواجہ کے دل کا ساز تھا

تجھ سے پہنچے کام کتنے پایۂ تکمیل کو
رہ گئی اردو بیچاری ہی فقط تذلیل کو

حیف محروم سبیلِ چشمِ ساقی رہ گئی
لحن میں اردو کے کیسی پھانس باقی رہ گئی

تو نے اپنی ذات سے پھر بھی یہ ثابت کر دیا
شعر قند پارسی تضمین جو میں نے کیا

''در کفِ جامِ شریعت در کفِ سندان عشق
پر ہوسنا کے نہ داند جام و سندان باختن''

○

قطعات

قطعہ (امریکہ میں)

تیرا احساں ہے جو بخشی دولت شعر و سخن
ہم وَلی اردو کے ٹھہرے انجمن در انجمن
آپ جل کر دوسروں کو روشنی دیتے رہے
زندگی ہم کو عطا کی مثل شمعِ انجمن

(یو این او پہلی اردو کانفرنس ۲۰۰۱ء میں صدارتی خطاب)

○

یو این او میں

سارے جہاں کو آج بشارت ہے دوستو!
اکیسویں صدی کے لیے نیویارک سے
اردو زبان آج سے آفاق کی ہوئی
بانگ لسان اٹھی ہے یہ ہند و پاک کی

○

یو این او ۲۰۰۱ء

۲۴ جون آج مورخ نے ثبت کی
چوکھٹ سے اس ہزارے کی دامانِ چاک سے
مقبول آج سے ہوئی عرش معلّٰی تلک
اٹھا خمیر اردو تھا دلّی کی خاک سے

○

یو این او میں

پیغام اہلِ شرق سنیں حاضرینِ بزم
اقوامِ متحدہ کے ادارے کے نام ہے
شیرینیِ شراب طہور کا ہے مزہ
اپنائیں اہلِ غرب یہ اردو کا جام ہے

یو این او امریکہ (نیویارک) میں

شہرۂ آفاق ہوئی آج زبانِ دہلی
عرش پر خوش ہیں سبھی خیر برانِ دہلی
میرؔ و غالبؔ کی زباں آج UNO پہنچی
سارے عالم میں ہیں خوش پیر و جوانِ دہلی

○

داغؔ و حالیؔ نے جسے حسن دوامی بخشا*
سائلؔ و بیخودؔ و کیفیؔ کا نشانِ دہلی
آج اردو کا جہاں میں ہوا اقبالؔ بلند
برہمنؔ اور یہ مومنؔ کی لسانِ دہلی

○

شیخ و پنڈتؔ ہی پہ موقوف نہیں ہمدم
کتنے بیدیؔ ہوئے عشاق شبانِ دہلی
آج امریکہ میں گلزارؔ یہ اعلان کرو
ذکر ہر دین ہوا حسن بیانِ دہلی
احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن بھی اترتا بہ زبانِ دہلی

○

یو این او امریکہ (نیویارک) میں

آئین تو ہم روز بدل سکتے ہیں
اخلاق میں ترمیم نہیں ہو سکتی
ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں
تہذیب کی تقسیم نہیں ہو سکتی

''قطعات''

تہذیب کی بیٹی ہے زبانِ اردو
کیوں تیغِ سیاست سے کرو اسکو دونیم
جمہوریت خاص کے دعوے دارو
عالم میں کہیں علم ہوا ہے تقسیم

○

پاکستانی نقادوں کے نام

تہذیب کو بے جان بنانے والو
نغمات کو ہذیان بنانے والو
اردو تو کُل اقوام کا سرمایہ ہے
اردو کو مسلمان بنانے والو

○

ہیں ہماری ذات سے وابستہ افسانے بہت
دیکھتے ہیں ہم کو حیرانی سے فرزانے بہت
آپ ہر بستی کو ویرانہ بناتے جایئے
ان کو بھی آباد رکھنے کو ہیں دیوانے بہت

○

صدیوں کے اتحاد کا زندہ نشان ہے
آزادی کا وسیلۂ ہندوستاں ہے
دلّی و لکھنؤ میں مقید نہیں ہے اب
مقبول سارے دہر میں اردو زباں ہے

○

دونوں کی رگ وپے میں خون اپنا ہی جاری ہے
اردو بھی ہماری ہے ہندی بھی ہماری ہے
اردو سے مگر غفلت کس واسطے ہے ہمدم
تہذیب کی ضامن یہ خسروؔ کی دلاری ہے

○

کرتے ہیں یوں تو اور بھی شانِ چمن کی بات
تہذیب حسن وادیٔ گنگ و جمن کی بات
گلزارؔ دہلوی کا یہ دعویٰ ہے مستند
اپنے سخن کی بات ہے اپنے سخن کی بات

○

اپنے تھوکے کو چاٹنا ہوگا
چاند سورج پہ تھوکنے والو
نورِ ایماں سے واسطہ تم کو
کذب سے بھی نہ چوکنے والو

○

ہو ساغر و مینا کا سجود اور رکوع
کرتا ہوں ابھی دورِ مئے ناب شروع
جھرمٹ میں حسینوں کے سویرا ہو جائے
ہوتا ہے میرے جام سے خورشید طلوع

○

پوچھے کوئی یہ روحِ ظفرؔ سے جو ذوق ہو
مومنؔ کہاں ہیں، میرؔ کہاں، برہمن کہاں
گلزارؔ آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے
دلّی میں اپنے بعد یہ لطفِ سخن کہاں

○

زار صاحب تھے والدِ بندہ
اور سائل تھے میرے اوّل پیر
زار اور سائل کے ہی توسط سے
میں ہوں نوابؔ میرزا کا نبیر
میں ہوں گلزارؔ داغؔ کا پوتا
اور اردو زبان میری جاگیر

○

''رباعیات''

درسِ اردو زباں دیتا ہوں
اہلِ ایماں پہ جان دیتا ہوں
میں عجب ہوں امام اردو کا
بت کدے میں اذاں دیتا ہوں

○

دلّی سے لکھنؤ سے سمیٹا ہے بانکپن
بیٹھا ہوں بزمِ شعر میں جوشؔ و جگرؔ کے ساتھ
کیفیؔ و زار و سائلؔ و بیخودؔ کے فیض سے
گزری ہے ساری عمر ہی اہلِ ہنر کے ساتھ

○

ادیان کے سنگم کا نشاں ہے اردو
یکجہتی عالم کی زباں ہے اردو
شائستہِ تہذیب جو مرکز تھا کبھی
اس دلّیِ مرحوم کی جاں ہے اردو

○

تہذیب کا ضامن ہے کلامِ اردو
خوش ظرف کا زیور بھی ہے جامِ اردو
سید ہو کہ مرزا ہو کہ افغان وشیوخ
تسلیم ہو پنڈت کا سلامِ اردو

○

مضموں ہے گہر فکر جواں ہے میری
کوثر میں دھلی طرز بیاں ہے میری
دلّی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اردو جسے کہتے ہیں زباں ہے میری

○

مٹتی ہوئی دلّی کا نشاں ہیں ہم لوگ
ڈھونڈو گے کوئی دن میں کہاں ہیں ہم لوگ
جلتی ہوئی شمعوں کے سحر کے آنسو
بجھتی ہوئی لکڑی کا دھواں ہیں ہم لوگ

○

دس پشت سے پالا ہے میرے آباء نے
اردو کی حسیں طرز و طرح ڈالی ہے
اردو کے بگڑتے ہوئے ماحول میں بھی
جو لفظ زباں پر ہے وہ ٹکسالی ہے

○

دے ہم کو بھی اللہ نویدِ اردو
جنت میں منایا کریں عیدِ اردو
جینا ہو زمانے میں تو غازی ہو کر
مر جائیں تو کہلائیں شہیدِ اردو

○

''رباعیات''

میرؔ و مرزاؔ ذوقؔ و مومنؔ نے جسے بخشی جلا
وہ زباں نواب مرزا داغؔ کی رکھتا ہوں میں
سات صدیوں سے جسے پالا عوام الناس نے
فخر ہے مجھ کو زبانِ خسروی رکھتا ہوں میں

○

تاریخ وطن حسنِ وفا ہے اردو
ہر ذرے پہ بھارت کے فدا ہے اردو
آزادی کی تحریک پہ ڈالو تو نظر
کھل جائے گا یہ راز کہ کیا ہے اردو

○

اردو کی نگہداشت کے خالد ہیں ہم
تاریخ میں تہذیب کی واحد ہیں ہم
آؤ ہمیں دیکھو نئے اردو زادوں
اردو کے مبلّغ ہیں مجاہد ہیں ہم

○

اردو پہ جو یورش ہے پڑے گی مہنگی
پیدا نئے ہر روز کے دکھڑے ہونگے
گر یونہی زبانوں کے کرو گے ٹکڑے
خاکم بدہن قوم کے ٹکڑے ہونگے

○

دنیا میں تو اونچا ہے کلامِ اردو
عقبیٰ میں بھی اونچا ہے نامِ اردو
جب حشر میں ہو نام شماری آقا
منظور کہ کہلاؤں غلامِ اردو

○

سن لیں گے حریفانِ زباں محشر میں
بخشا گیا عقبیٰ میں سبیلِ اردو
اے رندِ قیامت کے وکیلِ مطلق
میں دہر میں کہلاؤں وکیلِ اردو

○

الہام کہ القا ہو کہ آیاتِ جنوں
ہے رازِ مشیت کی سراسر غماز
ہوتے ہیں جہاں ختم جہاں کے سب علم
ہوتا ہے وہاں سے شاعری کا آغاز

○

یکجہتیٔ ملت کا نشاں لایا ہوں
کچھ حسنِ یقیں شانِ گماں لایا ہوں
داغؔ و حالیؔ سے ہے وابستہ گھرانہ میرا
میں قلعۂ دلّی کی زباں لایا ہوں

○

دلّی کی مشترکہ تہذیب وتاریخ

گلزار دہلوی

دلّی کی تاریخ اور مشترکہ تہذیب کا موضوع دراصل مکمل ہندوستان کی آٹھ سو برس کی قومی اتحاد و یکجہتی کی تاریخ ہے۔اس کی جڑیں صرف ایک قوم، ایک مذہب، ایک زبان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ یہ ہندوستان کی جملہ اقوام و مذاہب کی مشترکہ رواداری اور وضعداری کی تاریخ ہے، جس میں ادیان و مذاہب، عقائد ونظریات کی آمیزش، حسن سلوک، آپسی صبر وتحمل اور ایک دوسرے کے تہوار ورسوم اور تعمیر وتربیت میں، مشترکہ و متحد واقدامات کی تاریخ ہے۔

مسلمانوں کے دورِ حکمرانی یعنی قطب الدین ایبک سے لے کر شیر شاہ سوری، علاء الدین خلجی، حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء و حضرت خواجہ امیر خسرو اور شہنشاہ اکبر کی رواداریاں، بہادر شاہ ظفر کے ہندوستانی رسم ورواج، تہوار، میلہ اور اطوارِ تفریحات کے اشتراک تاریخ سے مربوط ہو کر ہی دلی کی مشترکہ تہذیب و تاریخ سامنے آتی ہے جو عالم انسانیت میں اتحاد کا سبق دیتی ہے۔یعنی ''عیسیٰ بہ دین عیسیٰ وموسیٰ بہ دین موسیٰ'' رہتے ہوئے، دور بہ دور، بدلتے حالات میں، ہندو مسلمان، عیسائی، بودھ، جین اور سکھ اور قبائیلی و دراوڑ تہذیب کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں جسے زبان کے اعتبار سے ''ہندی ہندوی، لشکری، ریختہ اور اردو کہا گیا'' ۔۔۔اسی زبان نے ہر رنگ اور شکل میں دلی کی موجودہ تاریخ وتہذیب کو مکمل کیا۔ لیجیے اب اس کی بنیادی کوششوں کی ابتدا سے کچھ جھلکیاں دیکھیں۔

حالانکہ ۹۰۰ برس سے پہلے بھی بیرونی ممالک سے مختلف مذہب، مختلف تاریخ، مختلف رنگ ونسل کے لوگ، مختلف شکلوں میں آتے رہے اور واپس جاتے رہے (اُن میں چند یہیں بس بھی گئے)۔

یونانی (سکندرِ اعظم کے دور سے) پرتگیزی، ولندیزی اور عرب وعجم او یورپ سے کئی شکلوں اور ارادوں سے حملہ آور یا سیّاح آتے رہے اور جاتے رہے۔ کچھ تو صرف مال وزر کی لوٹ کی نیت سے ہی آئے تھے جو واپس جاتے رہے۔

مگر شیر شاہ سوری نے پہلی مرتبہ یہاں کے مقامی سینکڑوں الگ الگ ریاستوں کے راجاؤں مہاراجاؤں اور حکام سے پہلے، مغربی ہندوستان کو مشرقی ہندوستان سے ملانے اور قریب کرنے کے لیے پشاور سے کلکتہ اور اس کے قرب و جوار تک پہلی مرتبہ ایک ''سڑک اعظم'' تعمیر کی اور اس کے شمال وجنوب میں ''لنک روڈ'' دائیں بائیں ریاستوں کے اندر تک اشترا کی سڑکیں بنوائیں۔اس سے پہلے ہر راجہ اور اس کی ریاست الگ ایک اکائی تھی۔اس کی فوج اس کی پولیس، اس کے سرکاری خزانہ (State Banks) الگ الگ آزاد اور خود مختار تھے۔ جن میں اتحاد بہت کم اور اختلاف زیادہ تھے اور ان میں سے اکثر وبیشتر ایک دوسرے کے حریف و رقیب تھے۔اسی وجہ سے جب سکندر اعظم نے حملہ کیا اور پورس کو شکست دیکر یہاں قبضہ کرنا چاہا تو اس وقت کی چند ریاستوں نے بھی پورس کا ساتھ نہ دیا۔(وہ تو خود پورس کی حکمت عملی، طرز گفتگو اور خود اعتمادی کے شاہانہ و باعزت جوابات سے متاثر ہو کر اور کچھ مال متاع لے کر واپس ہو گیا، جبکہ اس کے کچھ ساتھی یہیں آباد ہو گئے (جن کی مشترکہ شادیاں بھی ہونے لگیں)

اس کا ہندوستان پر ایک اثر ہوا کہ شیر شاہ سوری سے اتحاد و دوستی کا آغاز ہونے لگا اور کچھ مقامی ریاستوں کا میل جول اور تال میل بڑھتا چلا گیا۔

اسی طرح کی ایک تجارتی و اقتصادی، یکساں قانون سازی، خرید و فروخت کے تجارتی نرخ (Lirting rules caste profits of iruders) تاجروں، دوکانداروں اور زمینداروں و کاشتکاروں اور عام باشندوں اور خریداروں کی تسلی وتشفی کے لیے سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے عام شہریوں کے فائدے کے لیے سب کو حکم دیکر دوکانداروں کو Price Lists یعنی قیمت خرید اور اشیاء کی فہرست (List) دوکان پر باہر کی جانب لٹکانا ضروری قرار دے کر خرید وفروخت کے قوانین لاگو کیے تاکہ ''کالا بازاری'' نہ ہو سکے۔اس کام میں خلجی نے اپنے وزیر مالیات راجہ ٹوڈرمل سے مدد لے کر، Profit&Trade,Scale&Purchase کو قانوناً قابو میں کیا۔جو عام شہریوں کے لیے مژدۂ جاں بخش ثابت ہوا۔ان باتوں کا اطلاق، سبھی مذاہب واقوام اور سبھی فرقوں کے لیے یکساں لازم تھا۔جس سے قومی یکجہتی، قومی مشترکہ، باہمی حسن وسلوک وتہذیب، قومی مشترکہ بول چال کی زبانوں میں اشتراک، قدرتی طور پر بڑھتا گیا۔اس طرح تعمیرات، قلعہ مینار، آبشار، باغات، سڑکیں، تفریح گاہیں، بڑی عمارتیں، حویلیاں، چڑیا گھر، چرندوں، پرندوں اور بڑے جانور یعنی شیر، ہاتھی، اژدہے وغیرہ کے لیے مرکزی باغ الگ الگ چاردیواری اور جنگلوں سے آراستہ بنائے گئے۔جہاں ہر قوم، ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کے ملنے کا ایک اور ذریعہ قائم ہونے لگا اور مشترکہ تہذیب وتمدن، مشترکہ رواج اور آپسی تال میل اور تعلق خاطر بڑھتا گیا جو مشترکہ تاریخ وتہذیب کا مرکز بن گیا۔خصوصاً اوّل اوّل دلّی، آگرہ، بنارس، الٰہ آباد، لاہور، کشمیر، متھرا سے شروع ہو کر حیدر آباد دکن تک یہ طرز زندگی مقبول ہوتا گیا۔جنوبی ہند میں آریہ (ہندو۔ویدک سناتن دھرم کے علاوہ) کول (Cole)، منگول، ہون، شک اور دراوڑ، قبائل، کثیر تعداد میں آباد تھے۔شمالی ہند میں ایران سے فارس کے اثرات اور جنوبی ہند میں تجارت کی بدولت صدیوں سے عربی زبان کے اثرات کی قدرتی آمیزش ہوتی چلی گئی اس طرح سنسکرت، پراکرتیں، اپ بھرنش، سورسینی ماگدھی، میتھلی، اودھ، ہریانوی، بھوج پوری، زبانوں اور بولیوں میں اشتراک اور آمیزش بڑھتی چلی گئی جو خواجہ امیر خسرو تک ایک مشترکہ تہذیب اور مشترکہ زبان کی خالق اور محرک ٹھہری، جس کے سبب بول چال میں اجنبیت ختم ہوتی گئی اور دارالسلطنت صوبہ دلّی کی ہمہ گیر تہذیب وزبان سب طرف مقبول ہوتی گئی۔

ایک ہزار برس پہلے منوسمرتی (Manu Smiriti) میں چار طبقوں میں کارکردگی اور پیشوں میں تقسیم کر کے برہمن جو دین اور دنیا کے اسباق پڑھیں اور پڑھائیں (ii) کھتری ان کے سپرد حفاظت کے لیے فوج، پولیس، ذرائع آمدورفت اور راستوں کا کنٹرول اور قوم کی حفاظت قرار پائی۔ (iii) ویش (Vaish) طبقہ بنا کر ان کے سپرد تجارت، دکانداری (Economics) تفویض کی گئی (iv) شودر (Shudra) مزدور طبقہ (بڑھئی، درزی، راج مزدور، مہتر صفائی کرمچاری، لوہار، دھوبی، قصائی، سقّہ وغیرہ) مگر وقت کی بے حرمتی نے اس پیشہ ورانہ تقسیم (Distribution of work & duties) کو ذاتوں میں تبدیل کر دیا اور یہیں سے رفتہ رفتہ آگے چل کر چھوت چھات اور معاشرہ میں ایک طرح کی فرقہ بندیاں شروع ہوگئیں۔

البتہ ''ولی الہند'' خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اور ان کے بعد مسلسل خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی نے اور سب سے بڑھ چڑھ کر خواجہ راستین، زری زربخش، حضرت سلطان المشائخ خواجہ سید نظام الدین محبوب الٰہی نے اپنی درگاہوں، خانقاہوں اور آستانوں میں پھر سے یگانگت، اتحاد، بلاامتیاز مذہب وملت، ذات وفرقہ، پیشہ وکارکردگی کی تمام تفریقوں کو چھوڑ کر سب کے لیے روحانی مرکزوں کے دروازے کھول دیئے جہاں ایک ہی لنگر اور تبرک سے سب کا کھان پینا رواج پاتا گیا۔ اور اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے خدا، اللہ، بھگوان، ایشور کو یاد کرتے ہوئے آپسی بھائی چارہ بڑھتا گیا۔

مشترکہ تہذیب اور مشترکہ زبان اور قومی یکجہتی نے یہیں سے تقویت پائی۔ قومی رواداری کی دھلوی بنیاد پڑ گئی جو تمام ممالک میں چھا گئی۔ جس طرح شیر شاہ سوری نے مغرب سے مشرق کو ملا کو ہندوستان (بھارت ورش۔ آریہ ورت) کو ایک کرنے کا آغاز کیا، وہیں خواجگاں خانقاہ کے اقدام اتحاد کے بعد اکبر نے بین المذاہب، بین الادیان شادیوں کا آغاز کیا اور خود بھی راجپوتنی ہندو جودھا بائی سے شادی رچائی اور اس کے محل میں عبادت کے لیے مندر بنوایا۔ یہ ایک نیا آغاز تھا۔ اس سے پہلے خود راجپوتانے کے راجہ آپس میں رقیب، حریف اور ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جے پور، جودھپور، بیکانیر، قنوج، اجمیر وغیرہ سب ریاستوں میں آپس میں جنگ وجدل ہوتا رہتا تھا۔ اکبر نے سب کو ملوا کر ایک راجپوتانہ قائم کیا جسے اب راجستھان کہتے ہیں۔ اکبر کی راجدھانی چاہے آگرہ رہی مگر کورو، پانڈوں کے زمانے سے شاہجہان کے زمانے تک، راجدھانی (دارالخلافہ) کوئی ہو، مگر دلّی ہی دو ہزار برس سے ہر حکمران کا مرکز رہی، خواہ وہی ہیں کے راجہ ہوں یا بیرونی آنے والے بادشاہ یا حکمراں ہوں، جو دلّی تک پہنچا وہی عظیم ترین حاکم اور ہندوستان بھر کا مرکزی رہنمائے اعظم مانا جاتا رہا۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے دلّی، لاہور، کشمیر، آگرہ اور جگہ جگہ ساری رعیت اور عام شہریوں کے لیے باغ، آبشار، چشمے، باؤلیاں، بڑے بڑے حوض وغیرہ بنوائے جس میں سارے ملک کے لوگ لطف اٹھانے آتے جاتے رہتے اور سارے ملک میں ایسے تفریحی مرکز بنتے گئے جہاں ہر قوم ومذہب کے لوگ کھلے عام آتے جاتے اور ملنے جلنے لگے اور دلّی کی تہذیب وزبان ہمہ گیر بنتی گئی۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں اور دارالشکوہ نے (اکبر کی طرح) ابوالفضل، فیضی اور عبدالرحیم خان خاناں سے جس طرح ہندو مذہبی کتابوں اور گیتاؤں کا اردو، فارسی، عربی میں ترجمہ کرا کے غیر ممالک میں خصوصاً عرب وعجم کے مسلم ممالک میں ان مذہبی کتابوں میں بھیجا اسی طرح شاہ جہاں اور دارانے شاستر، اُپنشد، پران (متعدد) اور تینوں گیتاؤں کا اردو، فارسی، عربی میں ترجمہ کرا کے سارے مسلم ممالک میں بھیجا تا کہ ہندو، ویدانت میں توحید کی تعلیم وتبلیغ (''ایکو برہم، دوتیوں ناستی'' یعنی لا اللہ الا اللہ۔ خدا ایک ہے اور نرا کار ہے) کی ودیک اور قرآنی تعلیم وتبلیغ کو ساری دنیا سمجھ سکے۔ شریمد بھاگوت گیتا کو تو سب جانتے ہیں جو کرشن جی نے کروکشیتر میں جلوۂ ذات کی جھلک دکھاتے ہوئے آسمانی، الہامی آکاش وانی کو عوام تک پہنچایا۔ اس سے تو لاکھوں، کروڑوں آدمی ساری دنیا میں واقف ہیں۔ مگر بھاگوت گیتا کے علاوہ ''اودھوت گیتا جو روحانیت، مذہبیت اور اعتکاف سے متعلق ہے اُس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر بدقسمتی یہ ہے کہ چاروں وید اور ویدک دھرم کا خلاصہ اور بنیاد جو ''اشٹاوکر'' گیتا میں مہامنی اشٹاوکر جی نے بیان فرمائی ہے وہ ہے ''خدا۔ ایشور کی ذات کی وحدت وتوحید اور صرف توحید (جس میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں اُس سے کوئی واقف نہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں اور دارا شکوہ نے امیر خسرو کی طرح ہندوؤں کے مذہب کی اصل کو سمجھ کر ان ''دھارمک'' (مذہبی کتابوں) کتابوں کے تراجم ہندوستان سے باہر متعدد اسلامی ممالک میں بھیجے۔

شاہجہاں کی دلّی (لال قلعہ اور جامع مسجد کی دلّی) شاہجہاں آباد کو سارے ملک ہندوستان کی چار سو پانسو سے زیادہ آزاد اور خودمختار الگ الگ رقیب ریاستوں کو مرکز دلّی کا حصہ بنانے کے لیے اورنگ زیب نے شمال سے جنوب، کشمیر سے کالی کٹ اور کنیا کماری تک ملک کو جوڑنے کے لیے سڑکیں بنوائیں خود تین مرتبہ فوج کشی کر کے تین جنگیں لڑیں (اور وہیں جنوب میں جان دے کر) ہندوستان کو ایک کیا اور دلّی کی تہذیب اور زبان کو جنوب کا اٹوٹ حصہ بنانے میں عظیم مدد پہنچائی اور سارے ملک کی ایک مرکزی فوج، ایک مرکزی قسم کی پولیس، ایک مرکزی مشترکہ زبان اور ایک مرکزی دارالسلطنت (سارے ملک کی ایک راجدھانی دلّی) قائم کر کے قومی یکجہتی کو فروغ دیا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بنارس، الٰہ آباد، متھرا، بندرابن، گوکل اور جنوبی ہند تک میں خود مندر، مسجد پاس پاس بنوائے اور ان کے قیام وانتظام کے لیے یکساں اخراجات کے لیے برابر تعداد میں گاؤں اور اس کی آمدنیاں وقف کیں جسے انگریز عام ہندوستانیوں سے چھپانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس طرح شاہجہاں اور دارا اور اورنگ زیب نے نیا بڑا ایک مرکز ہندوستان اور ایک مرکزی راجدھانی ایک فوج، ایک خزانہ (جیسے ریزرو بینک و اسٹیٹ بینک) کا قیام کر کے چھوڑا، جیسے فورٹ ولیم کالج قائم کر کے لارڈ کلایو نے زمانے سے کلکتہ سے انگریزوں نے پھر یہیں سے ہندو اور مسلمان دو بڑے طاقتور

اور عظیم مذاہب واقوام کولڑانے اور (Devide & Rule) کی پالیسی کا آغاز کیا اور انگریزوں ہی نے اردو رسم الخط اور دیوناگری/ ہندی رسم الخط کو لے کر ہندو مسلمانوں کواوران کی زبان کوالگ الگ کرکے یہ کوشش کی کہ زبان اور مذہب، الگ الگ منقسم رہے (جو بعد کو رفتہ رفتہ ۱۹۳۷ء تک پہنچتے پہنچتے ''مسلم لیگ اور باقی جماعتوں میں، جس میں کانگریس نمایاں تھی، یہ نعرہ انگریز نے دیا ''ہندی، ہندو۔ ہندوستان'' اور ''مسلم اردو پاکستان''۔ یہ نعرہ اور انگریز کی تقسیم کی سیاست جو Lord Clive سے لے کر 1857ء (پہلی جنگ آزادی جسے انگریز نے غدر قرار دیا تھا) اور 1857 سے بے شمار ہندو مسلمانوں کی مشترکہ و متحدہ کوششوں سے وہ ریشمی رومال تحریک ہو، ہوم رول کی تحریک ہو، خلافت کی تحریک ہو، کانگریس جمعیۃ العلمائے ہند، احرار خدام خلق، خاکسار پارٹی، انقلابی سوشلسٹ پارٹی اور ہندو مہا سبھا تک نے ہندو اور مسلم اتحاد کو قائم کرکے تحریک و جہادِ آزادی کو مشترکہ طور پر جاری رکھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی ہی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن (دارالعلوم دیوبند) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کو اسیر مالٹا بتا کر کالا پانی ملک بدر کیا۔ مولانا حسرت موہانی کو قید کیا، مفتی اعظم اسلام، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی (جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کی روئداد کی کاروائی لکھتے تھے) بار بار جیل گئے، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی حضرات نے تلک، گوکھلے، سی آر داس، راناڈے، طیب جی، لالہ لاجپت رائے اور گاندھی، نہرو، آزاد اور خان عبد الغفار خان نے متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے سندھ میں، مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں، خان عبد الغفار خاں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں، کانگریس سے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کو جاری رکھا اور دلّی کو اپنی تمام مجاہدانہ کوششوں کا مرکز بنائے رکھا اور کسی بھی جہدِ آزادی کے لیے سیاسی اور قومی جلسہ میں اردو اور دلّی کو اپنا مرکز تسلیم کیا۔ یعنی خسرو سے آزادی (اور تقسیم ملک تک) دلّی کی زبان اور دلّی کی تہذیب اور دلّی کی مرکزیت کو سارے ملک نے ہمیشہ تسلیم کیا۔ (حتیٰ کہ محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مسلم لیگ کا بھی گھوم پھر کر دلّی اور اردو ہی کو اپنا نکتۂ جہاد بھی بنایا)

پنڈت برج نرائن چکبست نے لکھنؤ سے انگریزوں کو اردو میں للکارا اور کہا:

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

تو ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کہا:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اور

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
بھارت کے واسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

جوش ملیح آبادی نے کہا:

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

گلزار دہلوی (آپ کے خادم نے ۱۹۳۶ء میں دس برس کی عمر میں کہا تھا)

اگر زندہ ہے کچھ دن تو دنیا کو دکھا دونگا
کسے حُب وطن کہتے ہیں یہ سب کو سکھا دونگا
چمن جو قوم کا سوکھا پڑا ہے ایک مدت سے
اُسے اپنے لہو سے سینچ کر گلشن بنا دونگا

یعنی انگریز کے ہتھ کنڈوں کے باوجود زرزمین خطابات کی بارش کے باوجود ۱۹۳۷ء میں Seperagte Electrorate کے بعد انگریز حکما نے مسلم لیگ کو ایسا پٹایا کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دس برس میں ملک تقسیم ہوا مگر یہ تمام کاوشیں اور تحریکیں تقسیم اور تفریق کے باوجود نہ آج تک مشترکہ تہذیب وتمدن کو ختم کرسکیں نہ دلّی کی میر ومومن، ذوق وغالب، داغ وحالی، نسیم وچکبست، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ مدن ساحر (زائرِ غالب)، تربھون ناتھ زتشی، زار دہلوی، یادگارِ داغ (جنہوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی دلّی یونیورسٹی اور اندر پرستھ کالج (برائے خواتین) میں ۳۹ سال اردو، فارسی اور عربی پڑھایا اور ۹۲ برس کی عمر تک پڑھاتے رہے (علامہ پنڈت زار دہلوی میرے والد تھے)، پنڈت آنند نرائن مُلّا، حضرات کی مشترکہ تہذیب کا ورثہ اردو زبان کو اور دلّی کی تہذیب وثقافت، قومی یکجہتی کی مرکزیت اور ہندوستان پوری تاریخ وتہذیب کو آج تک کوئی دلّی کی تاریخ سے جدا نہیں کرسکا۔

جتنے اردو پر آج بھی (تقسیم ملک کے بعد بالعموم اور ۱۹۹۰ء کے بعد آج تک بالخصوص، فرقہ پرست، متعصب تنگ نظر، مخالفین کی کوشش وسازش کے باوجود، آج اردو اور دلّی کی تہذیب وزبان نہ صرف ہندوستان (پاکستان میں) بلکہ بے شمار غیر ممالک میں اردو کی مقبولیت، تعلیم اور مشاعروں کی نہ صرف ختم نہ کر پائے بلکہ آج ہندو پاک سے باہر ۱۴۴ یونیورسٹیوں میں سارے عرب وعجم خلیجی ممالک یورپ کے ۲۵ ممالک انگلستان اور امریکہ کی ۱۸۔ ریاستوں میں اردو کی تعلیم، تقاریب، اخبارات ورسائل، اردو کانفرنس، سیمینار اور مشاعرے۔ ۶۲ ملکوں میں ۱۹۹۵ء سے جاری ہیں اور سالانہ بین الاقوامی Universal & International۔ اردو کی پذیرائی جاری ہے۔

۲۰۰۰ء اقوام متحدہ، نیویارک ہال میں اردو واشنگٹن میں بین الاقوامی اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کے دو سیشن (اجلاس) کی میں نے صدارت کی، جس میں ۳۵۔ ممالک کے اہل قلم، دانشور، سفیر اور اردو کے عشاق شریک ہوئے۔

الغرض یہ کہ دلّی اور اردو کی مشترکہ تہذیب وتاریخ جو ہندوستان کا دل بن چکی ہے آج بین الاقوامی زندہ حقیقت کی شکل میں ضوفشاں ہے۔

''نغمۂ محمدی''

جان وولف گانگ فان گوئٹے

انگلش ترجمہ: ایملی ایزسٹ

اردو ترجمہ: ڈاکٹر شان الحق حقی

وہ پاکیزہ چشمہ
جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اترا
سحابوں سے اوپر آسمانوں پہ جولاں ملائک کی چشمِ نگہداشت کے سائے سائے
چٹانوں کی آغوش میں عہد برنائی تک جوئے جولاں بنا
چٹانوں سے نیچے اترتے اترتے
وہ کتنے ہی صد رنگ اَن گھڑ خزف ریزے
آغوشِ شفقت میں اپنی سمیٹے
بہت سے سسکتے ہوئے رینگتے، سُست کم مایہ سوتوں کو چونکاتا، للکارتا
ساتھ لیتا ہوا خوش خراماں چلا
بے نمو وادیاں لہلہانے لگیں
پھول ہی پھول چاروں طرف کھل اٹھے
جس طرف اُس ﷺ کا رخ پھر گیا
اُس ﷺ کے فیضِ قدم سے بہار آ گئی
یہ چٹانوں کے پہلو کی چھوٹی سی وادی ہی کچھ
اُس ﷺ کی منزل نہ تھی
وہ تو بڑھتا گیا
کوئی وادی، کوئی دشت، کوئی چمن، گلستاں، مرغزار
اُس ﷺ کے پائے رواں کو نہ ٹھہرا سکا
اُس ﷺ کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے
خشک نہریں بھی تھیں، اُترے دریا بھی تھے۔
سیلِ جاں بخش کے، اُس ﷺ کے سب منتظر
جوق در جوق پاس اُس ﷺ کے آنے لگے
شور آمد کا اُس ﷺ کی اٹھانے لگے

Behold this rocky spring,
bright with joy
like a twinkling star;
above the clouds
its youth was nourished
by good spirits
among the cliffs in the bushes.
Fresh as a youth
it dances out of the cloud
down to the marble rocks,
cheering again
to the sky.
Along mountainous paths
it chases after colorful pebbles,
and with the step of a young leader
its companion-springs journey
with it onward.
Below in the valley
flowers appear from its footprints,
and the meadow
derives life from its breath.
But no shaded valley can stop it,
no flower,
clasping its knees
and imploring it with loving eyes:
toward the Plains it presses its course,
twisting like a snake.
Brooks nuzzle up
sociably. Now it treads
into the Plain, resplendent with silver,
and the Plain grows silver too,

راہبر ﷺ ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تھیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں
ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں اِن زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں پاک کر دے ہمیں
آ۔ ہم آغوش افلاک کر دے ہمیں
وہ رواں ہے، رواں ہے، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اُس کے اک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے شہر جاتے رہے
اُس ﷺ کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے
اُس ﷺ کے ہر موڑ پر ایک دنیا نئی
ہر قدم پر طلوع ایک فردا نئی
قصر ابھرا کیے خواب ہوتے گئے
کتنے منظر تہہِ آب ہوتے گئے
شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں
عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں
اُس ﷺ کی رحمت کا دھارا ہے اب بھی رواں
از زمیں تا فلک
از فلک تا زمیں
از ازل تا ابد جاوداں، بیکراں
دشت و در، گلشن و گل سے بے واسطہ
فیض یاب اس سے کل
اور خود کل سے بے واسطہ

(بصد شکریہ: جناب عقیل عباس جعفری)

and the rivers of the Plain
and the brooks of the mountains
cheer and shout: "Brother!
Brother, take your brothers with,
take them with you to your ancient father,
to the eternal ocean,
whose outstretched arms
await us,
who, ah! has opened them in vain
to embrace his yearning children;
for the bleak wasteland's
greedy sand devours us; the sun above
sucks up all our blood; a hill
clogs us into a pool! Brother,
take your brothers from this Plain,
take your brothers from the mountains,
take them with you to your ancient father!
Come all of you! -
and now [the spring] swells
more grandly: an entire race
lifts the prince up high!
And in rolling triumph
it gives names to the lands and cities
that grow in its path.
Irresistibly it rushes onward,
leaving a wake of flaming-tipped towers
and houses of marble - creations
of its bounty.
Like Atlas it bears cedar houses
upon its giant's shoulders;
over its head, the wind noisily
blows a thousand flags
as testimony of its glory.
And so it brings its brothers,
its treasures, its children,
effervescent with joy,
to the waiting parent's bosom.

شبِ ہراس

حسن منظر
(کراچی)

کیا عجیب دور تھا جب ریٹائرڈ ہائی اسکول ٹیچر عبدالحمید انصاری اور ان کی بیوی بڑھاپے میں ہمیشہ سے بڑھ کر ایک دوسرے کی زندگی کا جزو تو بن گئے تھے لیکن ایک دوسرے سے دل کی بات چھپانے لگے تھے، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ جانتے تھے کسے کس وقت کیا تکلیف ہے، کیا چاہیے ہے، لیکن اندر کا کیا حال ہے، وہاں کیا ہو رہا ہے اسے منھ سے نہ پھوٹنے کی جیسے دونوں نے قسم کھا رکھی تھی۔

جاڑوں کی رات تھی ہلکی پھوار پڑی تھی اور امکان تھا پھر پڑے گی۔ ایک دھماکے کے بعد جس کے لیے محاورہ تھا ''ٹرانسفارمر اُڑ گیا'' بجلی چلی گئی تھی اور امید نہیں تھی کہ جلد پھر آئے گی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور ہر طرف خاموشی۔

نزہت برابر کے کمرے میں اتنی غافل سو رہی تھیں کہ بیچ کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود اگر ضرورت پڑ جاتی تو جگانے کے لیے انصاری صاحب کو لگاتار تین چار آوازیں دینی پڑتیں یا خود اٹھ کر آتے۔ اور ضرورت کیا؟ بس یہی نا کہ باورچی خانے میں سے برتنوں کے گرنے کی آواز آئی ہے کہیں بلّی تو اندر نہیں گھس گئی؟

بلی کیا چور تو نہیں دیوار پھاند کر اندر آ گیا ہے، کہنے پر بھی نزہت کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا نہ ہوتے کیونکہ اگر ڈاکو بھی اندر گھس آئے تو دونوں کیا کر سکتے تھے؟ باوجود بیٹا بیٹی اور بہی خواہوں کے کہنے کے کہ گھر میں ہمیشہ کوئی ہتھیار رہونا چاہیے دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا ایسا کرنا خطرے کو بڑھانا ہوگا اور نقصان علیحدہ۔ ڈاکو کی پہلی نظر اس ہتھیار پر جائے گی۔

کسی نہ کسی طرح دونوں نے وقت یعنی زمانے کو تسلیم کر لیا تھا۔ سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ بیٹا بیٹی کسی حادثے کی تعلیم کی راہیں طے کر کے اس شہر کیا، اس ملک سے باہر جا چکے تھے اور خوش تھے۔ انصاری صاحب کی بہنیں البتہ فکر مند رہتی تھیں کیونکہ ان کے شوہر اور داماد ڈیوٹی پر جاتے تھے اور بچے، بچیاں اسکول، کوچ۔ لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ سب عورتوں کے شوہر اور بچے گھر سے نکلتے تھے بلکہ بہت سے گھروں کی عورتیں تک۔ جب ہر قسم کے حادثے اور جرم سے مڈبھیڑ، ہر ایک کی ہر جگہ ہو سکتی تھی تو اس کا رونا کیا؟ واردات کے بعد تھانے جا کر رپورٹ لکھوانے کی لوگوں کی عادت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

عام مجرم سمجھتا تھا وہ جرم کر رہا ہے اس لیے اس کی جرأت کے پیچھے خوف چھپا ہوتا تھا۔ اعلیٰ نصب اور با اقتدار گھرانے کا فرد جس نے اس پیشے کو اپنا لیا ہو بیچ دن کے یہی کام شاہراہ پر یا مین دروازے سے گھر یا آفس میں داخل ہو کر کرتا اور بعد میں پوچھے جانے پر اپنی مونچھ کو اَمیٹھ کر کہتا ''اس کے لیے ہمت چاہیے پیشۂ مرداں مددِ خدا۔''

جن کی بیٹیاں چھوٹی تھیں یا جوان، وہ ماں باپ جب تک بیٹی گھر لوٹ کر نہ آ جائے وسوسے میں رہتے تھے پر کیا کر سکتے تھے؟ دنیا ایسے دَور میں نکل آئی تھی جب بچیوں اور عورتوں کو اکیلے گھر سے نکلنا اُس تھوڑے ہی دنوں کے پرندے کی طرح ضروری ہو گیا تھا جسے وقت آنے پر ماں باپ دھکیل کر گھونسلے سے باہر نکال دیتے ہیں۔ چاہے اسے پوری طرح اڑنا آیا نہ آیا ہو۔ باہر چیل، کوے بھی ہوتے ہیں اور جھاڑیوں میں چھپی بلیاں اور نیولے بھی۔ پر کیا کیا جائے۔ خطرہ مول لئے بغیر زندگی کیسے آگے چل سکتی ہے! یہ مشکلیں سمجھ لینے کی تھیں اور جس کی سمجھ میں آ گئیں وہ گرمی میں پنکھا، بے پنکھا اطمینان سے سوتا تھا اور جاڑے میں بجھی ہوئی آگ کے پاس گدڑی میں بغیر کسی کا گلہ کیے۔

تو حمید صاحب لیمپ جلائے اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے ایک فرانسیسی ناول پڑھ رہے تھے۔ انگریزی میں۔ پیر اُن کے بستر پر تھے۔ آدھی رات تک نیند ان کی آنکھوں سے دُور رہتی تھی جو اتنی عمر کو پہنچنے کا تاوان تھا جو وہ سالوں سے بھگتا رہے تھے۔ اس حقیقت کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ چھوٹے پوتا پوتی اگر گھر میں ہوتے تو ممکن ہے یہ تکلیف اتنی نہ کھلتی۔ انہیں کہانی سناتے سناتے خود بھی جھپکی لے لیا کرتے۔ لیکن اس عمر کے بچے دور تھے اور نیند بھی اتنی ہی دور۔

یہ کوئی نہیں جانتا ایسی راتوں اور تنہائی کے لیے ہی وزنی ناول تخلیق میں آتے ہیں۔ ان کے لکھنے والے خود بھی نہیں۔ مختصر کہانیاں جنہیں افسانے کہا جاتا ہے انہیں سفر اور وقتی شدید اکتاہٹ (عام بولی میں بوریت) جنم دیتی ہے۔ جتنی ایجادات ہوئی ہیں ان کے پیچھے انسان کی وقت کی ضرورت کارفرما تھی۔ اس اصول سے فکشن کیوں کر مبرّا ہو سکتی تھی! رہا تحقیقی اور تنقیدی ادب اس کا پڑھنا اس نوعیت کی چیز ہے جس کے لیے کہا گیا ہے ''اور دن ہم نے کام کے لیے بنایا ہے، لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے۔''

سو جس وقت سونے والی دنیا سو رہی تھی حمید صاحب اس عالمی ادب کے شاہکار بھاری ناول سے نیند لانے والی گولی کا کام لے رہے تھے۔ اُن کے پرانے شاگردوں میں سے دو ایک جو بڑھاپے میں اُن کا خیال رکھ رہے تھے جہاں اُن کے دس کام کرتے تھے ان میں سے ایک لائبریریوں، گھروں اور فٹ پاتھ بکس سیلرز سے کتابیں لا لا کر دینا بھی تھا۔ فیلڈنگ، اسکوٹ، تھیکرے ڈکنز، ایلیٹ، ہارڈی کو حمید صاحب نمٹا چکے تھے بعض کو دوبارہ منگوا کر، پھر روسی ادب کی باری آئی اور اس وقت جب بجلی گئی ہوئی تھی، ماسٹرنی صاحبہ سو رہی تھیں وہ اس فرانسیسی ناول میں غرق تھے۔ بی نزہت کا تعلیم کی دنیا سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن گھر کے آس پاس وہ اسی نام سے پہچانی جاتی تھیں۔

بڑے میاں اس ناول کی ساری تفصیل کو دلچسپی سے پڑھ رہے تھے پوری چوکسی کے ساتھ۔ وہ ان پڑھنے والوں میں سے تھے جنہیں پیدائشی پڑھنے کے شوقین کہا جاتا ہے۔ جو بھی مل جائے پڑھتے ہیں۔ کبھی گہری توجہ سے ٹھہر ٹھہر کر، کبھی

''چہارسُو''

کسی اچھے جملے یا سچوئیشن (موقع) کا لطف لینے کے لیے اُسے دوبارہ پڑھتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کتاب یا رسالے کو پڑھ کر ایسے ختم کر دیتے ہیں جیسے ٹرین کے ڈبے میں بیٹھے کسی اجنبی کی بات سُن رہے تھے۔ اس کے کاروبار کے چوپٹ ہوجانے کی، رشتے داروں کی بے مروتی کی یا بیماری کی تفصیل جو اسٹیشن کے آجانے پر، چاہے ادھوری ہو، سنانے والا یا سننے والا، اچھا بھائی رخصت کہہ کر پلیٹ فورم پر اتر جاتا ہے۔ پھر بھی یہ اضافہ کرنا مناسب ہوگا کہ کتاب جو بھی ہو حمید صاحب کا اس سے تعلق بس اتنا ہی ہوتا تھا کہ بعد میں اگر کوئی اس کا ذکر کر بیٹھے اور کہے بڑی اچھی کتاب ہے تو وہ کہتے ''جی ہاں میں نے پڑھی ہے'' اور اس گفتگو کو آدھے میں چھوڑ کر مسافر کی طرح پلیٹ فورم پر اتر جاتے۔ ان کا اسٹیشن انہی چھ لفظوں پر آجاتا تھا۔

ناول ایسا تھا جو سُست رفتاری سے چلتے چلتے کہیں کہیں اچانک دلچسپ ہوجاتا تھا۔

کرسمس کا دن تھا، دوپہر ایک آدمی جیسے بہت دیر چلنے کے بعد رات کو ٹھہرنے کے لیے سرائے ڈھونڈ رہا تھا، معمولی قسم کے گھروں کے کم آباد علاقے میں۔ ہیئت سے افلاس زدہ لگتا تھا لیکن کپڑے صاف ستھرے تھے۔ سر پر گول بہت پرانا ہیٹ تھا لیکن برش کیا ہوا۔ اوورکوٹ ضرورت سے زیادہ لمبا تھا، اندر واسکٹ تھی، پتلون کا رنگ گھٹنوں پر سے اڑ گیا تھا۔ پاپوش کچھ پھیلے ہوئے سے تھے جیسے بہت عرصہ پہنے جانے پر ہوجاتے ہیں۔ لگتا تھا کہیں باہر سے آیا ہوا ہے، شریف گھرانے کا ہے، بال سفید، تھکا ماندہ، ہونٹ خشک۔ ساٹھ کا ہوگا لیکن چہرے سے ٹپکتا تھا زندگی سے ہار ماننے ہے۔ اس کے الٹے ہاتھ میں ایک پٹلیا تھی اور سیدھے میں چھڑی جسے ڈنڈا کہنا زیادہ مناسب ہوگا اس پر وہ جھک کر چل رہا تھا۔

کچھ میرا سا حلیہ ہے، حمید صاحب نے دل میں کہا۔

یہ وہ وقت تھا جب شام کو شہنشاہ لوئس ہشتم کی سواری وہاں سے نکلتی تھی اور اس کے آگے آگے گھڑسوار۔ چند آدمی جو سڑک کے اس ویران حصے میں تھے سواری سے بچنے کے لیے ایک طرف کو دبک گئے۔ دو آدمیوں میں دبی زبان میں کچھ بات ہوئی اور ایک نے کہا ''اچھا تو یہ ہیں گورمنٹ!'' نوارد نے بھی اس جملے کو سُنا (حمید صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی)۔

برابر کے کمرے سے کروٹ بدلنے کی آواز آئی جس میں ہمیشہ ہلکی کراہٹ کی آمیزش ہوتی تھی۔ یعنی اتنی نہیں تھی کہ حمید صاحب اٹھ کر جائیں اور پوچھیں ''بیگم کیا ہوا؟'' اطمینان ہوجانے پر انہوں نے پڑھنا جاری رکھا۔ ویسے بھی نیند آنے کا رستہ بھول چکی تھی۔

لیکن یہ شخص اس علاقے میں انجانا تھا اور اُسے بھی نہیں معلوم تھا کہ یہی وقت ہے ''گورمنٹ'' کے ہوا خوری کے لیے وہاں سے گزرنے کا۔

اگر نزہت بی جاگ گئی ہوتیں تو حمید صاحب ''کیوں بیگم کیا ہوا؟'' کہنے کے بعد انہیں گورمنٹ کے ہوا خوری کے لیے نکلنے والا جملہ ضرور سناتے۔ وہ سن کر دل رکھنے کو مسکراتیں اور کروٹ کو مکمل کر لیتیں۔ انہوں نے شادی کے بعد ایم۔اے ادب میں کیا تھا شوہر کی طرح کسی ادق مضمون میں نہیں اور کسی زمانے میں شعروشاعری میں دلچسپی لیتی تھیں لیکن اب نہیں۔

ناول میں سرائے کا مالک جس کی رنگت زرد تھی، بدن دبلا استخوانی دوسروں کے لیے چاہے جیسا بھی ہو اپنے یہاں جوان کام کرنے والیوں پر کبھی ناک بھوں نہیں چڑھاتا تھا۔ بیوی اسی لیے ایسی لڑکیاں سرائے میں کام کے لیے نہیں رکھتی تھی۔ وہ بھی غصہ ور تھی۔ مصنف مالکن کے لیے ہتھنی کا لفظ استعمال کر رہا تھا اور وہ بھی ایسی جس کی ٹھوڑی پر رُواں نہیں داڑھی تھی۔ اُسے اگر محبت تھی تو بس اپنے بچوں سے اور ڈرتی اگر دنیا میں کسی سے تو اپنے مرد سے۔

سرائے کے اسی گھرانے میں ایک اور بچی کا ذکر بھی آ رہا تھا۔ بن ماں باپ کی بچی جس کی زندگی ان دو خونخوار مالکان سرائے کے درمیان ایسی تھی جیسے دو پاٹوں کے بیچ آ گئی ہو۔

یہ تشبیہ فرانسیسی فکشن نگار کی دی ہوئی نہیں تھی، خود حمید صاحب کے دماغ کی پیداوار تھی۔

اس گھر میں کوسیت (Koh-Zett, Cosette) اس چھوٹی سی جان پر کونسا ستم تھا جو نہیں ڈھایا جاتا تھا۔ جاڑوں تک میں ننگے پیر رہتی تھی اور جسم پر بھی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہوتے تھے جو سردی اور بارش سے کچھ تو بچا سکتے۔ دن بھر سرائے میں تگنی کا ناچ ناچتی تھی۔ کبھی اوپر کبھی نیچے، فرش دھونا، پوچا لگانا، جھاڑو بہارو، پانی بھرنا، سانس پھولی ہوئی، دبلی پتلی لیکن کام کے پیچھے لگی ہوئی۔ وہ سرائے تھی یا لکڑی کا جالا جس میں وہ بھنگے کی طرح پھنسی ہوئی تھی اور وہ دونوں اس جالے کو بُننے والے تھے۔

کوسیت آٹھ سال کی تھی۔ اُس دن مالکن کے ایک گھونسے سے اس کا ایک پپوٹا سوجھا ہوا تھا اور اس کے لیے وہ مارنے والی بار بار کہتی تھی ''کتنی بدصورت لگ رہی ہے''

اس رات سرائے میں چار نئے مہمان آئے تھے۔ ان مہمانوں کے کمروں کی بالٹیوں اور نلکوں Wash Basini میں پانی بھرنا تھا۔ شام جا رہی تھی اور کوسیت ڈر رہی تھی کہ ٹنکی میں بھی پانی نہیں ہے۔ ہتھنی نے اسٹوو پر کھولتی وہی دیگچی کا ڈھکن اٹھایا، جو پک رہا تھا اس کا چمچے میں لے کر معائنہ کیا گلاس لے کر ٹنکی تک گئی اور ٹونٹی کھولی۔ بچی اس کی ایک ایک حرکت کو میز کے پیچھے چھپی دیکھ رہی تھی اور ڈر رہی تھی۔

نل سے پتلی سی دھار نکلی جس سے بس آدھا گلاس بھرا۔

حمید صاحب کے دماغ نے کہا ''ماری گئی بے چاری''

بچی کا سانس رکا ہوا تھا۔ ادھر سرائے میں آئے ہوئے شرابی کھڑکی سے باہر دیکھتے اور کہتے ''گھپ اندھیرا ہے''

اس سے پہلے جب کوسیت مالکن کی نظروں سے بچنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی ایک مسافر نے اس سے کہا تھا ''میرے گھوڑے کو پانی نہیں دیا!''

''چہارسُو''

بچی نے کہا تھا: ''نہیں بالٹی بھر پانی دیا تھا اور اس نے پیا بھی تھا۔''
اس نے زہر بھری آواز سے کہا تھا ''جھوٹی چھوکری''
''میں اس کے پاس کھڑی رہی تھی۔''
''خاموش۔ جا اور اُسے پانی دے'' اس نے ڈانٹ کر کہا۔
تب وہ میز کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ ساتھ ہی مالکن نے اُسے پکارا
''جا رہی ہے یا نہیں۔''
کوسیت نے کہا ''ٹنکی میں پانی نہیں ہے۔''
ہتھنی نے دروازہ پاٹوں پاٹ کھولا اور کہا ''جا اور جا کر پانی لا''
بچی نے بالٹی اٹھائی جو اتنی بڑی تھی کہ اس میں وہ خود سما سکتی تھی۔
مالکن نے سختی سے کہا ''ابھی جا، چشمے سے لے کر آ۔۔۔ وہاں ہوگا''
ساتھ ہی اُسے کچھ سکے دیتے ہوئے کہا ''اور لوٹتے ہوئے بیکری سے روٹی لیتی آئیو۔''
کوسیت نے سکّے اپنی بوسیدہ فراک کی جیب میں ڈال لیے۔
باہر اندھیرا تھا اور سناٹا۔ وہ کچھ دیر مجسمے کی مانند کھڑی رہی۔ مالکن کی ڈانٹ پھر پڑی اور خطرے کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ باہر نکلی اور کھڑی ہو کر کچھ دور کی سجاوٹ کی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ شاید کرسمس کی تیاری کی دکانوں میں روشنیاں تھی۔
پیچھے سے مالکن کی آواز آئی ''جاتی ہے یا نہیں''
پچھلے صفحوں کو الٹ پلٹ کر انصاری صاحب نے پھر پڑھا ''تقریباً کوسیت ہی کی عمر کی ہتھنی کی دو بچیاں بھی تو تھیں۔ ان سے پانی نہ منگواتی لیکن ان میں سے بڑی کو وہ کوسیت کے ساتھ بھیج تو سکتی تھی۔ وہ دونوں سارے دن کیا کرتی تھیں؟ کچھ نہیں۔ اُن کے پاس آنکھوں کو لبھانے والی گڑیاں تھیں، ان سے کھیلنے کے سوا اور کیا کرتی تھیں۔ کوسیت کو ساتھ کھلاتی تک نہیں تھیں۔ نہ اُسے گڑیوں کو چھونے دیتی تھیں۔
انصاری صاحب کے دل میں ان دونوں کے لیے نفرت کا پودا بڑا ہوتا جا رہا تھا۔
''اور کوسیت کے پاس کیا تھا؟ ایک انگلی جتنی جست کی تلوار۔ لڑکی اور کھیل کے لیے تلوار! وہ خود نہیں کہہ سکتی تھیں'' اماں کوسیت رات کو گھر سے باہر جاتے ڈر رہی ہے۔ ہم اس کے ساتھ چلی جائیں''
کوسیت ان قابل نفرت ہستیوں کے درمیان چل رہی تھی۔
پانی کا چشمہ جنگل میں تھا۔ بچی اکیلے پن کے احساس کو دور کرنے کے لیے بالٹی کے ہینڈل کو بجاتی جا رہی تھی۔ قصبے کے آس پاس کے رستوں پر کوئی راہگیر نہیں تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور گھر بھی دور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک عورت اُسے اندھیرے میں جاتی دیکھ کر چونکی اور بولی ''کوئی پری ہے یا کیا!'' پھر پہچان کر آگے بڑھ گئی کہ ''کوسیت ہے'' یعنی ''چھوٹی سی چیز'' جو نام قصبے والوں نے اُسے دے رکھا تھا۔
جہاں تک ویرانے میں گھر تھے اور ان کے بیچ میں راستے اُسے کچھ حوصلہ تھا۔ جہاں پہنچ کر کسی موم بتی کا روشنی کا نظر آنا بھی معدوم ہو گیا اس نے بالٹی ہاتھ سے رکھ دی اور سر کھجانے لگی۔ اب آگے اصل جنگل تھا جس میں خونخوار جانور بھی ہو سکتے تھے اور بھوت بھی۔ پھر اسے جانوروں کی چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔
تھوڑی دیر میں ہمت بندھی تو اس نے بالٹی اٹھالی اور گھر (یا وہ جو کچھ بھی تھا) لوٹنے کا ارادہ کیا کہ جا کر ڈیڑھ میل ہتھنی سے کہہ دے چشمے میں پانی نہیں تھا۔ لیکن مالکن کا خوف عود کر آیا۔ اس نے پھر چلنا شروع کیا اور بھاگ کر قصبے کی حد سے باہر نکل گئی۔ اسے راستہ یاد تھا۔ دن میں مشکل سے آٹھ منٹ کا۔ اب وہ دونوں طرف دیکھنے سے آنکھیں چُرا رہی تھی کہ جھاڑیوں پیڑوں میں کوئی نظر نہ آ جائے۔
بے چاری بچی، حمید صاحب کا دماغ بڑبڑایا۔
یہاں تک کہ وہ چشمے پر پہنچ گئی۔ جہاں سے پانی لینا تھا وہاں زمین میں سے آ کر پانی نے ایک قدرتی تلیا بنالی تھی۔ دو فٹ گہری اور اس سے نکل کر پانی چشمے کی صورت میں نیچے گرتا تھا۔ تلیا کے آس پاس کائی لگی تھی اور گھاس۔ وہاں تک راستہ سارا پہنچانا ہوا تھا اور دن میں کوسیت اس کے کتنے ہی چکر لگاتی تھی۔
اس نے پاس ہی کے ایک پیڑ کے گدّے کا سہارا لیا، لچی اور ٹہنی سے لٹک کر بالٹی کو پانی میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی سکّے بھی جیب سے نکل کر پانی میں گر گئے اور اُسے خبر بھی نہیں ہوئی۔
اب اسے سکے گنوا آنے پر مار پڑے گی۔ انصاری صاحب کا دل مَلنے لگا۔
تلیا سے بالٹی نکال کر تھک کر وہ گھاس پر پڑ گئی جیسے بے جان ہو، سر پر سیاہ بادل تھے، پیڑ اور اندھیرا۔
اب اُسے ایک بڑا خوف یہ ستا رہا تھا شاید کل رات پھر یہاں آنا پڑے۔ خوف بڑھتا اور سہم ہو جاتا تھا۔
بالٹی بھری ہوئی تھی اور بھاری۔ اُسے اٹھانے سے انگلیاں برف سی یخ ہو جاتی تھیں۔ اُسے رکھ دیتی، پھر اٹھاتی اور چلتی، بوجھ کے مارے جھکی ہوئی۔
سُن انگلیوں کو منہ پر رکھ کر گرم کرتے ہوئے وہ سسکیاں لے رہی تھی لیکن رو نہیں سکی۔ مالکن کا خوف اندھیرے، تنہائی، تھکن اور سردی کی تکلیف پر بھاری تھا۔
وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی ''ایسے تو گھٹنے لگ جائیں گے اور وہ بری طرح مارے گی۔'' کچھ دیر ایک درخت کا سہارا لے کر اس نے پھر چلنا شروع کیا لیکن اب روتے ہوئے۔
پھر ایک دم جیسے بالٹی کا وزن ختم ہو گیا۔ ایک بہت بڑے ہاتھ نے بالٹی کو تھام لیا۔
لمحے بھر کو انصاری صاحب کو لگا ان کا سانس رک گیا۔
لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا ایک لمبا بڑی عمر کا آدمی تھا جس نے پیچھے سے آ کر ایک طرح سے بالٹی اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔
''اب یہ لڑکی کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھے گا'' حمید صاحب کے دماغ نے کہا۔

''چہارسُو''

کوسیت نے اس آدمی کے پیچھے سے آنے کو نہیں سنا تھا۔ اب وہ اس کے برابر میں تھا اور ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

انصاری صاحب کو لگ رہا تھا دل کی دھڑکن رکی ہوئی ہے اور انہیں ہر طرف سناٹا سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اکیلے ہیں اور برابر کے کمرے میں نزہت بی بھی نہیں ہیں۔

کنگالوں جیسے لباس میں اس کے الٹے ہاتھ میں پوٹلیا تھی اور سیدھے میں لکڑی اور تھا اجنبی جسے کوسیت نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''آخر وہ کیا چاہتا تھا؟'' کچھ ہونے والا ہے، یہ الفاظ مصنف کے لکھے ہوئے نہیں تھے لیکن لگتا تھا اجنبی مرد کے اندھیرے اور تنہائی میں آ کر اس لڑکی کے ہاتھ میں تھامی بالٹی کو تھام لینے کے الفاظ کے درمیان اپنی جگہ بنائے بیٹھے تھے۔

وہ بچتا بچاتا کہیں سے آیا تھا اور جنگل میں سے گزرتے ہوئے اُسے وہ چھوٹا سا سایہ نظر آیا تھا جو پاس پہنچے پر ایک بچی میں بدل گیا تھا جو سسکیوں کے ساتھ بھاری بالٹی اٹھائے جنگل میں کہیں جا رہی تھی۔ کبھی زمین پر رکھتی، انگلیوں کو پھونکوں سے گرم کرتی، کبھی اٹھا کر تھوڑی آگے بڑھتی۔

بڑی عمر کا آدمی آگے بڑھ کر کوسیت کے برابر میں آ گیا۔

انصاری صاحب کا سانس اور دل دونوں رک گئے۔ اس کی توقع انہیں اتنے بڑے ادیب سے نہیں تھی۔ ایک معصوم کردار پیدا کر کے اس کا قتل!

''یہ تمہارے لیے بہت بھاری ہے'' اجنبی نے کہا۔

''جی ہے''

''مجھے دے دو میں لے چلوں گا''

چند لمحوں بعد جب بچی میں جان لوٹ آئی تھی اجنبی نے کہا ''بچی تم کتنی بڑی ہو؟''

''آٹھ سال کی''

''اور ایسے ہی بوجھ اٹھانے تم اتنی دور چل کر آئی ہو؟ کہاں سے؟''

''جنگل میں، چشمے سے''

''اور اتنی ہی دور جانا ہے؟''

''کوئی پاؤ گھنٹہ یہاں سے''

اجنبی کچھ دیر خاموش رہا۔

انصاری صاحب کے کان میں عورتوں کا وہ اَن گنت بار سنا ہوا جملہ گونج رہا تھا جو وہ گھر سے باہر جانے والی لڑکیوں، بچوں کے کان میں بٹھاتی ہیں ''راستے میں کسی اجنبی سے بات نہیں کرنی ہے نہ اس کے کسی سوال کا جواب دینا ہے چاہے وہ کتنا ہی کہے میں تمہارے باپ کا دوست ہوں اور کبھی اتنا اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے ''ایسے لوگ باتوں میں پھسلا کر بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں'' ان کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ وہی جو دن رات سننے پڑھنے میں آتا ہے؟

پھر اجنبی نے اچانک پوچھا ''تمہاری ماں نہیں ہے؟''

''مجھے پتہ نہیں ہے'' بچی نے کہا۔ پھر قبل اس کے کہ اجنبی کچھ کہتا اس نے کہا ''میرا خیال ہے نہیں۔ اور سب کی ہیں لیکن میری کوئی نہیں۔''

پھر اس نے لمحے بھر بعد میں کہا ''میرا خیال ہے میری کبھی نہیں تھی''

آدمی رک گیا۔ بالٹی اس نے زمین پر رکھ دی، جھکا اور ہاتھ اس نے بچی کے کندھوں پر رکھ دیئے۔

انصاری صاحب کی نگاہ میں آٹھ کا ہندسہ تیر رہا تھا: ''آٹھ سال کی لڑکی! اکیلے میں رات کو! ۲ سال کی بھی کب محفوظ ہوتی ہے۔ اس سے آگے وہ نہیں سوچنا چاہتے تھے۔ ایک کردار جس سے انہیں لگاؤ ہو گیا تھا اس کا قتل دیکھنا ان کے بس سے باہر تھا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے دوبارہ بچی کو دیکھا پھر اس کے کندھوں پر سے ہاتھ اٹھا کر دوبارہ بالٹی اٹھائی اور چلنا شروع کیا۔

ایک چھن بعد اجنبی نے پوچھا ''ننھی تم کہاں رہتی ہو'' اور اس کا جواب سن کر کہا ''تمہیں کس نے رات میں اس گھڑی جنگل میں پانی بھرنے جانے کو کہا تھا؟''

بچی نے مالکن کا نام بتایا۔ اس نے کہا ''وہ کرتی کیا ہے؟''

''وہ میری مالکن ہے۔ سرائے چلاتی ہے۔''

''سرائے؟'' اجنبی نے حیرت سے کہا ''وہاں تو مجھے آج رات گزارنی ہے۔ مجھے راستہ بتاتی جاؤ''۔

''ہم وہیں جا رہے ہیں'' بچی نے کہا۔

اب وہ تیزی سے چل رہا تھا اور کوسیت اس کے پیچھے پیچھے اطمینان اور اعتماد سے۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھ لیتی تھی۔ اُسے کبھی پروردگار اور عبادت کے بارے میں کچھ نہیں سکھایا گیا تھا لیکن جو وہ اپنے دل میں پا رہی تھی وہ امید اور خوشی سے مملو تھا اور فلک کو جا رہا تھا۔

عبدالحمید انصاری صاحب نے کتاب اپنی رانوں پر رکھ دی جیسے بوجھل ہو گئی ہو اور ان کے ہاتھ تھکن سے پست۔ آنکھیں بند کر کے کرسی پر پیچھے ٹیک لگائی۔ جذبات کی یورش نے انہیں تھکا مارا تھا۔ اور اب جا کر آرام ملا تھا۔

وہ اٹھے اس ٹھنڈ میں ریفریجریٹر سے لے کر چار چھے گھونٹ ٹھنڈے پانی کے پیئے اور خود سے بولے ''میرا دماغ بھی کہاں پہنچ گیا تھا!'' پھر جیسے خود کو تسلی دی: ''ماحول گندا ہو تو اچھی بات دماغ میں آ ہی نہیں سکتی۔ کسی کے بھی بارے میں۔''

صبح ناشتا کرتے ہوئے معمول کے خلاف انہوں نے رات جو پڑھا تھا اس کا ذکر بیوی سے نہیں کیا نہ ہمیشہ کی طرح نزہت بی نے پوچھا ''رات کیا پڑھا تھا؟''

اخبار لینا دونوں نے عرصہ سے بند کر رکھا تھا۔

آرام گھر

احمد کلیم فیض پوری
(بھُساول، بھارت)

زلزلہ میں مسز آئینگر کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ خاندان کے سات افراد ایک ساتھ اپنے فلیٹ میں دب کر مر گئے تھے۔ عالیشان فلیٹ ایک آن میں زمین دوز ہو چکا تھا۔ مسز آئینگر اکیلی رہ گئی تھیں۔ ان دنوں وہ اپنی بیٹی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔

ساٹھ سال کی عمر۔ کروڑوں کی جائداد اور بینک بیلنس۔ سونی سونی سی زندگی۔ بیٹی نے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ انہیں کے گھر رہ جائیں۔ مگر پرانی روایات کی حامل مسز آئینگر کو داماد کے گھر رہنا قطعی پسند نہیں تھا۔ رہنے کو وہ اپنے بوتے پر رہ لیتیں۔ بھگوان کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر اپنے آدرشوں کا پاس ولحاظ بھی تھا۔ دنیا جہان کے لوگ یہی کہتے کہ داماد کے ٹکڑوں پر پل رہی ہیں۔ چنانچہ بیٹی کی خواہش کو کچل کر انہوں نے تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر بیٹی نے بھی اپنے کو تسلی دے لی تھی کے ماں کہاں بھوکوں مرنے والی۔ مگر ایک فکر ضرور لاحق تھی کہ بیمار پڑے تو ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

شہر سے سو کلو میٹر دوری پر مسز آئینگر کا بڑا سا فارم ہاؤس تھا۔ جہاں ایک خوبصورت کشادہ بنگلہ بنا ہوا تھا۔ اچھی خاصی دولت اور جائداد چھوڑ کر شوہر اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ ساؤتھ میں ان کے کئی ناریل کے باغات بھی تھے۔ جن کی تنہا مالک مسز آئینگر ہی تھیں ایک لڑکا بلڈر اور دوسرا نامور سرجن تھا۔ ابھی سویرا بھی نہ ہوا تھا کہ شہر میں زبردست زلزلہ آ گیا۔ اور یہ پریوار سوتا کا سوتا رہ گیا۔ فارم ہاؤس کبھی تبدیلی آب وہوا، اور چھٹیاں گزارنے کے کام آتا تھا۔ اب مسز آئینگر یہاں تنہا رہ رہی تھیں۔

زلزلے نے کتنے مکان تباہ کر دئے تھے۔ کتنی زندگیاں نگل لی تھیں۔ کتنے امیروں کو سڑکوں پر لے آیا تھا۔ بچے یتیم ہو گئے تھے اور مائیں بیوہ۔ اس ہاہا کار کو مسز آئینگر نے قریب سے دیکھا تھا۔ تبھی ایک خواہش ان کے دل میں جاگی تھی کہ انسانی بھلائی، ہمدردی اور خدمت کا ایسا کام کیا جائے جو ان کی بقیہ زندگی میں راحت کا سبب بنے۔ ایک پُن جو اگلے جنم میں ان کے کام آئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ بوڑھے ناتوانوں سے ہمدردی اور ان کی معقول سیوا آج کا بڑا کام ہے۔ چنانچہ ایک آرام گھر کا تصور ان کے ذہن میں آیا۔ جس کے لئے انہوں نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنے بنگلہ کی توسیع اور اطراف کی زمینوں پر تعمیرات کیں۔

مسز آئینگر جائزہ لے چکی تھیں کہ جہاں بھی ضعیفوں کے لئے گھر بنے ہیں۔ ایک عذاب سے کم نہیں ہیں۔ جہاں انسانوں کو اصطبل کی طرح رکھا جاتا ہے۔ اپنے گھروں کے ستائے لوگ یہاں آ کر ایک اور نرک میں پھنس جاتے ہیں۔ ایسے خیراتی ادارے یا تو نام ونمود کے لئے کھولے جاتے ہیں یا الیکشنی سیاست میں اپنے قدم جمانے کے لئے۔

مسز آئینگر نے یہ بھی سوچا تھا کہ آرام گھر کی وجہ سے وہ تنہا نہیں رہ جائیں گی۔ بوڑھے بزرگ ان کے آس پاس رہا کریں گے۔ اور جن کی ہمسائیگی انہیں انرجی دیتی رہے گی۔

مسز آئینگر نپی تلی، باضابطہ زندگی گزارنے کی عادی تھیں۔ ان کے سامنے ایک معیار ہوا کرتا۔ جس سے زندگی بھر سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ معمولی چیزیں بھی ان کے حسن انتخاب کی مظہر ہوا کرتیں۔ اسی لئے اپنے منصوبہ میں خوش سلیقگی اور معیار کو ملحوظ رکھا تھا۔ وہ چاہتیں تو بوڑھوں کے لئے ضعیف گھر یا ایسا ہی کوئی فرسودہ نام رکھ لیتیں۔ مگر اس مجوزہ پناہ گاہ کا نام آرام گھر رکھا تھا۔ جس کی تعمیر میں انہوں نے تمام ترفنی مہارتوں کو یکجا کر دیا تھا۔ جہاں راحت کی تمام اشیاء مہیا ہوں گی۔ اور یہ سچ مچ کا آرام گھر ثابت ہوگا۔ اسی لئے بہت سوچ سمجھ کر اس کی ماہانہ فیس بھی مقرر کی گئی تھی۔

وہ جانتی تھیں کہ ایسے گھروں میں اکثریت متوسط گھرانوں سے آتی ہے۔ جو ماں باپ کا بڑھاپا برداشت نہیں کر پاتے۔ فیس کا بوجھ برداشت کر لیں گے اور مفت انتظام کو غیر اہم بھی نہ سمجھیں گے۔ جہاں تک غریب عوام کا تعلق ہے خود روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور اپنے پیدا کرنے والوں کو وہی کھلاتے ہیں۔ راحت کا سامان بھلے ہی مہیا نہ کریں۔ پیٹ کا سلگتا دوزخ بجھا کر بوڑھے والدین کی دعائیں ضرور لیتے ہیں۔ زمانے کی بدلتی ہوا میں سانس لینا انہوں نے سیکھا نہیں ہے۔ جبکہ کھاتے پیتے گھرانے بالعموم ماں باپ کے دکھ درد کو سمجھنے اور خدمت کے جذبے سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔

تمام اخبارات میں ایڈ دے دی گئی۔ لوگ آنے لگے۔ انہیں آرام گھر کا معائنہ کرایا جاتا۔ کئی رہائشی کمرے تھے۔ جن میں بوڑھے مرد اور خواتین کے لئے علاحدہ علاحدہ روم بنائے گئے تھے۔ ہر پانچ امیدواروں کے لئے اپنا ایک کمرہ تھا۔ جس میں پلنگ، آرام دہ بستر، صوفہ سیٹ اور گودریج الماریوں کا انتظام تھا۔ ایک ٹی وی سیٹ بھی تھا۔ مناسب تعداد میں صاف ستھرے کشادہ لیٹرن، باتھروم بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف کھلا میدان ورزش کے لئے تھا۔ غرض باغ بغیچوں سے گھرا یہ آرام گھر ایسا نہیں لگتا تھا جسے قید خانہ کہا جائے۔ اسے دیکھ کر مسز آئینگر نے یک گونہ مسرت محسوس کی تھی۔ امیدواروں کو ایک کتابچہ دیا جاتا۔ جس میں آرام گھر کے ضوابط تحریر تھے۔

۱۔ ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر والوں کو داخلہ دیا جائے گا۔

۲۔ پانچ سو روپے ماہانہ فیس ہوگی۔

۳۔ امیدوار ہنرمند ہو تو اس کی بنائی اشیاء سے جو آمدنی ہوگی اس پر ادارہ کا تسلط ہوگا۔

۴۔ اپنے کمرے، برآمدے اور باتھ روم کی روزانہ صفائی خود کرنی ہوگی۔

۵۔ رات گیارہ بجے سونا اور سویرے پانچ بجے اٹھنا ہوگا۔

۶۔ آپسی اتحاد اور باہمی محبت ویگانگت کے ساتھ رہنا ہوگا۔

۷۔کیمپاؤنڈ سے باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔
۸۔موبائل رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔
۹۔مہینے میں ایک بار رشتہ داروں اور دیگر ملنے والوں کے لئے وقت دیا جائے گا۔
۱۰۔کوئی شکایت ہوتو کانفرنس ہال میں منعقدہ ہفتہ واری میٹینگ میں سنی جائے گی اور اس کا مناسب حل نکالا جائے گا۔ سجھاؤ پر بھی غور کیا جاسکے گا۔

اس کے علاوہ دی جانے والی دیگر سہولتوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔مثلاً صبح نو بجے ناشتہ دیا جائے گا، لنچ اور رات کا کھانا مقررہ وقت پر دیا جائے گا۔ چوبیس گھنٹے پانی اور بجلی فراہم کی جائے گی۔ ہر قسم کا علاج اور دوائیں ادارہ کے ذمہ ہوں گی۔اور سال میں ایک بار آرام گھر کی جانب سے ایک جوڑی نئے کپڑے دئے جائیں گے وغیرہ۔

چند دنوں ہی میں آرام گھر میں کئی داخلے ہو چکے تھے۔

ایک روز اشوک اپنی ماں نندنی سے کہنے لگا۔

"بہتر ہے ماں تم آرام گھر چلی جاؤ۔تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔آخر ماں ہو نا۔بہو نے اس گھر میں تمہارا جینا حرام کر دیا ہے کئی بار کہہ چکی ہے گاؤں چھوڑ آؤ، وہاں اپنا گھر ہے مگر کون ہے وہاں؟ یہ بھی کہہ چکی ہے کہ کسی آشرم یا ضعیف گھر کے حوالے کر دو۔ یہ بوڑھا وجود گھر میں کس کام کا، دن رات کھانستی رہتی ہیں۔ بچوں کی صحت کا بھی خیال رکھنا ہے۔" وہ رکا۔اور تاسف بھرے لہجہ میں بولا۔

"مجھ سے زیادہ تنخواہ پاتی ہے۔ یہ فلیٹ بھی اسی کے نام کا ہے اول و آخر گھر میں چلتی اسی کی ہے باپ کے سپورٹ پر زور آور ہوگئی ہے۔"

ماں نے سنا تو آنکھوں میں آنسو ستاروں کی مانند جھلملانے لگے۔گلو گیر آواز میں کہا" دُکھ جھیلنے کی عادی ہوگئی ہوں میں" تمھیں اور بچوں کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہوں اور کیا چاہیئے مجھے دو وقت کی روٹی۔نہیں بیٹے! یہ جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔ بچے بھی کیسے دادی ماں سے لگے رہتے ہیں۔

"بچوں کو ملانے لے آیا کروں گا۔ میں سب دیکھ آیا ہوں۔آرام گھر نہیں جنت گھر ہے وہ۔سکون کے ساتھ رہ سکو گی تم وہاں۔"

"اپنا گھر تو اپنا ہی ہوا کرتا ہے۔ جہاں اپنی تہذیب پلی بڑھی ہوتی ہے۔کچھ سنسکار ہوا کرتے ہیں رشتوں کا گلدستہ جس میں پیار کی خوشبو اور اپنائیت کے رنگ ہوتے ہیں۔اگر ان کے درمیان کوئی کانٹا بھی آجائے تو اس کی چبھن بھلی لگتی ہے۔اگر چہ وہاں سب کچھ ہوگا مگر گھر کی دہلیز کہاں کہ بالآخر اسی دہلیز سے ایک دن ارتھی نکلنا ہے۔" نندنی بے تحاشہ رونے لگی۔

اشوک نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ بدل چکا ہے ماں۔بدلتے وقت کا ہمیں ساتھ دینا ہے۔کل کے جذبے کسی کیلینڈر کے پنوں کی طرح الٹ چکے ہیں۔ میری بے بسی کو تم اچھی طرح جانتی ہو ماں۔اپنی رضامندی کو بھیک سمجھ کر میری جھولی میں ڈال دو۔" گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ایک گیند تیزی کے ساتھ آئی جس نے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا۔تہمت انہیں کے سر جائے گی کہ بچوں کو باہر کیوں جانے دیا۔

سورج ڈوبنے کو تھا۔ دونوں بچے باہر لان میں کھیل رہے تھے۔ اشوک کی بیوی ابھی ڈیوٹی سے نہیں آئی تھی۔ جلا دصفت، متلون مزاج، چرب زبان، اور ایسی ضدی کہ اس کے آگے کسی کی ایک نہ چلے۔

کچھ دیر بعد ہی بہو داخل ہوئی۔اور آتے ہی گھر میں قیامت برپا کر دی۔شوہر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ساس کو بے حساب صلواتیں سنائیں۔

اگلے دن نندنی آرام گھر میں تھی۔ چند دنوں الجھی الجھی سی رہی۔اپنے خیالات کی آندھی میں ادھر سے ادھر اڑتی رہی۔راتوں کو کروٹیں بدلتی رہی۔پھر یہاں کے ماحول نے نندنی کو جیسے اپنے پروں میں ڈھانپ لیا تھا۔

دن گذرتے گئے۔اُس کی صحت میں سدھار آتا گیا تھا۔روکھی سوکھی کھانے والی نندنی کی ناک میں اچھے لذیز کھانوں کی مہک بھر گئی تھی۔

کوئی تین ماہ تک اکیلا اشوک اپنی ماں سے ملنے آتا رہا تھا۔پھر ایک مرتبہ بچوں کو ساتھ لے کر آیا۔ بچے دوڑ کر دادی ماں سے لپٹ گئے۔ شکایت کرنے لگے۔ہمیں چھوڑ کر یہاں کیوں چلی آئیں۔ چلئے ہمارے ساتھ، گھر میں ہمارا جی نہیں لگتا۔نندنی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"آؤں گی بچو! ضرور آؤں گی، ذرا میرا علاج تو مکمل ہونے دو، تمہارے پاپا نے نہیں بتایا کہ میں علاج کے لئے یہاں آئی ہوں۔"

پانچ سال کی ویشالی بول پڑی، اتنی موٹی تو ہوگئی ہیں آپ، کہیں سے بیمار نہیں لگتیں۔اور اس کی معصومیت پر سب کھلکھلا کر ہنس دئے۔

بچے جانے لگے تو نندنی اداس ہوگئی۔آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ آئے۔ایک طرف منہ کر کے ساڑی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور بظاہر خوش ہو کر انہیں الوداع کہا رات گئے تک نندنی کو نیند نہیں آئی۔ پریشان خیال سی کمرے کی چھت کو تکتی رہی اُسے اپنا گاؤں یاد آگیا۔دور دراز تک پھیلی ہوئی زرخیز زمین، بھگوان کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔لیکن آسمان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک حادثہ میں شوہر اپاہج ہوگیا تھا۔ساری زمین حصہ بٹائی پر دے دی گئی تھی۔اس کے بعد نندنی کے بھاگ میں راہو کیتو کا ایک سلسلہ دراز ہوگیا تھا۔

آٹھ سالوں بعد اشوک ان کی گود میں آیا تو شوہر اس دنیا سے چل بسا، آہستہ آہستہ کر کے حصہ بٹائی والوں نے ساری زمینیں ہڑپ کر لیں۔ جو کچھ رہا اسے لے کر بھائی کے دروازے پر شہر آگئی۔اشوک جوان ہوگیا تھا۔زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ بھائی نے معمولی ملازمت دلا دی اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی بیٹی اس کے گلے میں باندھ دی، نندنی کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

اشوک کے گھر آئی تو اُسے دو وقت کی روٹی پر قناعت کرنی پڑی۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن آرام گھر کا منہ دیکھنا پڑے گا۔نہ جانے کب وہ

نیند کے گلیارے میں کھوگئی۔

آرام گھر میں نندنی کی طرح کئی ضعیف لوگ تھے۔ جومختلف اسباب کی بناء پر یہاں لاکر چھوڑے گئے تھے۔

ان میں ہرایک کا دُکھ الگ تھا۔کوئی ایک بھی محض اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ ضعیفی کی عمر سے آگے نکل گیا تھا۔اور نہ اس لئے کہ یہاں ہرطرح کا سکھ اسے حاصل تھا۔ بلکہ وہ اس لئے یہاں جھونک دئے گئے تھے کہ آج کی جنریشن انہیں بوجھ سمجھنے لگی تھی۔ان کے نزدیک دنیا کا واحد مقدس رشتہ اپنے معنی ومفہوم کھو چکا تھا۔

اگرچہ لوگ اس گھر میں اپنے گھروں سے زیادہ راحت کی زندگی گزار رہے تھے۔لیکن پھر بھی ایک کسک سی ان کے دلوں پر سایہ کئے ہوئی تھی۔

آرام گھر میں کئی ضعیف لوگ ہنرمند تھے۔جن کی بنی اشیاء خاصی مارکیٹ پا چکی تھی۔اچھی خاصی آمدنی ہورہی تھی۔لیکن مسز آئینگر نے اس آمدنی کو کبھی خاطر میں نہیں لایا تھا۔وہ اس بات سے خوش اور مطمئن تھیں کہ ایک مختصر عرصہ میں آرام گھر کو بڑی نیک نامی میسّر آئی تھی۔جس جذبے کے تحت انہوں نے اس عظیم خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا۔انہیں وشواس تھا کہ اگلے جنم میں یہی کام آئے گا۔

سردی کے دن آگئے تھے۔نندنی گرم سویٹر بننے میں مہارت رکھتی تھی۔اپنے کمرے میں رہ رہے سبھی لوگوں کے سویٹر نندنی نے بن دئے تھے۔اور ادارے کے لئے بُنے سویٹروں کی بازار میں مانگ تھی۔اس معاملہ میں نندی کی خوش سلیقگی کے چرچے سارے شہر میں ہونے لگے تھے۔

اشوک کی بیوی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ جب بچوں نے اسے بتایا کہ دادی ماں وہاں بڑے مزے میں رہ رہی ہیں۔ یہ معلوم کرکے بھی وہ جل گئی کہ بڑھیا کی صحت دونی ہوگئی ہے جس بڑھیا کو اس نے سوکھا پیڑ بنا رکھا تھا اس پر سبز پتوں کی بہار وہ کبھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔اگرچہ غصہ وحسد کی آگ میں بری طرح جھلس رہی تھی۔ پیچ وتاب کھا رہی تھی۔

پھر بھی جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا ٹھیک نہیں سمجھ رہی تھی، چنانچہ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تریا چرتر کے اس حربے کو آزمانے کی ٹھان لی، جس کے زیرِ اثر بڑے بڑے رشی منیوں تک کو رام کیا جاسکتا ہے۔

اسے پچھتاوا آرہا تھا اور شدید احساس ہونے لگا تھا کہ اپنے مزاج کی مار کے لئے گھر میں ایک ایسی ہستی کا وجود ضروری ہے جسے تڑپتا دیکھ اس کی جبلت کو تسکین ملے۔

اشوک کی بیوی نے پہلے بچوں کو آمادہ کیا کہ دادی ماں کی واپسی کے لئے ضد کریں۔ جو ماں کے سامنے اپنی دادی ماں کے ذکر سے سہمے رہتے تھے۔ اشوک کے ساتھ پتی ورتا کا ایسا سوانگ رچایا کہ اسے پگھلتے زیادہ دن نہیں لگے۔ پھر وہ دن آیا جب سارا پریوار آرام گھر پہنچ گیا۔

اشوک کی بیوی پھٹی پھٹی نظروں سے ساس کو دیکھے جارہی تھی۔ان کے گال سیب کی طرح سرخ دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں کی ہر چیز کو وہ حیرانی سے تکے جارہی تھی۔ بچے دادی ماں کی گود میں جا بیٹھے تھے۔ایک نرم سا احساس دادی ماں کے رگ وپے میں پھیل گیا۔انہوں نے بچوں کو پیار سے اپنی آغوش میں لے لیا۔تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔خوبصورت پیالوں میں نفیس چائے بھی اشوک کی بیوی کو حیرت زدہ کرگئی۔اسے لگا جیسے وہ کسی عمدہ ریستوران میں بیٹھی ہو۔ وہ سوچ رہی تھی اپنی ساس سے کیسے مخاطب ہوا جائے۔اس نے اشوک کی طرف دیکھا۔اور اپنے چہرے کی ساری شگفتگی انڈیلتے ہوئے کہا:

"ماں جی! ہم آپ کو لینے آئے ہیں، گھر میں بچوں کے کملائے چہرے اب نہیں دیکھے جاتے، اشوک بھی گم صم رہا کرتا ہے، جو کچھ ہوا اسے بھول جایئے۔گھر میں برتن ٹکراتے ہی ہیں۔کوئی نئی بات ہے۔"اس کا لہجہ خاصہ نرم تھا۔اس دوران ساس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ پھر اس نے لجاجت سے کہا۔

"اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے۔جس میں دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں، گھنی چھاؤں بزرگ ہی دے سکتے ہیں۔ہماری بنتی ہے کہ آپ چلی آئیں۔اور اس پریوار کو اپنی چھتر چھایا میں لے لیں" کہتے ہوئے اس نے شوہر کی طرف دیکھا۔

"ماں یہ ٹھیک کہتی ہے "اشوک نے ہاں میں ہاں ملائی۔اور پرامید نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔اشوک کی بیوی کو لگا۔ تیر اثر کرجائے گا۔اور بڑھیا رو دھوکر سہی اپنا سامان باندھنے کو تیار ہوجائے گی۔ بچے ٹی وی دیکھنے چلے گئے تھے۔ نندنی پہلے حیرت زدہ رہی کہ آج بہو نے منہ بھر کے اُسے ماں جی کہا تھا۔ورنہ یہ بات اسے چھوکر بھی نہیں گزری تھی۔دل کا ایک کونہ بیٹھ سا گیا تھا۔لیکن نہ جانے کیا سوچ کر وہ سنبھل گئی۔ایک بھرپور نگاہ بہو کے چہرے پر ڈالی اور سپاٹ لہجے میں کہا:

"بہو! دوش کسی کا نہیں ہے۔سب بھاگ کا لکھا ہے۔ایک صدمہ وہ تھا جب گاؤں کا اپنا گھر چھوٹا تھا اس کے بعد بھائی کا گھر چھوٹا، اور اب اپنے بیٹے کا، عادی سی ہوگئی ہوں میں، لیکن یہاں آئی تو لگا جیسے یہی میرا اصل گھر ہے اور اصل گھر ہوتا ہی ہے دل کے سکون کے لئے۔آرام وراحت کے لئے، جو مجھے ہرطرح سے میسر ہے، بیمار پڑتی ہوں تو ڈاکٹر دوڑے چلے آتے ہیں۔نرس دیکھ بھال کرتی ہے۔فوراً دوائیں آجاتی ہیں بھگوان بھلا کرے مسز آئینگر کا دلاسہ دینے چلی آتی ہیں۔ دنیا میں خون کے رشتوں کی ایک اہمیت ہے۔لیکن یہاں کے لوگ خونی رشتوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی ان سے بڑھ کر ہیں۔پہلی بار احساس ہوا ہے کہ راحت کا سرچشمہ صرف اپنے ہی نہیں پرائے بھی ہوتے ہیں۔" کہتے ہوئے ایک کرب سا ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔چشمہ صاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میں اُس ایک گھر میں لوٹ کر کیونکر جاسکتی ہوں۔جبکہ یہاں میرے انیک گھر ہیں! نہیں بہو، میں ان سے بے ایمانی نہیں کرسکتی۔ جہاں بھی رہوں، کیا فرق پڑتا ہے، میری ارتھی اٹھنے تک میرا آشیرواد تم سب کے ساتھ رہے گا!"

ساس کا ایک ایک لفظ برچھی کی انی کی طرح بہو کے دل میں چبھ گیا۔یکا یک اس کا چہرہ اتر گیا وہ ہونق سی نندنی کو دیکھتی رہ گئی۔کچھ بولنا چاہتی تھی مگر بولنے کے لئے اس کے پاس بچا ہی کیا تھا!

کھلونا جان کر۔۔۔!

بشریٰ رحمٰن
(لاہور)

وہ اپنے اسی انداز میں گھا گھرا گھماتی، لہریں بناتی، تیز تیز قدموں سے چلی آ رہی تھی۔ سر پر اس کے رنگین ٹوکری تھی اور پنڈلیوں پر چاندی کے نازک کڑے صاف نظر آ رہے تھے۔ فرحان نے جلدی سے آنکھوں پر کالی عینک چڑھالی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں کیوں جب بھی وہ اس لڑکی کو دیکھتا اس کے اپنے وجود کے اندر بھنور بن بن کے ٹوٹنے لگتے۔ جوں جوں وہ گھا گھرا گھماتی توں توں اس کا وجو بھنور کے جال میں پھنستا چلا جاتا۔۔۔

اس لیے ایک دن وہ اس کے پاس چلا گیا۔۔۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ رعب سے بولا۔

''اے لڑکی ٹوکرے میں کیا ہے؟''

''گھگھو گھوڑے ہیں سائیں۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹوکرا سر سے اُتارا اور زمین پر رکھ دیا اور دکاندارانہ انداز میں خود بھی جھٹ سے زمین پر بیٹھ گئی۔

''یہ دیکھو یہ گھوڑا ہے۔۔۔ یہ دو روپے کا ہے''

''یہ گھگھو ہے۔۔۔ منہ سے لگاؤ تو اس طرح سٹی بجاتا ہے'' اس نے بجا کر دکھایا۔ ''یہ ایک روپے کا ہے اور یہ دولہا دلہن کا جوڑا پانچ روپے کا ہے اور یہ توپ ہے۔۔۔''

''اری یہ سب تو مٹی کے ہیں''

''ہاں سائیں۔۔۔ ہم مٹی کے کھلونے بنا کے اپنی بھٹی میں پکا لیتے ہیں۔''

''پھر بھی اتنے مہنگے۔۔۔''

''اللہ کا خوف کرو سائیں۔۔۔'' اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح ناک چڑھا کر کہا۔۔۔

''میری ماں کی ٹانگیں خراب ہیں وہ چل پھر نہیں سکتی۔ سارا دن بیٹھی کھلونے بناتی ہے۔ بابا سارا دن گدھے پر لاد کے لکڑیاں بیچ کے کچھ بچا کے گھر لے آتا ہے پھر ان کھلونوں کو بھٹی میں پکاتا ہے۔ ہم دونوں بہنیں گھوم گھام کر ان کو بیچتی ہیں۔ تب رات کو ہمارے گھر روٹی پکتی ہے۔''

''تمہاری بہن کہاں ہے۔۔۔؟''

''وہ مجھ سے چھوٹی ہے، وہ سڑک کے اس پار جاتی ہے۔'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

''کتنے پیسے کما لیتی ہو روز۔۔۔؟'' اس نے عجیب انداز سے پوچھا۔

''دس ۔۔۔ بارہ۔۔۔ روپے۔۔۔'' وہ انگلیوں پر گن کر بتانے لگی۔ ''کبھی کچھ بھی نہیں کماتی تب ماں سے رات کو مار پڑتی ہے۔۔۔''

''کیوں پڑتی ہے مار۔۔۔؟''

وہ کہتی ہے تم نے سارا دن کھیل میں گزارا ہوگا۔۔۔ وہ سر کھجانے لگی۔۔۔ وہ جانے لگا تو ایک کھلونا ہاتھ میں پکڑ کر بولی۔

''تم لے لو نا سائیں۔۔۔'' فرحان نے اس کے ہاتھ کو دیکھا پھر اس کی نظر اس کے گریبان تک چلی گئی۔ لڑکی دس بارہ سال کی تھی ابھی کپڑوں سے اور گریبان سے باہر نہیں آئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایسی لجاحت تھی کہ فرحان نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دو روپے نکالے اور گھوڑا اُٹھا لیا۔

''بس سائیں۔۔۔'' وہ دو روپے پکڑ کر بولی۔ ''تمہارے بال بچے نہیں ہیں، کچھ ان کے لیے لے لو۔''

''چلو بھاگو۔۔۔ میرا وقت ضائع نہ کرو'' گھبرا کے وہ دوسری طرف مڑ گیا۔

شہر سے دور یہاں ایک آئی ٹی یونیورسٹی بن رہی تھی۔ فرحان ابھی ابھی سول انجینئرنگ کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ آتے ہی اسے ایک پرائیویٹ کنسٹرکٹنگ کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ یہ اس کا پہلا جاب تھا۔ اس لیے وہ یہاں روزانہ سپرویژن اور انسٹرکشن کے لیے آتا تھا۔ اصل میں اس کے کیریئر کا انحصار ہی اس شاندار بلڈنگ کی تکمیل پر منحصر تھا۔ وہ روزانہ مزدوروں اور مستریوں کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے دوپہر تک وہیں رہتا۔ یہاں ابھی سڑکیں بھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ شہر کافی دُور تھا۔۔۔ دُور نزدیک کچھ اور عمارات بھی بن رہی تھیں۔ مگر سیمنٹ سریا کی نمائش کے علاوہ کوئی اور رونق میلہ نہیں تھا۔ وہ اِدھر اُدھر گھوم کر، موبائل فون پر گیت سن کر وقت گزار دیتا تھا۔

پھر ایک دم اُس کی نظروں میں یہ لڑکی آ گئی۔ وہ دُور سے آتی ہوئی پتنگ کی طرح لگتی۔ کالے گھاگھرے اور سرخ کُرتی میں گھسن گھیریاں کھاتی وہ آگے بڑھتی آتی۔۔۔ حتیٰ کہ وہ ایک عورت کی شکل اختیار کر لیتی۔ جونہی وہ مجسم ہوتی، فرحان کے اردگرد الاؤ سے جلنے لگتے۔ جس دن وہ نہ آتی۔۔۔ وہ بڑا بیزار ہو جاتا۔ خواہ مخواہ مزدوروں کو ڈانٹنے لگتا۔۔۔ کام میں نقص نکالتا، اپنی موٹر سائیکل پر یونہی چکر لگانے لگتا۔

اگر وہ اچانک نظر آ جاتی تو وہ خوف زدہ ہو جاتا۔ ایک عجیب سا خوف نزدیک آ کے اس کے کان میں پھونکیں مارنے لگتا۔ کبھی وہ گھبرا کر بلڈنگ کے اندر گھس آتا اور کبھی لڑکی کو روک کر ایک چھوٹا سا کھلونا خرید لیتا۔

کبھی کبھی وہ خود اس کے پاس سے گزرتے ہوئے آواز لگاتی۔

''سائیں آج کھلونا نہ لو گے۔۔۔''

اس پر مزدور کھی کھی کر کے ہنسنے لگتے۔

''کم بخت دفعان ہو جا۔۔۔'' وہ دل میں اُسے گالی دیتا۔

کبھی کبھی تھکے ہارے مزدور اس چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ فحش مذاق کرنے لگتے۔۔۔

اور وہ بڑی تجربہ کار عورتوں کی طرح ناک پر انگلی رکھ کے کہتی۔
''گھر میں تمہاری ماں بہنیں نہیں ہیں۔۔۔'' اس پر سارے مزدور کھلکھلا کر ہنسنے لگتے۔۔۔

ایسے میں فرحان فرعونی شکل بنا کر نمودار ہو جاتا۔
مزدور سنجیدہ شکل بنا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔
عمارت کی چھتیں مکمل ہو گئی تھیں اور آج کل دوسری منزل پر کام ہو رہا تھا۔
وہ بیٹھا حساب کتاب جوڑ رہا تھا۔ سارا عملہ کھانا کھانے دُور ایک تندور پر چلا گیا تھا۔
یکا یک وہ سامنے نمودار ہوئی۔ پیچ در پیچ پتنگ کی طرح بل کھاتی ہوئی، گھیر گھماتی ہوئی۔ فرحان کے کان میں پھر کوئی گھس گیا۔۔۔ کھسر پھسر کرنے لگا۔۔۔ کھی کھی ہنسنے لگا۔۔۔ فرحان نے لڑکی پر سے نظر ہٹالی۔۔۔ پنسل سے کان کھجا کر اس کو باہر نکال دیا تو وہ سامنے کے روشن دان پر بیٹھ کے کھی کھی کرنے لگا۔۔۔ فرحان کو ایک خوف نے بوکھلا دیا۔۔۔ اسے یوں لگا۔۔۔ ہر طرف کالا گھا گھرا پھیل گیا ہے۔۔۔

اس نے سوچا آج وہ یونہی نظر جھکائے بیٹھا رہے گا۔
مگر وہ خود آ گئی۔ بولی۔۔۔
''آج کھلونے لے لو سائیں، صبح سے بکری نہیں ہوئی۔
''اندر آ جاؤ۔۔۔'' بے اختیار وہ بولا۔ یہ اس کی آواز نہیں لگ رہی تھی۔ کوئی اور اس کے اندر بول رہا تھا۔

وہ اندر آ گئی۔۔۔
ٹوکرا زمین پر رکھ کے دھپ سے خود بھی بیٹھ گئی۔
پورا گھا گھر افرش پر پھیل گیا، عمارت پر چھا گیا۔
کھی کھی کی آواز آنے لگیں۔
''کیا لوگے سائیں۔۔۔''
فرحان نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔ اور ایک پل سوچے بغیر اس کو ٹھنڈے ٹھار فرش پر سیدھا کر دیا۔
اس کی آنکھیں کھلتے کھلتے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔۔۔ اس کا منہ اتنا کھلا کہ چیخ کو کھا گیا۔۔۔
فرحان کھسیانہ سا کھڑا ہو گیا۔۔۔ پھر کپڑے درست کر کے اس نے جیب میں سے سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔
''یہ لے لو اور جاؤ۔۔۔ سو کا نوٹ ہے''
نہیں سائیں مجھے تو چھٹا دے دو۔۔۔
وہ جب چھوٹے نوٹ لے کر اندر آیا تو اس نے دیکھا وہ ٹوکری کے سارے کھلونے دیوار پر مار مار کر توڑ رہی تھی۔
''یہ کیا کر رہی ہو'' فرحان نے گھبرا کر پوچھا۔
ماں پوچھے گی کھلونے نہیں بکے۔ پھر کیا بیچ کر اتنے پیسے لائی ہے؟

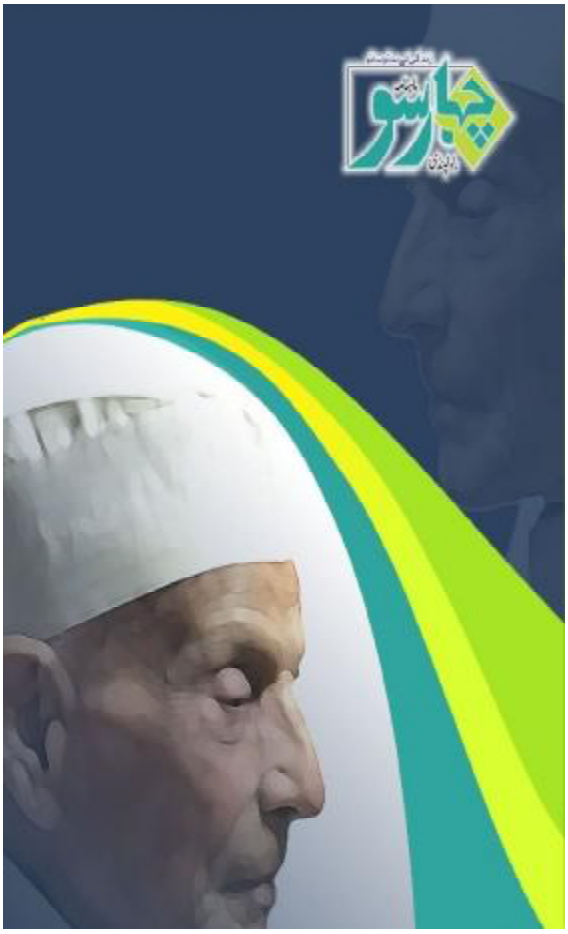

پیارے بھائی تسلیمات۔
کل ہی مجھے باوا کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا آپ بھارت آنے والے ہیں اس سے ہم لوگوں کو بہت خشی ہوئی۔ ہر دن آپ کا انتظار رہے گا۔

وہ آئیں ہمارے گھر پہ خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

میں نے باوا کو خط لکھ دیا تھا وہ آپ کو جالندھر میں دیکھ لینگے آج آپ کا خط بھی ملا۔ زروری تار آپ کو دے چکا ہوں میں دلی میں ہی ہوں۔ ۱۹۔ اگست کو مجھے ۳۔ دن کے لیے باہر جانا ہے۔ امید ہے آپ اسکے پہلے آ جائینگے۔ بیگم صاحبا کو میرا سلام۔ بچوں کو دعا۔ زیادا ملنے پر۔

خدا حافظ۔
آپ کا
بچّن

(نامور بھارتی اداکار امیتابھ بچن کے والدِ محترم ڈاکٹر ہرونش رائے بچن کا مکتوب نادر بنام پروفیسر حمید احمد خان کے نام)

منزل ہے کہاں تیری

نجم الحسن رضوی
(امریکہ)

اچانک سمندر نے زور کی انگڑائی لی اور پانی کا نیلا پہاڑ اس طرح کشتی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے للکار رہا ہو کہ جینے کے لیے اسے پوری طاقت سے موت سے ٹکرانا ہوگا۔ نحیف ونزار کشتی ٹھٹک کے لمحے بھر کو رکی اور پھر جھرجھری لے کر آہستہ آہستہ آگے چل پڑی۔

کشتی میں سوار لوگ بلند آواز میں کلمہ طیبہ کے ورد میں مصروف تھے۔ اسی وقت لوگوں کے بیچ میں پھنس کے بیٹھی پانچ سالہ حنان نے اچانک قے کر دی۔ بہت سے لوگ سر پکڑے بیٹھے تھے۔ چکر اور متلی نے ان کے ہوش معطل کر دیے تھے۔ ایک بار پھر سمندر کی ایک جناتی لہر کشتی کے اوپر سے گزر گئی اور کشتی کا انجن یوں دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے اس پر دل کا دورہ پڑا ہو۔ کشتی راں نے لپک کے اس کے دو ایک پرزے موڑے۔

کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا، ''ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟''

''کشتی والے کے بجائے کشتی کے ناہنجار انجن سے پوچھو۔'' بابا ابوسلام بھی اچانک بول پڑے۔ انھوں نے گھڑ گھڑاتے انجن کے پاس ڈیرا جمار کھا تھا اور اپنے بھاری تن وتوش کی وجہ سے تین آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ وہ صرف ایک بوری اپنے ساتھ لائے تھے جس میں نجانے کیا الم غلم بھرا تھا۔ انھوں نے اسے اس احتیاط سے اپنی گود میں چھپا رکھا تھا جیسے وہ بوری نہ ہو کوئی جیتا جاگتا بچہ ہو۔

میرے خاوند علی احمد نے اس سفر کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی جس کے بعد ہی ہمیں اپنے دونوں بچوں حسن اور رباب سمیت اس کشتی میں جگہ ملی تھی۔ جب ہم گھر سے نکلے تو صبح ہونے والی تھی اور بس کے اڈّے پر حلب جانے والی گاڑی بس روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہیں ہمیں چچا دیوانے بھی ملے۔ حسبِ معمول اپنے بیٹے طلحہ کے کندھوں پر سوار — وہ جامعہ دمشق میں تاریخ کے استاد تھے۔ جس دن بم باری ہوئی انھیں کئی گھنٹوں کے بعد عمارت کے ملبے سے نکالا گیا، مگر وہ اپنی ٹانگوں سے محروم ہو چکے تھے، بعد میں ان کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں رہی۔ اب ان کی باتیں لوگوں کو سمجھ نہیں آتی تھیں۔ ویسے بھی وہ بولتے کم تھے۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھے گھر کی دیواروں پر پنسل سے خطاطی کے انوکھے نمونے تیار کرتے رہتے جو بالکل سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ہاں کوئی بہت غور سے انھیں پڑھنے کی کوشش کرتا تو وہاں اسے لفظوں اور حرفوں کے غبار میں چھپی ایسی تحریر نظر آتی جو پہلی نظر میں پڑھی نہیں جاتی تھی۔ البتہ بہت غور سے دیکھنے پر کبھی اس پر دھندلی دھندلی سی قرآنی خطاطی کا گمان ہوتا تو کبھی لگتا کہ بعض بستیوں کے نام وہاں لکھ کے مٹا دیے گئے ہیں۔ دمشق، بغداد، قسطنطنیہ — پھر فوراً ہی سارے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو کے بالکل بے معنی ہو جاتے۔

طلحہ نے بس پر سوار ہونے سے پہلے ہم سب کو چچا دیوانے کی ذہنی کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ کہنے لگا، ''اب بڑی مشکل سے ساتھ لایا ہوں۔ کہہ رہے تھے، جانا کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا جہاں سب جا رہے ہیں۔'' طلحہ نے بتایا۔

اور ان سب جانے والوں سے ہم باب النصر کے پاس اس خیمہ بستی میں ملے جہاں ہر روز آنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا مگر آگے جانے کے راستے مسدود تھے۔ ہم سب کو سمندر پار جانے کے لیے کشتیوں کی تلاش تھی مگر کشتیاں ناپید تھیں اور ان کا کرایہ — اللہ کی پناہ! بہت سے لوگ بعض دوسرے مقامات پر جا کے آگے سفر کرنا چاہتے تھے مگر کچھ بات نہیں بن پا رہی تھی۔ حنان کی امی ام خلفان کو بھی یہاں تک پہنچنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے، بڑا لمبا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ بسوں، ٹیکسیوں اور لاریوں کے مالکان انھیں زمینی راستے سے کئی ایسی جگہوں پر لے کر گئے جہاں کشتیوں کے سفر کی سہولت موجود تھی، مگر کچھ کام نہ بنا۔ پانی کی طرح پیسا بہانے کے باوجود کسی بحری جہاز، مچھیروں کے ٹرالر یا کسی اور کشتی میں اسے جگہ نہ مل سکی، مجبوراً اب اسے بھی ہمارے ساتھ سفر کرنا تھا، اسی کشتی میں۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ اس عجیب الخلقت سواری کو کشتی کہنا مشکل تھا کیوں کہ یہ ہانپتی کانپتی، رہڑ کی کشتی ایسا آبی جھولا ثابت ہوئی جس میں لوگ موت اور زندگی کے درمیان جھول رہے تھے۔ کشتی بس اتنی بڑی تھی کہ اس میں دس پندرہ مسافر سما سکتے تھے پھر بھی اس میں گنجائش سے دگنے لوگ ایک دوسرے پر سوار تھے اور یہ کشتی غرق ہو جانے والے کسی جہاز کی بچھڑی ہوئی لائف بوٹ کی طرح سمندر کے رحم وکرم پر تھی۔

حنان روتے روتے اُم خلفان کی گود میں چھپ گئی تھی۔ کشتی ہر بار جب بھی کسی طوفانی لہر سے بغل گیر ہوتی تو اس میں ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا۔ ہر آدمی دل ہی دل میں سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا۔ طلحہ نے چچا دیوانے کو ایک کونے میں اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ جب کشتی پانی کے کسی منہ زور ریلے سے ٹکرا کے اوپر اٹھتی اور پھر تیزی سے سمندر کی سطح سے ٹکراتی تو خوف سے مسافروں کی چیخیں نکل جاتیں، مگر چچا دیوانے نے اپنے گرد خاموشی کی فصیل کھینچ رکھی تھی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ کشتی میں سب سے بلند آواز بابا ابوسلام کی تھی جو بار بار لوگوں کو حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔

بابا ابوسلام صوق المدینہ میں اپنی دُکان بند کر کے گھر جانے کے لیے نکلے ہی تھے کہ بڑے زور کا دھماکا ہوا اور پھر وہی ہوا جو وہ نہیں چاہتے تھے۔ انھیں بھی سفر پر نکلنا پڑا۔ بابا ابوسلام روغنی پلاسٹر والے مٹی کے خوش نما ظروف فروخت کرتے تھے۔ کوزے، صراحیاں اور عود اور لوبان جلانے کے برتن جن کی دھوم دور دور تھی۔

سمندر رہ رہ کے اپنی شکل بدل رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک نیلے اژدھے کا روپ دھار لیا۔ اس نے کشتی کے پیچھے آ کے اسے اپنے سر پر اٹھایا اور پھر زور سے نیچے پٹخ دیا۔ کشتی میں ایک بار پھر بھونچال آ گیا اور لوگوں کے چیخنے چلانے

کی آوازیں تیزی سے ابھریں اور پھر سمندر کے شور میں ڈوب گئیں۔ چچا دیوانے نے ادھ کھلی آنکھوں سے روتے دھوتے بچوں اور بوکھلائی ہوئی عورتوں کو دیکھا اور پھر سے اپنی خاموش دنیا میں کھو گئے۔

حنان رو رو کے ہلکان ہوگئی تھی۔ میں نے اسے اُمِ خلفان کی گود سے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے سب کپڑے گیلے تھے اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنی شال اتار کے بچی کے گرد لپیٹی اور اسے اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ میری بیٹی رباب جو علی احمد سے لپٹی ہوئی بیٹھی تھی، یہ برداشت نہ کر سکی اور میرے پاس آنے کی ضد کرنے لگی، مگر علی احمد نے اسے اپنے پاس سے ہٹنے نہ دیا اور وہ اپنے بھائی حسن کے ساتھ اپنے بابا کے بازوؤں کے حصار سے باہر نہ آ سکی۔

بگڑے ہوئے حالات دیکھ کر ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور رضا کارانہ طور پر مسافروں کی لائف جیکٹیں جانچنے لگا۔ ''سمندر بگڑا ہوا ہے۔'' اس نے کہا، ''اور یہ کشتی بھی کم ناراض نہیں۔''

کچھ لوگ اپنے ساتھ ٹائر اور موٹر کی ہوا بھری ٹیوبیں لائے تھے۔ بابا ابوسلام کا تن و توش ایسا تھا کہ شاید ہی کوئی لائف جیکٹ ان کے کام آتی۔ نوجوان نے ایک ٹائر ان کے پاؤں کے پاس رکھ دیا۔ چچا دیوانے اگرچہ طلحہ کے کندھوں پر سواری کرتے تھے مگر انھیں بھی ایک تنگ سی حفاظتی جیکٹ میں جکڑ دیا گیا تھا۔ کشتی میں جگہ بہت کم تھی پھر بھی سب مسافر اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ سامان ضرور لائے تھے۔ چھوٹا موٹا سامان پیٹھ پر لادے جانے والے تھیلوں میں بچوں کے سپرد کیا گیا تھا۔

سب سے زیادہ پریشانی اِمِ خلفان کو تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی حنان اس کے ساتھ تھی مگر کوئی مرد اس کے ہمراہ نہ تھا۔ اُمِ خلفان نے بتایا کہ حنان کے بابا بابِ احمر کے قریب فائرنگ میں ہلاک ہوگئے تھے۔ وہ بیکری چلاتے تھے اور مالی طور پر خاصے خوش حال مگر ان کے بعد اُمِ خلفان گھر سے نکلتے ہوئے بس ایک ٹوکری اپنے ساتھ لا سکی تھی جس میں روٹیاں، بسکٹ اور کھجوریں تھیں جو کشتی میں روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے کام آ رہی تھیں۔

سفر شروع ہونے سے پہلے کشتی راں نے بتایا تھا کہ بس دو گھنٹے میں وہ منزل تک پہنچ جائیں گے، مگر سمندر کے بگڑے ہوئے مزاج کی وجہ سے راستہ ڈُگنا لمبا ہوگیا تھا۔ پتا نہیں اور کتنا وقت گزرا تھا کہ بچوں کے رونے دھونے کی آواز کے درمیان اچانک کشتی راں کی مسرت آمیز آواز ابھری، ''ہم لوگ کنارے کے پاس پہنچ گئے ہیں بس آدھا گھنٹا اور۔'' چچا دیوانے جو طلحہ کے پاس آنکھیں موندے بیٹھے تھے، اچانک بول پڑے، ''اچھا تو ہم لوگ وہاں پہنچ گئے کیا؟''

''ابھی نہیں۔'' طلحہ نے انھیں خود سے لپٹا کے کہا، ''مگر کچھ دیر میں ہم وہیں ہوں گے۔''

مگر کنارہ ابھی دور تھا کہ کشتی میں دوبارہ پانی بھرنا شروع ہوگیا۔ تیز لہروں کے تھپیڑوں سے ربڑ کی خستہ حال کشتی قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ انجن اس طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا جیسے بند ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔ اتنے میں کشتی راں چلایا، ''ہمیں کچھ وزن فوراً کم کرنا ہوگا ورنہ...''

''ورنہ؟'' بابا ابوسلام نے چونک کے پوچھا۔

''ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔'' کشتی راں نے جواب دیا، ''ہمیں سارا فالتو سامان نیچے پھینکنا ہوگا فوراً۔''

''فالتو سامان؟'' بابا ابوسلام نے گود میں رکھی بوری کو دونوں ہاتھوں سے دبوچتے ہوئے کہا، ''فالتو سامان کس کے پاس ہے؟''

عین اسی وقت کشتی نے ایسے خطرناک طریقے سے کروٹ لی کہ لگا کہ بس الٹنے والی ہے۔ ایک مسافر گھبرا کے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ''اللہ اکبر'' کے نعرے کے ساتھ اپنا بیگ کندھے سے اتار کے سمندر میں اچھال دیا۔ کچھ اور لوگوں نے اس کی تقلید کی۔ کسی نے بابا ابوسلام سے پوچھا، ''اور یہ بوری؟'' مگر انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور بوری کو گود میں سمیٹے بیٹھے رہے۔ مسافر اپنا چھوٹا موٹا سامان کشتی سے باہر پھینکتے رہے مگر کشتی کی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ بار بار رک رہی تھی اور پانی تیزی سے اندر آ رہا تھا۔

کشتی راں پھر چیخا، ''پانی نکالو، پانی نکالو!''

مسافر جلدی جلدی پانی باہر نکالنے لگے، مگر پلاسٹک کے کٹورے اور کاغذی گلاس ناکافی تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنی ٹوپیوں میں پانی بھر بھر کے باہر پھینکنا شروع کیا۔

بابا ابوسلام بے چین ہو کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر انھوں نے بوری کا منہ کھولا اور سارا سامان کشتی میں ڈھیر کر دیا۔ مٹی کے رنگ بہ رنگے برتن لوگوں کو حیران کر گئے۔ خوب صورت کوزے اور نازک صراحیاں جن کی روغنی سطح پر تصویروں اور قرآنی حروف کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ گنبد و مینار، محرابی دروازے اور خوش نما گل بوٹے۔

بابا ابوسلام نے لوگوں کو برتنوں پر جھپٹتے اور ڈوبتی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے ان میں پانی بھر بھر کے سمندر میں پھینکتے دیکھا اور پھر خالی بوری بھی باہر اچھال دی۔

کشتی پر نزع کا عالم طاری تھا۔ کشتی راں نے کہا، ''کنارہ بالکل سامنے ہے مگر اس تک پہنچنا مشکل لگ رہا ہے۔ کشتی اب بھی بھاری ہے۔'' بابا ابوسلام اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انھیں لگا جیسے ان کا سارا سرمایہ لٹ گیا ہو۔

کشتی اب آہستہ آہستہ کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی جو سامنے نظر آ رہا تھا، بہت سے مسافر بے تاب ہو کے کھڑے ہوگئے، مگر ان کی اس حرکت سے کشتی پھر سے غیر متوازن ہوگئی اور پانی پھر سے اندر آنے لگا۔ کشتی راں چیخا، ''کشتی ڈوب رہی ہے۔ ہم سب کو پانی میں اترنا ہوگا۔ بچوں کو کندھوں پر اٹھا لیں، ویسے کنارہ قریب ہے اور پانی یہاں زیادہ گہرا نہیں ہے۔''

کشتی واقعی کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈوب گئی۔ دوسرے ہی لمحے سارے مسافر مرد اور عورتیں بچوں سمیت کنارے تک پہنچنے کی کوشش میں پانی

میں ہاتھ پاؤں مارتے نظر آئے۔ ساحل پر پناہ گزینوں کی امداد کے لیے کوسٹ گارڈ کے وردی پوش سپاہیوں کے علاوہ سرخ جیکٹوں والے امدادی اداروں کے رضا کار جمع تھے جو سمندر میں اتر کے انھیں کنارے تک پہنچنے میں مدد دے رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے بچے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھے تھے اور گردن تک پانی میں ڈوبے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

علی احمد نے حسن اور رباب کو اپنے کندھے پر اٹھا کے کچھ دور پہنچایا پھر رضا کاروں نے آگے بڑھ کے انھیں سنبھال لیا۔ ام خلفان بھی حنان کے ساتھ بہ خیریت کنارے تک پہنچ گئی۔ پتا نہیں طلحہ نے کیسے چچا دیوانے کو کشتی سے باہر نکالا۔ میں نے جب کنارے پر پہنچ کے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو وہ طلحہ کے کندھوں پر سوار پانی سے خشکی پر آتے دکھائی دیے۔

کنارے کے قریب سمندر بھی سکون کا سانس لے رہا تھا، مگر دور جہاں ہماری کشتی ڈوبی تھی وہاں تڑپتی لہروں میں اس کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ مٹی کے بے شمار منقش کوزے اور برتنوں کے رنگ برنگے ٹکڑے، سمندر کی سطح پر ٹوٹے گنبدوں اور میناروں اور خطاطی کے گڈمڈ حرفوں میں ایک ایسی کہانی تحریر تھی جسے صرف بابا ابوسلام کی آنکھیں پڑھ سکتی تھیں۔ وہ ساحل پر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد سمندر کی طرف منہ کیے کھڑے نظر آئے۔

ہم سب پناہ گزینوں کے لیے بنائی جانے والی صلیب احمر کی انتظار گاہ میں کچھ دیر ٹھہرے اور پھر آگے چل پڑے، کیوں کہ سرکاری اہلکاروں نے اعلان کیا تھا کہ کوئی وہاں ٹھہر نہیں سکتا اور پناہ گزینوں کو اپنے ناموں کے اندراج کے لیے رجسٹریشن سینٹر تک جانا ہوگا جہاں انھیں اپنے سفر کے بارے میں ساری معلومات فراہم کرنا ہوں گی۔ ناموں کے اندراج کے بغیر پناہ گزینوں کو اگلی منزل تک جانے کی اجازت نہیں۔

ناموں کے اندراج کا دفتر بڑی دور تھا جہاں پیدل چل کے جانا تھا۔ انتظار گاہ خالی ہوگئی تھی اور لوگ سمندر کے کنارے کنارے جلوس کی شکل میں ادھر جا رہے تھے۔ طلحہ چچا دیوانے کو کندھے پر بٹھائے سب سے آگے چل رہا تھا۔ حنان ام خلفان کا عبایہ تھامے تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

رجسٹریشن آفس کے باہر پہلے سے اتنا ہجوم تھا کہ اندر جانے میں بہت دیر لگ رہی تھی۔ لہٰذا تھکے ماندے لوگ باہر ہی زمین پر چادریں بچھا کے بیٹھ گئے۔ جو لوگ اپنے ناموں کا اندراج کرا چکے تھے وہ بھی فی الفور آگے نہیں جا سکتے تھے، کیوں کہ پناہ گزینوں کے لیے جن بسوں کا انتظام کیا گیا تھا ان کا پہلے سے ٹکٹ خریدنا ضروری تھا اور یہ ٹکٹ رضا کاروں کے دفتر سے مل سکتے تھے۔ بسوں کے بعد ریل گاڑی کے سفر کا بھی انتظام تھا، مگر اس کے لیے بھی پہلے سے ٹکٹ خریدنا لازمی تھا۔

علی احمد نے سرکاری دفتر میں ناموں کا اندراج کرانے کے بعد بچوں کو میرے سپرد کیا اور خود بس کے ٹکٹ لینے چلا گیا۔ میں حسن اور رباب کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے ایک ٹوٹی منڈیر پر بیٹھ گئی جہاں ام خلفان پہلے سے حنان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ طلحہ کو چچا دیوانے کے لیے کہیں سے ایک ٹوٹی پھوٹی وھیل چیئر مل گئی تھی۔ اس نے انھیں ہمارے قریب بٹھا کے کہا، ''میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔'' پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہجوم میں گم ہوگیا۔

راستے میں کھانے پینے کے سامان کی بڑی کمی تھی۔ کہیں کہیں کوئی سڑک چھاپ ہوٹل والا ترس کھا کے پناہ گزینوں میں سوکھی ڈبل روٹیاں بانٹ دیتا تو کبھی کبھی کسی قریبی گھر سے پانی کی بوتلوں اور بسکٹوں کے ڈبوں کی کمک آ جاتی۔ اب کسی کے پاس کچھ بھی کھانے کو باقی نہ رہا تھا، اس لیے بہت سے لوگ پہلے اس مسئلے کو حل کرنے نکلے تھے۔

شام ہوگئی اور سردی بڑھنے لگی مگر رجسٹریشن آفس کے باہر ہجوم کم ہونے پر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کسی نے ایک رضا کار کو قریب پا کے شکایت کی، ''مجمع تو کم ہونے کے بجائے بڑھا ہی جا رہا ہے۔''

''کیسے نہ بڑھے؟'' رضا کار نے جواب دیا۔ ''کشتیوں پر کشتیاں جو آ رہی ہیں پناہ گزینوں کی۔''

رجسٹریشن آفس بند ہونے سے پہلے کچھ سرکاری اہلکار باہر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں سرکاری رجسٹر تھے اور وہ لوگوں میں گھل مل کے ان کے کوائف اپنے رجسٹر میں درج کر رہے تھے۔

نام؟ کہاں سے آئے ہیں، کہاں جانا ہے؟

کہاں جانا ہے؟

کہاں جانا ہے؟

اس سوال کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔

خاکی وردی والے ایک سرکاری کارندے نے دور سے عورتوں اور بچوں کی قطار میں وھیل چیئر پر بیٹھے چچا دیوانے کو دیکھا تو لپک کے ان کے پاس آیا۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' اس نے رجسٹر کھول کے قلم سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

چچا دیوانے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر تنک کے بولے، ''وہیں، جہاں جانا ہے۔''

''وہیں کہاں؟'' سرکاری کارندہ چڑ کے بولا، ''آخر کوئی نام بھی ہے اس جگہ کا؟''

''کیوں نہیں۔'' چچا دیوانے نے کہا۔ ''حبشہ کہتے ہیں اسے، ہمیں حبشہ جانا ہے — حبشہ!''

''کیا؟'' سرکاری کارندہ لمحے بھر کو بھونچکا رہ گیا پھر سر کھجاتا ہوا واپس چلا گیا۔

میں نے دیکھا، ناموں کے اندراج کا دفتر بند ہو چکا تھا اور اس کے باہر کھڑے لوگ منتشر ہو رہے تھے۔ علی احمد، طلحہ اور دوسرے بہت سے لوگ آگے جانے کے لیے بس اور ریل کے ٹکٹ لے کر اب تک واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے دیکھا ابوسلام پھر سمندر کی طرف منہ اٹھائے کھڑے تھے۔

شاک تھراپی

مہتاب عالم پرویز
(کویت)

''ڈیڈ کاش! آپ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ایسا نہیں ہے کہ میں تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی یا تعلیم کے زیور کو آراستہ کرنا نہیں چاہتی میری بھی خواہشیں ہیں کہ میں بھی اعلی سے اعلی تعلیم حاصل کروں لیکن میں بھی مجبور ہوں میں ممی کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے اپنے شہر سے دور جاؤں گی۔ اور ابھی میری عمر ہی کیا ہوئی ہے۔؟ پڑھنے کے لئے ابھی میری ساری زندگی پڑی ہے۔''

آپ اپنی ممی کی فکر نہ کریں آپ کی ممی کی دیکھ ریکھ کے لئے میں ہوں نا۔ آپ کو اپنی ممی سے جتنا پیار ہے اُس سے بھی کہیں زیادہ میں اُن سے محبت کرتا ہوں اس بات کا یقین آپ کو یقیناً ہوگا۔ میں نے ڈاکٹر زین سے ان تمام سلسلوں میں باتیں کر لی ہیں۔ ڈاکٹر زین نے کہا ہے کہ خاص طور پر اپنے میڈیکل کے تعلقات کی بنیاد پر ایک بہت ہی مشہور اور قابل PHYSIOTHERAPIST کا انتظام کر دیں گے اُن کے آجانے کے بعد آپ کی ممی کو نہ ہی کوئی تکلیف ہوگی اور نہ ہی آپ کی پڑھائی کی راہوں میں کوئی بھی پریشانیاں حائل ہوں گی۔

واقعی ڈاکٹر انکل نے ایسا کہا ہے تو میں ضرور گرلس ہاسٹل میں ایڈمیشن لے لوں گی۔

دوسرے روز ہی ڈاکٹر انکل آنے والے تھے اور اُن کے ساتھ ہی PHYSIOTHERAPIST شیلا اگروال بھی آئیں گی ایسا ہی کچھ ڈیڈ نے بتایا تھا۔

صبح ہوتے ہی گھر کے نوکر چاکر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے صدر دروازے سے لے کر اندر کے تمام دروازے اور کھڑکیوں کا ایک ایک پردہ تبدیل کیا جا رہا تھا۔ بستر کی تمام چادروں کی جگہ سفید رنگ کی چادریں بچھائی جا رہی تھیں۔

سفید رنگ کی چادروں پر جب میری نظر پڑی تو نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ممی شاید اب اس دُنیا میں نہیں رہیں ایک عجیب سی بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا، دوڑتی ہوئی جب میں ممی کے کمرے میں پہنچی تو دیکھا ڈیڈ، ممی کو اپنی بانہوں میں لئے اپنے ہاتھوں سے انگور کھلا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسکرائے بھی جا رہے ہیں۔ اور ایسے میں، میں ڈیڈ کی بانہوں میں جھول گئی اور بے اختیار میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ تھوری دیر ٹھہر کر میں وہاں سے لوٹ آئی تھی۔ اور میرے لوٹ آنے کے بعد ڈیڈ بھی لان میں لوٹ آئے تھے۔ جہاں گھر کے نوکر چاکر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے.....

ہال اور کمروں میں بچھی ہوئی کارپیٹ کو لپیٹ کر اُس کی جگہ نئی نئی کارپیٹ بچھائی جا رہی تھیں۔ لان میں پھیلے ہوئے ڈھیر سارے پھولوں کے پودوں کو اِدھر سے اُدھر منتقل کیا جا رہا تھا۔ کوئی پھولوں کے پودوں کی آبیاری کر رہا تھا تو کوئی پرانے گملوں کو لال رنگوں سے رنگ رہا تھا اور کوئی درختوں کی شاخوں سے لے کر اُن درختوں کے نچلے حصّوں تک پانی کے پھواروں سے اُن تمام جگہوں تک پانی پہنچا دینے کی کوشش کر رہا تھا جہاں وقت کی دھول نے اپنی موٹی سی پرت جما دی تھی۔ اور اُس کے ساتھ ہی ڈیڈ بھی اُن تمام نوکروں کو ڈائریکشن دے رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسکراتے بھی جاتے تھے آج برسوں بعد میں نے ڈیڈ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

''ڈیڈ کیا بات ہے آج آپ بہت خوش ہیں۔؟''

''خوش کیوں نہ رہوں۔ آپ کی ممی کے لئے میں نے PHYSIOTHERAPIST شیلا اگروال کا انتظام جو کر لیا ہے۔

لیکن آج گھر کے نظام میں کافی تبدیلیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ اور اُس کے ساتھ آپ بھی آج بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہیں۔؟ ڈیڈ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔؟؟

آپ یہ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ آج آپ کے ڈاکٹر انکل آنے والے ہیں اور اُس کے ساتھ ہی PHYSIOTHERAPIST شیلا اگروال بھی آ رہی ہیں۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر زین نے بتایا ہے کہ شیلا اگروال کافی صفائی پسند ہیں۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ اُن کے آنے کے بعد کسی بھی طرح کی پریشانی ہو اور بعد میں ہمیں مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

''او کے ڈیڈ یو آر رائٹ، بٹ۔؟''

''بٹ.....منس.....وہاٹ آر یو سیئنگ۔؟''

''شیلا اگروال واقعی ایک کامیاب PHYSIOTHERAPIST ہیں تو میں بھی یہ دیکھنا چاہوں گی کہ میری ممی کتنے دنوں میں وہیل چیئر سے آزاد ہو جائیں گی اور وہ دن میری زندگی کا ایک خوشیوں بھرا دن ہوگا۔''

میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ممی یقیناً چلنے پھرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

شام ہونے تک گھر کا سارا کام مکمل ہو چُکا تھا ڈیڈ نے آنے والے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے کھانے کے ڈھیر سارے ڈش بھی تیار کروا لئے تھے۔ اور اب ڈاکٹر زین اور شیلا اگروال کے آنے کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ لان میں رینگتی ہوئی تیز روشنی قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ڈیڈ نے کہا کہ شاید وہ لوگ آ گئے اور وہ اُٹھ کر باہر جانے لگے میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے صدر دروازے تک چلی آئی تھی۔

ڈاکٹر زین کو میں اچھی طرح سے پہچانتی تھی کیونکہ اُن کا آنا جانا یہاں

پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا جب سے ممی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ڈاکٹر زین اس گھر کے لئے ڈاکٹر انکل بن کر رہ گئے تھے۔

میں ابھی ڈاکٹر انکل سے مخاطب ہونا چاہ ہی رہی تھی کہ اُن کے ساتھ آئی ہوئی شیلا اگروال نے مجھے اپنی گود میں اُٹھالیا تھا۔

''آپ شیلا آنٹی ہیں نا۔؟''

''آپ کو کیسے معلوم کہ میں ہی شیلا آنٹی ہوں۔؟''

ڈیڈی ان دنوں آپ کا ذکر کچھ اس طرح سے کرنے لگے تھے کہ آپ کو پہچاننے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔آپ بہت اچھی ہیں۔

''وہ تو میں ہوں لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اچھی ہوں۔؟''

''آپ کے جوڑے سے اُٹھتی ہوئی یاسمین اور بیلے کی ملی جُلی خوشبوؤں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔آیئے میں آپ کو اپنی ممی کے پاس لے چلتی ہوں۔آپ میری ممی کو ٹھیک کر دیں گی نا۔؟''

''کیوں نہیں۔میں آئی ہوں اسی کام کے لئے۔؟''

''ممی دیکھیں کون آئی ہیں۔''

''کون۔''

''ہیلو۔''

''میں شیلا اگروال ہوں PHYSIOTHERAPIST شیلا اگروال۔''

آپ آگئیں.....روز ہی آپ کی ڈھیر ساری باتیں مجھے سمن کے ڈیڈی سُنایا کرتے تھے۔میں بھی آپ سے ملنے کے لئے بے تاب تھی،لیکن میں اس قابل کہاں کہ دو قدم بھی چل سکوں۔میں اپنی زندگی میں اپنے ان قدموں سے چل بھی پاؤں گی یا نہیں۔؟''

''کیوں نہیں چل پائیں گی آپ کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی میں نے آپ کے سارے رپورٹ دیکھ لئے ہیں اور تب ہی میں نے اس کیس میں ہاتھ ڈالا ہے۔آج ہی سے آپ کا TREATMEN شروع ہو جائے گا اور کل صبح سے PHYSIOTHERAPY کا کورس بھی، ساری MEDICINE بھی میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ DONT CARE ABOUT IT

صبح ہوتے ہی ممی کو ہاف بوائل واٹر سے نہلا کر فریش کر دیا گیا تھا۔اٹیچ باتھ روم سے فریش ہو کر ممی جب سفید کپڑوں میں ملبوس بیڈ روم میں لائی گئیں تو میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ تھی اس بیچ ڈیڈی کے ایڈوائز پر گھر کے نوکروں نے PHYSIOTHERAPY کے سارے لوازمات جو بیڈ روم میں رکھے جانے کے لائق تھے ترتیب کر دئے تھے اور باقی کے انسٹرومنٹس باہر لان میں لگا دئے تھے۔

ممی ناشتے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ دوائیاں اور انجکشن کا DOSE بھی دیا جا رہا تھا۔اُس وقت ممی کا بیڈ روم کسی اسپتال کے کمرے سے کم نہیں لگ رہا تھا ان ساری تیاریوں کو دیکھ کر میں بے حد خوش تھی اور بار بار کبھی ممی کی طرف تو کبھی شیلا اگروال کی طرف دیکھتی اور پھر ڈیڈی کی بانہوں میں جھول جاتی جو بیڈ روم میں لگے ہوئے صوفے پر بیٹھے ہوئے شیلا اگروال کی PHYSIOTHERAPY کو دیکھ رہے تھے۔

ڈیڈ نے مجھے اپنی گود میں بیٹھالیا اور بڑے ہی پیار بھرے انداز میں پوچھا۔''سمن بیٹا کیسی ہیں آپ کی شیلا اگروال۔؟''

''ویری نائس ڈیڈ۔''

اگر آپ اپنی ممی کو چلتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں تو،بس اس بات کا خیال رکھیں گی کی آپ شیلا اگروال کو فولو کریں گی۔

او کے ڈیڈ،اور جب ممی چلنے لگیں گی تو میں ممی اور آپ کے ساتھ ٹور پر چنئی سمندری ساحلی علاقوں پر گھومنے جاؤں گی اور ایسے موقعے پر شیلا اگروال بھی ہوں گی آپ پرومس کریں ڈیڈ کے آپ ہم سبھوں کو چنئی لے جائیں گے۔

''پرومس۔''

شیلا اگروال کے آجانے سے گھر کا ماحول ایک دم تبدیل ہو گیا تھا۔ جیسے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری پڑی ہوں۔ پورا گھر پہلے سے کہیں زیادہ صاف ستھرا رہنے لگا تھا ڈیڈ،ممی سے اور بھی زیادہ پیار کرنے لگے تھے۔لان میں پھولوں کی کیاریوں میں نئے نئے ڈیزائین کے پھول کھل آئے تھے جیسے ہر طرف بہاریں مسکرا رہی ہوں۔

لیکن یہ خوشیاں زیادہ دنوں تک اپنا وقار قائم نہ رکھ سکیں۔ میرے اندر بہت اندر سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا جا رہا تھا جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا اور میرے اندر تجسس بڑھتا ہی جا رہا تھا،میرے اندرون میں اُٹھنے والا ہر سوال ڈیڈی کے دلوں میں ایک طوفان اُٹھا دیتا تھا۔

رات گئے جب ممی کو کھانسی ہونے لگی تھی اور میری آنکھیں کھل گئی تھیں اور ایسے وقت میں جب میری بانہوں نے آپ کو تلاش کیا تھا اُس وقت آپ اپنے بستر پر موجود نہیں تھے اور جب میں نے آپ کو آوازیں دیں تو مجھے مایوسی ہوئی۔اور جب ممی کو پانی پلا کر میں نے آپ کو تلاش کیا تو شیلا اگروال کے کمرے میں سے آتی ہوئی سرگوشیوں نے میرے قدم روک لئے تھے۔اور جب میں نے سرگوشیوں کا تعاقب کیا تو دیکھا شیلا اگروال بالکل نیوڈ ہیں اور آپ.....

آخراتنی رات گئے آپ اُن کے کمرے میں کیا کر رہے تھے۔

''وہ بیٹا میں اپنی PHYSIOTHERAPY کروا رہا تھا۔''

لیکن جب ممی کی PHYSIOTHERAPY ہوتی ہے تو شیلا اگروال کپڑوں میں ہوتی ہیں اور ممی بھی.....

ڈیڈی آپ اپنی PHYSIOTHERAPY کے لئے ڈاکٹر انکل سے کہہ کر کوئی (PHYSIOTHERAPIST (MALE کا انتظام

کیوں نہیں کر لیتے۔؟

ہاں بیٹے میں ایسا ہی کروں گا۔

یہ ساری باتیں جب میں نے ممی کو بتائیں تو اُن کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

ممی ڈیڈی تو چلتے ہیں پھر وہ شیلا اگروال سے PHYSIOTHERAPY کیوں کروا رہے تھے۔

اور ممی نے کہا تھا کہ ہاں بیٹے آپ کے ڈیڈ کو بھی بیک پین ہوتا ہے۔

ان دنوں میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈیڈ کے چہرے پر غصے کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے اور شیلا اگروال مجھے پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگی تھیں۔

شیلا آنٹی اپنے ڈیڈ تو چلتے پھرتے ہیں تو پھر آپ ڈیڈ کی PHYSIOTHERAPY کیوں کرتی ہیں۔

آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں آپ کے ڈیڈ کی PHYSIOTHERAPY کرتی ہوں۔

ڈیڈ نے، اور پھر میں نے کی ہول سے دیکھا تھا کہ آپ ڈیڈی کی PHYSIOTHERAPY کر رہی تھیں اور آپ بالکل نیوڈ تھیں اور ڈیڈ بھی.....لیکن جب آپ ممی کی PHYSIOTHERAPY کرتی ہیں تو آپ کپڑوں میں ہوتی ہیں ایسا کیوں.....

شیلا اگروال ایک دم خاموش تھیں.....

ممی نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کہا کہ میں نے کہا تھا نہ کہ آپ کے ڈیڈ کو بیک پین ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ بھی اپنی PHYSIOTHERAPY کرواتے ہیں۔

لیکن ایسا کہتے کہتے ممی نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا تھا اور کافی دیر تک رونے اور سسکنے کی آوازیں کمرے کے اُداس ماحول کو اور بھی اُداس کرنے لگی تھیں۔

شیلا اگروال کو یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہونے جا رہے تھے اس تین ماہ میں آج میں نے ممی کو کافی افسردہ دیکھا تھا اور ویسے بھی وہ ان دو چار دنوں میں پہلے سے کہیں زیادہ کمزور ہوگئی تھیں اُنہوں نے ڈیڈ کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

شیلا اگروال جب بھی اُن کے پاس آتیں تو وہ یہی کہتیں مجھے اپنی PHYSIOTHERAPY نہیں کروانی ہے۔ جاؤ تم جس مقصد کے لئے یہاں آئی ہو اور جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے جاؤ اُس شخص کی PHYSIOTHERAPY کرو، تمہیں شرم نہیں آئی کہ وہ شخص شادی شدہ ہے اور ایک بیٹی کا باپ بھی ہے۔ تم چلی کیوں نہیں جاتی یہاں سے۔ اور اُس کے ساتھ ہی وہ زار و قطار رونے لگیں.....

لیکن شیلا اگروال ایک دم خاموش تھیں.....

یہ سب کچھ جس وقت ہو رہا تھا اُس وقت رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اور اُن کی سسکیاں تھیں کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

نہ جانے کب میری آنکھیں لگ گئیں.....

اچانک کھانسی کی مسلسل آوازوں نے مجھے اُٹھنے پر مجبور کر دیا میں نے جب آنکھیں کھولیں اور میری بانہوں نے اپنے ڈیڈ کو تلاش کیا ڈیڈ اپنے بستر پر موجود نہیں تھے میں نے کمرے کا لائٹ آن کر دیا تو دیکھا ساری دوائیاں کمرے کے فرش پر پھیلی ہوئی تھیں میں نے جب گھڑی کی طرف دیکھا رات کے ڈھائی بج رہے تھے اُس وقت تک ممی بستر پر بیٹھیں مسلسل کھانس رہی تھیں اور جب میں پانی کا گلاس لے کر کمرے میں لوٹی، لیکن ممی کمرے میں موجود نہیں تھیں اور اُن کا وہیل چیئر کمرے میں ہی پڑا ہوا تھا میں اُنہیں تلاش کرتی ہوئی جب شیلا اگروال کے کمرے کے پاس پہنچی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوگئی کہ ممی دیوار کے سہارے چل کر جا رہی ہیں شیلا اگروال کے دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے کی ہول سے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور جب مطمئن نہیں ہوئیں تو دو قدم اور چل کر کھڑکی کے قریب آگئیں اور کھڑکی کے پردے کو سرکا کر اندر دیکھنے لگیں اور چیخنے چلانے لگیں.....

لیکن وہاں کمرے کے اندر کوئی بھی تو نہ تھا۔

اور میں برآمدے میں موجود PHYSIOTHERAPIST شیلا اگروال کی بانہوں میں جھولی اپنے ڈیڈ کے ساتھ ممی کی موویٰ تیار کر رہی تھی.....

۔ الامان الحفیظ ۔

پاکستان کی قومی، صوبائی اسمبلی کے مقدس اور منتخب ارکان کی تعداد ایک ہزار اکسٹھ (1061) بنتی ہے۔ ہمارے منتخب اور مقدس نمائندے قوم کی غم خواری میں فی کس ماہوار تنخواہ ایک لاکھ بیس ہزار، دو لاکھ اجلاس کا خرچ، ایک لاکھ ماہانہ دفتر کا خرچ، ایک لاکھ چالیس ہزار سفری خرچ (مع بزنس کلاس، پانچ افراد بطور معاون ساتھ رکھنے کی اجازت) گورنمنٹ ہاسٹل فری۔ پچاس ہزار یونٹ بجلی فری۔ سولہ لاکھ روپے ٹیلی فون کی مد میں وصول۔ اس کے علاوہ چھ ہزار روپے فی کلو میٹر سفری الاؤنس جو تقریباً تین کروڑ بیس لاکھ کے قریب بنتا ہے۔

اے میرے ارضِ پاک کے بیس کروڑ لوگو! اس حساب سے آپ اپنے ایک منتخب نمائندے پر سولہ کروڑ فی کس کے بھاری اخراجات کر رہے ہیں۔ اور یہ تخمینہ جب ایک ہزار اکسٹھ پر مشتمل ہوتا ہے تو اس کی مالیت سالانہ 69 ارب 76 کروڑ بن جاتی ہے اور پانچ سالوں میں یہ رقم بڑھ کر ایک سو ستر ارب روپے ہو جاتی ہے۔ الامان الحفیظ۔ الامان الحفیظ۔

''مسیحائی کا دعویٰ''

محمود الحسن
(راولپنڈی)

جب جلوہ فِگن وہ رُخِ زیبا نہیں ہوتا
مایوس کبھی دیدۂ بینا نہیں ہوتا

ہوتا نہیں کب شاملِ گریہ دلِ بیتاب
کب اشک مرا خُون کا دریا نہیں ہوتا

کرتے نہیں کب آپ مسیحائی کا دعویٰ
بیمارِ محبت ہے کہ اچھا نہیں ہوتا

ہوتے نہیں ہم اُن کی ملاقات سے نومید
عشّاق سے کب وعدۂ فردا نہیں ہوتا

ہوتی نہیں کب یاد تمہاری مرے دل میں
تنہا بھی میں ہوتا ہوں تو تنہا نہیں ہوتا

اس طرح وہ ہوجاتے ہیں ہر شے میں نمودار
پردہ بھی جو کرتے ہیں تو پردہ نہیں ہوتا

دعوے تو محبت کے بہت ہوتے ہیں لیکن
الفت کا کوئی رنگ ہویدا نہیں ہوتا

محمودؔ تو رہتا ہے اُسی نقطہ میں سرشار
جو نشہ کہ مِنّت کشِ صبا نہیں ہوتا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

محبت یاد آتی ہے وفائیں یاد آئیں
میں بوڑھا ہوں مجھے ماں کی دعائیں یاد آئیں

ہمیں بھولے ہوئے تھے ماہیے کے بول لیکن
پرانے گیت اکثر گنگنائیں، یاد آئیں

میں اپنے حال کے سارے ضوابط بھول بیٹھا
گذشتہ زندگانی کی خطائیں یاد آئیں

بہت مشکل ہوا ہے جان و دل کا بھول جانا
کہو اُن سے پلٹ کر گھر کو آئیں، یاد آئیں

بڑھاپے میں بھی آنکھوں سے بہا جاتا ہے بچپن
ہمیں بچّوں کی صورت اپنی مائیں یاد آئیں

نہیں بھولا میں اپنے گاؤں کے آداب ثاقبؔ
گھروں میں رہنے والوں کی حیائیں یاد آئیں

○

غالب عرفان
(کراچی)

کبھی شعور کبھی لاشعور تک دیکھا
بکھر کے میں نے بہت دود دور تک دیکھا

تلاش مجھ کو کیا کائنات نے میری
مرے سفر نے مجھے کوہِ طور تک دیکھا

وہ سر ورق تھا کہ چہرہ اسی کو پڑھتا رہا
کتاب کھولی نہ بین السطور تک دیکھا

مآلِ صبح میں بھی اکتسابِ شام کی دھند
مشاہدات نے ظلمت سے نور تک دیکھا

ہر ایک لمحے کی صنعت گری کہاں تک ہے
نگاہِ وقت نے یومِ نشور تک دیکھا

یہ گام گام زمین کی بہشت عرفان ہیں
خیال و خواب کی دنیا نے حور تک دیکھا

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

عمر بھر حسینوں کے جھرمٹوں میں کھیلی ہے
عمر کی ڈھلانوں پر، زندگی اکیلی ہے!

کس کی شوخ نظروں کو چھو کر آ رہی ہے تُو؟
اے مِری نظر! تیری ہر ادا نویلی ہے

اب تو اُس تعلق کو پھر بحال کر دیجیے
اب تو ہم نے ہر تہمت اپنے سر پہ لے لی ہے!

وجہِ فخر ہے مجھ کو یہ زرا سا رشتہ بھی
ورنہ اس زمانے میں کون کس کا بیلی ہے؟

روز نقش بنتے ہیں اور مٹتے رہتے ہیں
''زندگی کھلونا ہے۔ موت اک پہیلی ہے''

اب توں فلک! ہم کو دادِ سخت جانی دے
ہم نے ہر بلا تیری، مسکرا کے جھیلی ہے

گونجتے تھے کل اِس میں قہقہے حسینوں کے
آج خستہ و ویراں، چاندؔ! جو حویلی ہے

○

قیصر نجفی
(کراچی)

حرف سے حرف تک چلا ہوں میں
کیا کہوں کتنا تھک گیا ہوں میں

پڑھ سکوں تو کبھی پڑھو مجھ کو
پانیوں پر کہیں لکھا ہوں میں

جب بھی تم چاہو مجھ کو طے کر لو
مختصر سا تو فاصلہ ہوں میں

فیصلہ کیا ہو دیکھئے خود اب
اپنی فریاد سن رہا ہوں میں

تو ہی اے طاقِ زندگی بتلا
بجھ گیا ہوں کہ جل رہا ہوں میں

تتلیوں میں بہت ہی رنگ مگر
وہ نہیں ہیں جو ڈھونڈتا ہوں میں

کیا کسی کو سنائی دوں قیصؔر
ایک خاموش سی صدا ہوں میں

○

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

کب اُس کو مجھ سے آنکھ ملانے کی تاب ہے
میں جانتا ہوں کتنا وہ عزت مآب ہے

غنچہ دہن عجب ہے وہ منہ کھولتا نہیں
آبِ حیات اپنی جگہ خود سراب ہے

پیدا ہوئی کتاب کرائے کی کوکھ سے
بے اہلیت ہے پھر بھی وہ اہلِ کتاب سے

ایسا نہیں تو سامنے آنے سے مت جھجک
چہرہ کہاں ہے چہرے پہ خالی نقاب ہے

تسکینِ جسم و جاں ہے ایقان و آگہی
تشکیک کیا ہے ایک مسلسل عذاب ہے

میری شراب اور ہے، پیرِ مغاں ہے اور
میرے لیے نہیں ہے جو تیری شراب ہے

اب تو رؤف خیر کی پہچان ہے یہی
حق گوئی ہے خراب تو یہ بھی خراب ہے

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

(عیدالفطر پر دہشت گردی کے تناظر میں)

ہم سے دِل زدگاں کی عید؟
کیسی عید، کہاں کی عید!

موسمِ گُل کے ماتم میں
گلشن میں ہے خزاں کی عید

مقتل چاروں اَور سجے
خوب ہے شہرِ اماں کی عید

لاشیں اور جنازے تھے
اب کے ہم نے کہاں کی عید

گاؤں جا نہیں پایا مَیں
کیسی ہو گی ماں کی عید!

اُس نے اُداسی ہی دیکھی
جب میرے گھر جھانکی عید

پوچھو مت مُفلِس کا حال
عید پہ اُس نے پھانکی عید

شہر کی عیدیں خوب سہی
لیکن اپنے ''گِراں'' کی عید!

اپنی عید کہاں ویسی
جیسی سارے جہاں کی عید

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

چمن میں پھول کا رشتہ ہے جیسے خار کے ساتھ
خزاں بھی اس طرح وابستہ ہے بہار کے ساتھ

جو میرِ کارواں کے بھیس میں ہوئے ظاہر
ہوا میں جذب ہوئے گردِ رہگزار کے ساتھ

یہ اُس پہ منحصر ہے آئے یا نہ آئے وہ
ہے میری ہر نظر رستے پہ انتظار کے ساتھ

بغیر اُس کے ہر موسم خزاں کا موسم ہے
گئیں بہار کی رنگینیاں بہار کے ساتھ

نہیں ہے ایک ہی نقطے پہ زندگی مرکوز
ہیں اور مسئلے بھی فکرِ روزگار کے ساتھ

رواں دواں ہوں رہِ حق پہ میں بھی مدت سے
مرا بھی گہرا تعلق ہے اہلِ دار کے ساتھ

یہ سوچ کر کہ زمانہ ہے کسقدر مصروف
ہر ایک بات میں کرتا ہوں اختصار کے ساتھ

ادب میں اس طرح ملتے نہیں ہیں اعزازات
ہے ربط لازمی کچھ اہلِ اقتدار کے ساتھ

مرے لیے نہیں اعزاز سے یہ کم اے عرشؔ
کٹی ہے زندگی میری بڑے وقار کے ساتھ

○

کرامت بخاری

(لاہور)

دل میں رہتے ہیں کچھ یگانے بھی
اس خرابے میں ہیں خزانے بھی

دفترِ دہر پڑھ کے دیکھ لیا
کچھ حقائق تھے کچھ فسانے بھی

کچھ تو مشکل تھا زندگی کا سفر
کچھ بنائے گئے بہانے بھی

اوّل اوّل تھے گھر قفس کی طرح
آخر آخر ہیں آشیانے بھی

تم جدا ہو کے جس جگہ سے گئے
رُک گئے ہیں وہاں زمانے بھی

سچ کی سنتا نہیں یہاں کوئی
اُس پہ طرّہ کہ تازیانے بھی

اب کرامتؔ الجھتے جاتے ہیں
میری سوچوں کے تانے بانے بھی

○

اشرف جاوید

(لاہور)

ظاہر ہوئے آثار کسی اور طرح سے
گرنے لگی دیوار کسی اور طرح سے

کیا جانیے اِس بار نمایش میں ہے کیا کیا!
پھرتے ہیں خریدار کسی اور طرح سے

پایا اُسے ہر بار کسی اور طرح کا
جانا اُسے ہر بار کسی اور طرح سے

ہے فخر کہ مقتل سے سلامت نہیں آئے!
دیکھا جو، خبر دار! کسی اور طرح سے

ہم لوگ زمانے کے تسلسل میں رہیں گے
کل ہوں گے نمودار کسی اور طرح سے

ہم پیار کے مادھو ہیں، ہمیں پیار سے جیتو!
مانیں گے نہیں ہار کسی اور طرح سے

حالات کا رُخ دیکھ کے چلتی ہیں ہوائیں!
کھلتا ہے درِ یار کسی اور طرح سے

اِس ترکِ تعلّق میں بھی قائم ہے تعلّق!
بیٹھے ہیں گرفتار کسی اور طرح سے

کیا درد ہے؟ کس طور سے ڈھلتا ہے غزل میں!
رَہ پاتا ہے اِظہار کسی اور طرح سے

○

کھوج کا سفر

عذرا اصغر
(کراچی)

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میرے اعصاب پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ میرا مجلّہ پریس جا چکا تھا اور میں چند دنوں کے لیے مطمئن ہو کر فارغ بیٹھی تھی۔ تبھی مجھے ڈاک سے جمال درانی کا وہ خط ملا جس میں اس نے اپنے گمشدہ بھائی کو ڈھونڈنے کا ذکر ایسے موثر انداز میں کیا تھا کہ میں پگھل گئی اور اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنے رسالے میں اس کے بھائی کی گمشدگی کا اشتہار لگا دوں۔ ساتھ ہی اس نے بھائی کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ مسکراتا ہوا ایک وجیہہ نسبتاً کم عمر نوجوان شمس آغا۔ جمال درانی کے مطابق شمس آغا ایک دن ایسا گھر سے نکلا کہ پھر واپس نہیں لوٹا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں مگر جمال درانی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ میں نے اپنے مجلّے کا اگلا شمارہ شمس آغا کے گوشے کے لیے مختص کر دیا۔ جمال میرے اس اقدام پر بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے شمس آغا کے افسانوں کا مجموعہ بھی دیا۔ واقعتاً وہ باکمال افسانہ نگار تھا۔ اگر زندہ رہ جاتا تو بہت نام پیدا کرتا۔ ''اندھیرے کے جگنو'' مجموعے کا یہ نام شمس آغا کا ہی تجویز کردہ تھا۔ کیا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اندھیرے میں روشنی پھیلانے والا جگنو ہے؟ جمال نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ طالبعلمی کے زمانے سے ہی اپنی گفتگو میں فلسفہ بولتا تھا۔ وہ دنیا کے بنائے اصولوں سے برسرِ پیکار تھا۔ ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی اور باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ اس کے باپ کی چوتھی شادی تھی جو پے در پے بیویوں کے مرنے کے بعد وہ کرتا رہا تھا۔ شمس کا باپ ایک منصف مزاج اور اصول پرست آدمی تھا اسی سبب سے خاندان مربوط تھا۔ سگے سوتیلے بھائی بہن میں اتفاق تھا لیکن آغا نذیر سے شمس کی خوب بنتی تھی۔ وہ اس کی سب سے بڑی بہن کا بیٹا تھا۔ سگے سوتیلے کا تو فرق تھا ہی نہیں دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ رہتے تھے۔ نذیر کو بھی ادب کا چسکا شمس نے لگایا تھا۔ شمس کہانی لکھتا تھا اور نذیر کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ دونوں اپنی کاوشیں ایک دوسرے کو دکھاتے اور تبادلۂ خیال کرتے۔ انہی دنوں یہ سانحہ رونما ہوا کہ شمس کو اپنی ایک عزیزہ سے محبت ہو گئی۔ جبکہ اسے پتہ تھا کہ وہ خاندانی اختلاف کے باعث اپنی چاہت کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن محبت تو ایک خودرو پودے کی مانند ہے جو پتھروں میں بھی پھوٹ پڑتا ہے۔ اور شمس آغا کے دل کی مٹی تو تھی ہی گداز۔ جمال درانی شمس کی گمشدگی کو محبت کی ناکامی کے خوف سے تعبیر کرتا تھا جبکہ وہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکا تھا مگر نذیر کی بروقت مداخلت پر بچ گیا تھا۔ لہٰذا اس نے گھر چھوڑ دیا اور روپوش ہو گیا۔

میرا مجلّہ پاکستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچتا تھا۔ شمس آغا کے گوشے کے بارے میں دسیوں خط آئے۔ پچاس آراء موصول ہوئیں۔ مگر شمس کا سراغ نہ مل پایا۔ مجھے جانے کیوں اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر شمس کے بارے میں اتنا مواد میرے پاس جمع ہو گیا کہ میں نے پورا شمارہ شمس آغا کے نام وقف کر دیا۔ جمال درانی میرے کافی قریب آ گیا تھا وہ میرا احسان مند ہوتا تھا اور میں زیادہ سے زیادہ شمس کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔ ایک دن جمال نے اس گھر کا ذکر کیا وہ جہاں شمس پیدا ہوا تھا اور بچپن گزرا تھا۔ پھر جائیداد کے بٹوارے میں وہ گھر شمس کے حصے میں آ گیا اور اس پر ''کاشانۂ شمس آغا'' کا بورڈ لگ گیا۔ شمس اور نذیر اکثر وہاں جاتے اور دونوں تک رہتے۔ میں نے وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی تو جمال بہت خوش ہوا اور ایک دن ہم جمال کی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ بل کھاتے پہاڑی راستے، پل پل بدلتا کوہساروں کا منظر سفر کے حُسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہماری گاڑی گھوڑا گلی کے ایک کوہسار کے پہلو میں جا رکی۔ میرے سامنے پہاڑ کے ایک بڑے پتھر پر جلی حروف میں ''کاشانۂ شمس آغا'' کندہ تھا۔ مجھے لگا جیسے ہم سچ مچ اس سے ملنے آئے ہیں اور وہ ہمارے استقبال کے لیے مسکراتا ہوا ہمارے سامنے کھڑا ہے اور ابھی کہہ گا

''بالآخر تو لوگوں نے میرا سراغ لگا ہی لیا''

عجب سے احساس نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ ڈھلتی دوپہر نے پہاڑ پر بادلوں کا سایہ کر رکھا تھا۔ اور کوہسار کی پرکیف فضائی خنکی میرے وجود کو سرور بخش رہی تھی۔ ہوا ایک عجیب سی سرشاری کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر ہم پہاڑ کی بلندی عبور کرتے رہے۔ کچھ موڑ مڑ کر وہ کاٹج نظر آیا جو شمس کا کاشانہ تھا۔ وہ جھلک دکھلاتا اور اگلے موڑ پر چھپ جاتا۔ راستے کے پیچ و خم کاٹتے بالآخر ہم اس تک پہنچ گئے۔ شمس تو ہمیں نہ ملا مگر گھر میں مالی بابا بسیرا کیے ہوئے تھا۔ مگر ایک احساس تھا کہ شمس ہمارے ساتھ موجود ہے۔ انسان فانی ہے مگر روح تو غیر فانی ہے۔ لکڑی کے فرش پر جوتوں کی ٹھک ٹھک بجاتے ہم کمروں میں گھومتے رہے۔ ایک احساس تھا کہ شمس اس گھر میں پیدا ہوا۔ چلنا پھرنا سیکھا۔ اس زمین پر اس کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ ان دیواروں کو اس نے چھوا تھا۔ اس کے سانسوں کی مہک اس گھر میں بسی ہوئی ہے۔ وہ ایک آرٹسٹک ذہن کا مالک تھا۔ تبھی شاید اس کو جائیداد کا یہ حصہ دیا گیا تھا۔ اسے جان لینا چاہیے تھا ناکامی محبت کے ساتھ نتھی ہے۔ اس کا کچا گھڑا ہمیشہ پانی میں بہہ جاتا ہے۔ اسے زندگی مارنی تو نہیں چاہیے تھی۔ کاٹج کے آگے دور تک پھیلا ہوا لان تھا۔ جسے مالی بابا نے پھولوں سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ جمال اس کا نگراں تھا۔ پھلدار پیڑ پھل پیدا کر رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی شمس نہیں تھا مگر اس کے لگائے ہوئے پیڑ موجود تھے۔ مالی بابا بتا رہا تھا کون کونسے درخت خود شمس آغا نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے۔ ایسے ہی ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ہم نے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا۔ وہ فطرتاً عوامی بندہ تھا۔ طبقاتی نظام کا سخت مخالف۔ بابا نے اسے گودوں کھلایا تھا اور اب بابا سمیت اس کے بیٹے

باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

آخری پڑاؤ کا مسافر

حنیف باوا
(جھنگ)

موسم گرما میں انتہائی گرمی ہوتی یا سرد موسم میں ٹھنڈ اپنے پورے جوبن پر ہوتی تو جب سورج اپنی منزلِ مقصود سے دو تین گھنٹوں کی دوری پر ہوتا تو وہ اپنے الگ تھلک کمرے سے ایک خستہ حال کُرسی اٹھاتا اور جنوب کی جانب کی رواں سڑک کی دوسری طرف آ کر بیٹھ جاتا۔ جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا اُس کی پشت پر بنا ہوا مکان صرف ایک کمرے اور ایک چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ وہ مکان کچھ عرصے سے بند پڑا تھا۔ اس میں رہنے والے دو جی بوڑھا اور بڑھیا اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ یہ جاننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کہ اپنے کمرے سے ملحق رہنے والے اُس کے اپنوں کے نزدیک وہ ایک غیر محرم اور نا آشنا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب جب کہ اُس نے اُن اپنوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا یوں کہہ لیجیے کہ وہ لوگ خود اس کی کمزور اور بوڑھی سوچوں کے فرسودہ دائرے میں آنے سے گھبرا دیے تھے۔ جب وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو تو بھلا پھر وہ کیوں اُن لوگوں کے بارے میں سوچتا یا اُن کے بارے میں کسی سے پوچھتا۔ ہاں وہ اتنا ضرور کرتا کہ جب وہ یہاں آ کر بیٹھتا تو سب سے پہلے اُس کی نظریں اُس تالے پر ضرور پڑتیں جو اُس گھر کے بوسیدہ کواڑوں کو آپس میں ملا کر انہیں اپنی مضبوط بانہوں میں جکڑنے کے بعد وہ تالا اُس گھر کی طرف سے بے نیاز ہو کر رہ جاتا۔ اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ تالا اُس کے اپنے اندر کے دروازے کی جکڑ بندیوں کا استعارہ ہو۔

اب جبکہ اُس کی زندگی کی ساتھی اُس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ جب اُس کے بچوں کی ماں نے اس سے روٹھ کر اگلے جہان میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ اُس کے بچوں نے نہ جانے کیوں اُسے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا تھا حالانکہ وہ اب بھی اُن کا وہی والد تھا جس نے کہ اپنی چھوٹی سی ملازمت میں رہتے ہوئے اپنی قلیل سی تنخواہ میں انہیں پال پوس کر جوان کیا، اُنہیں پڑھایا لکھایا۔ اور جب تک وہ کسی کام کے نہیں ہو گئے تھے اُس نے انہیں پیٹ کاٹ کر اُن کی شکم پروری کی۔ انہیں بغیر کسی معاوضے کے بولنا سکھایا، اُس نے انہیں مثبت الفاظ کا اتنا ذخیرہ دیا جو آج تک زندگی کے ہر شعبے میں اُن کی نہ صرف رہنمائی کر رہا ہے بلکہ اُن کو آگے بڑھانے والے راستوں کو منور کرنے کے لیے مددگار بھی ثابت ہوا ہے۔ اتنی کرم فرمائیوں کے باوجود پھر کیوں انہیں اُس کے وجود کی موجودگی سے گھن آنے لگی ہے۔ اُس نے اس بارے متعدد بار سوچا لیکن اُسے ان کا یہ رویہ اُس کی سمجھ سے بالاتر محسوس ہو رہا تھا۔

سب سے بڑا دھچکا اُسے اُس وقت لگا کہ جب شام کے وقت جب وہ سردی سے بچنے کے لیے چولھے کے قریب بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اُس کے پاس پوتے پوتیاں اور بڑا بیٹا اشرف بھی بیٹھا تھا۔ یہ سب لوگ بھی کھانا کھانے میں مصروف تھے اسی دوران بڑے بیٹے نے پہلے اپنی بیگم رضیہ کی جانب بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا تو پھر اُسے نہ جانے کیا سوجھی اُس نے بڑے ہی ترش لہجے میں اس نے کہا ''ابا جی اب آپ یہاں بیٹھ کر کھانا نہ کھایا کریں۔ اب کھانا اور ضرورت کی دوسری چیزیں آپ کے کمرے میں ہی پہنچ جایا کریں گی۔''

یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اُس کے منہ کا نوالہ تو جیسے حلق میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ اس قدر حیران اور پریشان ہوا کہ اُس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے جس کی وجہ سے وہ ایک بھی لفظ کہے بغیر کھانے کو درمیان میں چھوڑ کر وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر تھیں۔ اُس نے قریب پڑی ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہونے کے بعد سوچا۔

بیٹے تم نے مجھ میں ایسی کون سی برائی دیکھ لی تھی کہ تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ وہ تو آج تک اپنی بہو رضیہ کو اپنی بیٹیوں سے بھی بڑھ کر سمجھ رہا تھا۔

کچھ بھی تھا اُس روز کے بعد وہ چولہے کے قریب تک نہیں بھٹکا تھا۔ وہیں پر بیٹھے ہوئے جو کھانا آتا وہ اُسے صبر شکر کر کے کھا لیتا۔ اُس روز کے بعد اس کا وہ چھوٹا سا کمرہ ہی مستقبل ٹھکانہ ٹھہر گیا تھا۔ اب تو بچوں کے ساتھ کھیلنا، اٹھکیلیاں کرنا ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا تھا۔ اب تو یہی کمرا اُس کی کل کائنات تھا۔ قیدیوں کی طرح وہیں پر اس کی ضرورت کی سب چیزیں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے، چند دانت اور داڑھیں جو اس عمر میں باقی بچی تھیں اُنہیں صاف کرنے کے لیے ٹوتھ پیسٹ اور برش اُس کے کمرے کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ نئے جوتے لا کر دیئے گئے تھے۔ ایک خوبصورت چھڑی بیٹوں نے اپنے سہاروں کے نعم البدل کے طور پر اُس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ چھڑی کا سہارا کتنا مضبوط تھا یہ تو اُس کے رعشہ زدہ ہاتھ ہی صحیح طور پر بتا سکتے تھے۔ یہ تمام چیزیں اپنی جگہ لیکن اُس کے لیے ان چیزوں کی بجائے بچوں کے ساتھ کھیلنا، بیٹوں کے ساتھ گفتگو کرنا، بہو کو بیٹی جان کر اُس سے شبنم سے دھلے دو میٹھے بول بول لینا زیادہ ضروری تھا کیونکہ یہ چیزیں اُسے زندگی سے لگاؤ اور اُس سے پیار کے جذبے کو مرنے نہیں دیتیں۔ اب وہ تمام دن خاموشی سے طرح طرح کی سوچوں میں گم رہتے ہوئے کمرے کی دیواروں کو تکتا رہتا لیکن جو پیار اُس کے پوتے پوتیوں کے لیے جاگزیں ہو چکا تھا اس میں کمی نہیں آئی تھی اور وہ انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ترستا رہتا۔ لیکن جب کبھی اُسے موقع ملتا تو وہ گھر کے اندر صحن میں جا نکلتا جہاں وہ ننھے منے بچے پڑھ رہے ہوتے یا آپس میں کھیل میں مصروف ہوتے انہیں نظر بھر کر دیکھنے کے بعد اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور واپس اپنے کمرے میں آ جاتا۔

آہستہ آہستہ وہ تنہائی کے اندھے کنوئیں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس تنہائی سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے کچھ وقت کے لیے یہ

معمول بنالیا تھا کہ جب شام کے تین ساڑھے تین کا وقت ہوتا تو وہ باہر سڑک کے دوسری جانب آ کر بیٹھ جاتا۔ جب اُس کی رفیقہ حیات زندہ تھی وہ وہاں اُس وقت بھی بیٹھتا تھا لیکن کبھی کبھار صرف دل کو بہلانے کے لیے اُن دنوں وہ خود اٹھ کبھی اندر نہیں گیا تھا۔ جب شام کے سائے اندھیرے میں بدلنے لگتے تو صدر دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلتا اور یہ گڑ سے بھی زیادہ میٹھی آواز ہوا کے دوش پر اُس تک پہنچتی۔

''رفیق کے ابّا۔ اب اندھیرا گہرا ہونے لگا ہے۔ اُٹھ جاؤ۔ آ کر کھانا کھالو۔''

یہ سن کر فوراً اس کی نظر نیم وادروازے کی جانب اُٹھتی جب وہ دیکھتا کہ وہاں اُس کی بیوی کھڑی ہے تو وہ وہاں سے اُٹھتا اور سڑک کو عبور کر کے جب وہ اس نیم وادروازے کے اندر چلا جاتا تو وہ دروازہ آہستہ سے بند ہو جاتا۔

لیکن جب سے وہ تنہا ہوا تھا یہ دروازہ بھی اکثر بند رہنے لگا تھا۔ اب وہ میٹھی آواز بھلا کیوں آتی جس کے انتظار میں وہ وہاں دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ اب جب شام کے سائے رات کے اندھیرے میں اُترنے لگتے وہ خود ہی وہاں سے اٹھتا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ جاتا تقریباً پچھلے ایک سال سے اُس کا یہی معمول تھا اب وہ ہمہ وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا جب تک وہ اپنی مخصوص جگہ بیٹھا رہتا اُس کے لب ایک دوسرے میں پیوست رہتے۔ ہاں کبھی کبھار ایک لمحے کے لیے اُس وقت کھلتے جب وہ کسی جوڑے کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیکھتا یا جب کوئی بچہ اپنے والد کی انگلی پکڑ کر اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھتا تو نہ صرف اس کے لب کھلتے بلکہ اُن پر ایک خاص قسم کی کمزوری مسکراہٹ پھیل جاتی اُس کی اس مسکراہٹ میں کبھی بڑی کڑواہٹ ہوتی یا کبھی مٹھاس اور کبھی یہ دونوں ذائقے باہم آمیز ہو کر اُس کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک مخصوص قسم کی کیفیات پیدا کر دیتے جو اُس کے چہرے کے تاثرات کو یکسر بدل کر رکھ دیتی جسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ مزید بوڑھا ہو گیا ہو۔

اسی طرح کئی گرم اور کتنے ہی سرد موسم اُس کے بدن پر ٹھوکے لگاتے ہوئے گزرے لیکن اُس کے معمول میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا۔

آج تو جیسے سرد موسم اُس کے قریب آ کر ٹھہر سا گیا تھا۔ اُسے ایسے لگا تھا جیسے یہ موسم اس کے وجود میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے کمبل کی بُکل کو کئی بار تنگ کیا کئی بار کھینچا لیکن سردی کا احساس کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اب اُس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے کر سوچوں کی دلدل میں اترنے کی کوشش کی لیکن یخ بستہ سردی نے اُسے اس میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب اُس کے ساتھ یہ صورتِ حال تھی تو وہ وہاں سے اٹھ کیوں نہیں گیا۔ وہ کیوں اب بھی آنکھیں بند کیے سر نہوڑے بیٹھا تھا شاید اُس نے کچھ وقت کے لیے سردی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ بدستور آنکھیں موندے ہوئے چپ سادھے بیٹھا رہا کہ اتنے میں اُس کے کانوں میں اُسی بند دروازے کے کھلنے کی آواز پڑی کہ وہ چونک سا گیا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد پھر وہی پرانے شہد سے اٹے ہوئے الفاظ گونجے:

''رفیق کے ابّا۔ اب رات ہونے کو ہے۔ آؤ۔ آ کر کھانا کھالو''

یہ وہی الفاظ تھے جنھوں نے ہمیشہ اُسے اعتبار بخشا اور جنھوں نے اُسے زندگی سے کبھی دُور نہیں ہونے دیا۔ یہ الفاظ اُس کے لیے محبت کے چھوٹے چھوٹے جام تھے جو اُسے ہمیشہ سرشار رکھتے۔ یہ الفاظ سن کر اُس نے گھٹنوں سے سر اوپر اُٹھایا تو دیکھا کہ یہ میٹھے الفاظ ادا کرنے والی ہستی اُس نیم وادروازے میں کھڑی اُس کا انتظار کر رہی ہو۔ جب وہ وہاں سے اٹھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا ماضی حال کے ان خوبصورت لمحوں میں مدغم ہو گیا ہو۔ اب اُس نے فوراً کرسی اُٹھائی اور اس دروازے کی جانب تیزی سے لپکا۔ اُس کے پاس پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ وہ دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اگر اُس کے پٹ کھلے نہیں تھے تو پھر یہ آواز کہاں سے آئی۔ اُس نے سوچا۔ کہیں یہ اُس کا خوبصورت وہم تو نہیں تھا جو ابھی تک یقین کے دائرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

آخر اُس نے اس سوچ کو ادھورا چھوڑا اور کرسی کو مضبوطی سے گرفت میں لے کر ڈگمگاتے قدموں سے آ کر پھر سے اپنے اُس بوسیدہ سے کمرے میں قید ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اُس وقت اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''کبھی اے حقیقت منتظر''

۱۔ ''مادرِ وطن بھارت کی جے'' ۱۸۵۷ء میں عظیم اللہ خان نے یہ نعرہ دیا۔

۲۔ ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' بسمل عظیم آبادی نے ۱۹۲۱ء میں یہ مصرعہ لکھا۔

۳۔ ثریا طیب جی نے بھارت کے ترنگے کو وہ رنگ روپ دیا جو آج نظر آتا ہے۔

۴۔ ''انقلاب زندہ باد'' کے موجد مولانا حضرت موہانی ہیں۔

۵۔ ''بھارت چھوڑو'' کا نعرہ یوسف مہر علی کی ایجاد ہے۔

۶۔ ''جے ہند'' کا نعرہ عابد حسن سافرانی کی دین ہے۔

۷۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' علامہ اقبال کا کلام ہے۔

۔ بصد شکریہ ۔

جناب رونق جمال

دو نیناں

رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

قاضی گنج جانے کی میری ضد سے نیل پریشان ضرور تھا مگر میرا عزم دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ اُسے خوشی بھی ہوئی تھی۔ انسان جب زندگی کا طویل سفر طے کر کے آخری پڑاؤ کی جانب رُخ کرتا ہے تو ماضی کی یادیں سائے کی طرح اُس کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ ماضی کا خوش گوار موسم اکثر ہلکی سی خلش ہلکی سی ٹیس ہلکی سی چبھن بھی ساتھ لاتا ہے۔ سُنبل ایسی خوشبو تھی جس کا ذکر میرے دل کو شادمانی کے ساتھ ساتھ درد میں لپیٹ لیتا۔ میری چھوٹی بہن پریتی کی سہلی جو مجھے پریتی کی طرح ہی عزیز تھی اور جسے میں نے ننھی کلی سے خوبصورت پھول بن کر کھلتے، مہکتے اور اس کے وجود کی خوشبو سے سب کو تر بتر ہوتے دیکھا اور پھر کئی سال بعد جب اچانک قاضی گنج میں دوبارہ اتفاقاً اس سے ملاقات ہوئی تو وہی پھول کملا چُکا تھا مرجھائی پنکھڑیاں ٹوٹ کے بکھر رہی تھیں۔ اُسے دوبارہ دیکھنے، اُس سے ملنے کی خواہش کو میں دبا نہ سکی۔

کار جس رفتار سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اُس سے بھی کہیں تیز رفتار سے میرا ذہن ماضی کا سفر طے کر رہا تھا۔ نیل کا میرے ساتھ ہونا یا نہ ہونا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں آنکھیں موندے سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے ماضی کے سفر میں تھی اور نیل سوچ رہا ہوگا بوڑھی ماں تھک کر سو گئی ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ پُرسکون دکھنے والا چہرہ کن کن راستوں سے گزر رہا ہے۔

میری دادی ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ لڑکی کی شکل نہیں قسمت خوبصورت ہونی چاہیے۔ اُس وقت لگتا تھا کہ جسم کی خوبصورتی ہی سب کچھ ہے۔ سُنبل ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ لاہور کے کھاتے پیتے گھروں میں اُن کے خاندان کا شمار ہوتا تھا۔ پریتی کی دوست ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر اُس کا آنا جانا لگا رہتا۔ بچپن سے ہی بڑی شوخ، چنچل، نرم رو، نرم خو، نرم گفتار، مسکراتی تو پھول جھڑتے کھلکھلا کر ہنستی تو جلترنگ بج اُٹھتے۔ پوری آب و تاب کے ساتھ اُس کی جوانی نے انگڑائی لی تو نہ جانے کتنوں کے دل اُسے دیکھتے ہی دھڑک اُٹھے۔ اُن میں سے ایک دل میرے اکلوتے بھائی کا بھی تھا جو اُس کی کالی کجراری آنکھوں میں ڈوبنے کو بے تاب تھا۔ اُس کی کھلی رنگت، کالی گھنی سیاہ زلفوں اور بھرے بھرے لبوں نے اُسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میں بھی چاہتی تھی کہ یہ پھول ہمارے آنگن میں کھلے مگر اُس کے ماں باپ کو لاہور کے بڑے تاجر کے گھر سے اُن کے اکلوتے بیٹے کا رشتہ آیا تو انہوں نے باقی سب کو نظر انداز کر دیا۔ سولہ سال کی کچی عمر میں ہی ہاتھ پیلے کر کے رخصت کر کے ماں باپ نے سکھ کی سانس لی۔ ابھی ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیکا بھی نہیں پڑا تھا کہ ماں باپ کو بیٹی کے چہرے کے آڑے رنگ نے پریشان کر دیا۔ مہینے میں ہی اُس کے شوہر کیلاش نے اپنا اصلی رنگ دکھا دیا تھا۔ رئیس اکلوتے وارث کے ہر بگڑتے رنگ کُھل کر سامنے آ گئے تھے۔ عیاشی کے جراثیم اس کے اندر اس قدر پیوست ہو چکے تھے کہ معصوم، پارسا، خاندانی، خوبصورت، نوخیز کلی سی بیوی کی خوبیاں بھی اُسے شراب اور بازاری حسن کے رس میں ڈوبنے سے نہ روک سکیں۔ بیوی کے آنسو، ماں باپ کا غصہ، ساس سُسر کی دھمکی سب بے اثر ثابت ہوئے۔ کم سنی اور کم علمی بھی کبھی کبھی حوصلے پست کر دیتی ہے۔ اُس نے بھی اِسے اپنا نصیب مان کر ہتھیار ڈال دئے۔ واپسی کے سبھی راستے خود بند کر لئے جب اُسے علم ہوا کہ اس کے پاؤں بھاری ہیں۔ نئی سی اُمید کی کرن پھوٹی تھی کہ تقسیم ملک کے سانحہ نے زندگی کا پاسا ہی اُلٹ دیا۔ قتل و غارت، عصمت دری، لوٹ پاٹ، آگ زنی نے سب تباہ کر دیا۔ بھرا پورا گھر چھوڑ نقدی اور زیور سمیٹ کر کنبے کے ہمراہ وہاں سے نکل پڑے۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے دس میں سے صرف تین افراد رہ گئے باقی راستے میں ہی ہلاک ہو گئے۔ اس کی پہلی اولاد کا جنم رفیوجی کیمپ میں ہوا۔

دوسروں کی طرح وہ بھی زندگی کو پٹڑی پر لانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ پرتھوی کا تبادلہ قاضی گنج ہوا تو اتفاقاً سنبل سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے پہچانتے ہی کِھل اٹھی۔ اچانک اُسے سامنے دیکھ کر لگا کہ جیسے میرا کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ زبردستی ضد کر کے گھر لے گئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کی زندگی کی پست حالی دیکھ کر دل میں ہوک اُٹھی۔ محلوں میں رہنے والی کیسی زندگی جینے کو مجبور تھی۔ چھوٹے چھوٹے تین کمروں کا گھر باہر بڑا سا دالان اور اُس کے بیچ و بیچ آم کا پیڑ جس کے نیچے تخت اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بچوں کی ریل پیل سے چھوٹا سا گھر بھرا پُرا لگ رہا تھا۔ چائے کے دوران اُس نے بتایا کہ کیلاش نے کئی طرح کے کاروبار شروع کئے کئی بند کئے۔ پیسہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا زیور دھیرے دھیرے بکتے گئے۔ آمدنی کم سے کم ہوتی گئی اور کھانے والے افراد ہر سال بڑھتے گئے۔ بازاری عورتوں کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر شراب کی لت نہ چھوٹی۔ سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی اور پہلی اولاد سترہ سال کی عمر میں ہی گود میں آ گئی۔ اور تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اُس نے کوکھ کی دس فصلیں کاٹ دیں۔ جس میں سے پانچ بچ گئے اور پانچ ضائع ہو گئے۔ گیارھویں فصل کا بیج بو چُکا تھا جب کہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ کمزوری اتنی ہے کہ اگر پھر حمل ہوا تو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ پھول سا بدن سوکھے پتے کی طرح مُرجھا گیا تھا۔ زرد چہرہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ بدن کا خون نچوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے جب اپنائیت اور حق سے ڈانٹ کر سمجھانے کے لہجے میں بات کی تو اُس کی آنکھیں برس پڑیں۔

''میں اس دوزخ میں جلتے جلتے تھک چکی ہوں۔ اسے ناغہ کی عادت نہیں۔ اُن چار دنوں میں بھی نہیں جب ہمارے یہاں رسوئی میں جانا معیوب ہوتا ہے۔''

یہ سُنتے ہی میری آنکھیں بھی مچل اُٹھیں۔ دیمک کی طرح وہ اُسے

چاٹتا رہا اور اُس کے جسم کو کھوکھلا کر ڈالا۔

عورت کے جسم پر مرد جبراً حکومت تو کر سکتا ہے مگر دل کے دروازے جبراً کھول نہیں سکتا۔ دس بچے جن کر بھی دِل کورا کنوارا ہی رہا۔

سُنبل کے گھر سے واپس آ کر بچوں کی ریل پیل، اُن کا رونا، اُن کا چلانا، لڑنا جھگڑنا کانوں میں دیر تک گُنجتا رہا اور اپنا آنگن ویران اور زیادہ سُونا لگنے لگا۔ اب میرا زیادہ وقت سُنبل کے گھر گزرنے لگا۔ پرتھوی کے دفتر جانے کے بعد گھر کا کام نپٹا کر بچوں کے لیے ہر روز کچھ نئی چیز بنا کر لے جاتی۔ اُس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام نپٹا دیتی۔ اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُس کی ایک نہ سُنتی۔ سارا دن سکھ دُکھ بانٹتے بچوں کی دیکھ بھال کرتے کیسے گزر جاتا، پتا ہی نہ چلتا۔ دیپک اور چراغ پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ پرتھوی نے اپنا رسوخ استعمال کر کے دونوں کی فیس معاف کرا دی اور باقی چھوٹے دونوں بیٹوں چمن اور کنچو کی فیس کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ مالک نے ایک ہی بیٹی دی اور وہ بھی سیدھی یعنی غائب الدماغ۔ نام تو اُس کا لتیکا رکھا تھا مگر لتیکا کو للّی بننے میں دیر نہ لگی۔ سُنبل سارا دن گھر کے کاموں اور بچوں میں اُلجھی رہتی، اُسے فرصت کہاں ملتی بچوں کی پڑھائی دیکھنے کی یا پھر للّی کا علاج کرانے کی۔ للّی کی ذمہ داری میں نے لے لی۔ پرتھوی کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو دکھایا، کئی طرح کے ٹیسٹ ہوئے اور نتیجہ صفر نکلا۔ پیدائش سے ہی اُس کا دماغ کمزور تھا اچھی طرح ڈویلپ نہیں ہوا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ کیلاش پنساری کی دُکان کرتا تھا صبح نکل جاتا اور دیر رات لڑکھڑاتا ہوا گھر لوٹتا۔ جب تک گھر آتا بچے سو چکے ہوتے اور جب اُس کی صبح ہوتی تو بچے سکول جا چکے ہوتے۔ پیٹ کی آگ بجھتے ہی جسم کی آگ جاگ اُٹھتی۔ سارا دن کولھو کے بیل کی طرح پستی رہتی رات بوٹیاں نوچواتی اور صبح پھر چکی کے پاٹوں میں پسنے کو تیار ہو جاتی۔

اِدھر گیارھویں فصل پک کر کٹنے کے لگا پر تھی کہ اُس رات کیلاش لڑکھڑاتے قدموں سے خود نہیں آیا بلکہ چار لوگ اُسے کاندھوں پر اُٹھا کر لائے۔ نشے میں دُھت بہکتے قدموں سے اندھیرے میں چلا آ رہا تھا کہ کسی تیز رفتار گاڑی نے اُسے اپنی چپیٹ میں لے لیا۔ مجھے ڈر تھا یہ جو مصیبتوں کا نیا پہاڑ ٹوٹا ہے وہ اُسے چکنا چُور نہ کر دے مگر میرے اندیشوں کے برخلاف وہ ٹوٹ کر بکھری نہیں بلکہ اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر نہ شکن تھی نہ بیزاری صرف افسردگی۔ فکر تھی تو بچوں کی پرورش کی۔ ویسے بھی دُکھوں کے علاوہ دیا ہی کیا تھا اُس نے جو اُسے رو کر یاد کرتی۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر تو اُسے اس کے جیتے جی بھی ستاتی تھی یہ کون سا نیا مسئلہ تھا اُس کے گزر جانے کے بعد چمن کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے سکول کے بجائے باپ کی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ سُنبل نے جو زیور کیلاش سے چھپا کر رکھے تھے وہ بازار میں فروخت کر دیے اور پرتھوی نے اپنے بینک سے قرضہ دلوا کر جان پہچان کے ٹھیکدار کو مکان کی اوپری دو منزلیں تیار کرنے کو دے دیں تا کہ وہ کرائے پر دی جا سکیں اور آمدنی کا کوئی ذریعہ بن سکے۔ دیپک اور چراغ کو وظیفہ لگ گیا تھا اس لیے سُنبل چاہتی تھی کہ اُس کے دونوں لائق بیٹے اپنی پڑھائی جاری رکھیں بہت سی اُمیدیں اُن سے وابستہ تھیں۔ کیلاش کے گزر جانے کے ایک مہینے بعد اُس کی آخری اولاد نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر وہ اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُسے اس کے حال پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ پرتھوی سے اجازت لے کر گیارہ دن میں اُس کے گھر اُس کے پاس رہی۔ ماں اور بچہ دونوں کمزوری کے شکار۔ ماں کی چھاتیاں سُوکھ چکی تھیں اور بچے کا پیٹ بھرتا نہ تھا۔ سارا دن رُوں رُوں کرتا۔ ماں کے کانوں تک اُس کے رونے کی آواز نہ پہنچتی۔ اُس کی طرف پیٹھ کر کے لیٹی رہتی۔

بھائی کے رونے کی آواز سُن کر للّی اُسے گود میں اُٹھا کر باہر لے جاتی۔ گھر کے کاموں میں بھی وہ میرا پورا ہاتھ بٹاتی۔ سبھی لڑکے اپنی ماں کو بے پناہ چاہتے تھے اُسے کسی طرح کی تکلیف نہ دیتے اور اُسے خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے۔ دیپک نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیوشن لینی شروع کر دی تھیں۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اُنہیں۔ پرتھوی سے ہر وہ مسئلے پر مشورہ کر لیتے جو شاید کبھی انہوں نے اپنے باپ سے نا کیا ہو۔ کمزور سے نوارد بچے کو چھوٹو چھوٹو کہہ کر پکارنے لگے تو میں نے سُنبل سے کہا:

''یہ بھی بھلا کوئی نام ہے۔ بچے کا کوئی اچھا سا نام رکھو تم تو بے چارے کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔''

''بدنصیب کیسا رہے گا؟''

''بدنصیب؟ یہ نام ہے بھلا؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''بدنصیب نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا ضرورت تھی اسے میری زندگی میں آنے کی۔ خود مر گیا اور میرے سر ایک اور بلا ڈال گیا۔''

بچے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کسیلا منہ بنا کر اُس نے کہا۔

میں نے پیار سے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''تمہیں قدر نہیں اولاد کی۔ کیا قیمت ہوتی ہیں ان کی یہ مجھ جیسی سے پوچھو۔'' آنسو آنکھوں میں ضبط کر کے میں کمرے سے نکل آئی۔

وہ دوبارہ اپنی گھر گرہستی کا ذمہ سنبھالنے کے قابل ہوئی تو میں واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔ ایک روز بینک سے آ کر پرتھوی نے بتایا کہ ہمیں صبح ہی نکلنا ہوگا۔ ماں بہت بیمار ہے صبح نکلنے سے پہلے کچھ رقم اور رقعہ سُنبل کے نام اپنے گھر کام کرنے والی بائی کو اِسے پہچانے کو دے دیا۔

گئے تو پانچ دن کے لیے ماں کو دیکھنے تھے مگر لوٹتے لوٹتے بیس دن لگ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ماں نے دم توڑ دیا تھا۔

قاضی گنج واپس پہنچنے کی جب سُنبل کو خبر ملی تو وہ دیپک کے ہمراہ افسوس کرنے چلی آئی۔ گلے ملتے ہی رونے لگی۔

''آپ شہر میں نہیں تھیں تو لگا میں پھر سے یتیم ہو گئی۔''

''ایسا کیوں کہتی ہو؟ تمہارے جوان بیٹے تمہارے ساتھ ہیں۔ بچوں کے پاس ہوتے مائیں کیسے یتیم ہو سکتی ہیں؟''

باتوں باتوں میں اُس نے بتایا کہ چھوٹو کا بخار کئی روز سے اُتر نہیں

رہا۔ڈاکٹرز نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے ہیں وہ ایک دو روز میں کروانے ہیں۔اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ بچہ بھی لِلّی کی طرح غائب الدماغ نہ نکلے۔

''دو کھوٹے سکّے تو پہلے ہی نصیب میں لکھے گئے ہیں اب یہ بھی۔۔''

''اب دوسرا کھوٹا سکّہ کون ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

''کنچو۔۔۔اور کون؟ پھر سے فیل ہو گیا ہے۔سارا دن محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کُود موج مستی اور کچھ نہیں۔''

''بچہ ہے ابھی'' میں نے غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

''بچہ؟ شیطان کہو شیطان۔پڑھائی میں نہ کام میں کہیں دماغ نہیں چلتا بس شرارتیں اور کھیل چاہیے۔''

دو روز بعد جب چھوٹو کو دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ مریل ہو چکا تھا۔گھر کے آنگن میں تخت پر اکیلے پڑا ایسے رو رہا تھا جیسے لاوارث ہو۔میری گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا۔بڑے دنوں سے جو بات میرے دل میں تھی وہ میں نے سُنبل سے کہہ دی۔

''مجھے لگتا ہے اسے میں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں یہ تم سے پلنے والا نہیں۔تُم تو مار ہی ڈالو گی اسے۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔میں خود سوچ رہی تھی کہ اس کی ذمہ داری آپ ہی لے لو۔''

اتنی جلدی اُس کے جواب کی مجھے اُمید نہیں تھی۔

''سچ کہہ رہی ہو؟ لے جاؤں؟ دوبارہ مانگو گی تو نہیں؟''

''آج سے ابھی سے یہ تمہارا ہوا۔میں کبھی نہ اس کا ذکر کروں گی اور نہ ہی تقاضا۔''

بے یقینی میں مَیں اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔بن مانگے موتی میری جھولی میں اُس نے ڈال دیئے تھے۔اُسے میری محرومیوں کا احساس تھا۔میرے سُونے پن میرے درد سے وہ آشنا تھی شاید اسی لیے اُس نے اپنے جگر کا ٹکڑا مجھے سونپتے ہوئے ایک بار بھی نہ سوچا۔میرے لیے وہ وہ گوہر نایاب تھا سینے سے چپکائے میں اُسے اپنے گھر لے آئی۔پرتھوی نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اُن کے ہونٹوں پر پیار کی انگلی رکھ دی۔میری نم آنکھوں کی التجا نے خاموشی سے اُسے قبول کر لیا۔اُسی دن گود میں اٹھاتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا:

''آج سے اس کا نام نیل ہے۔نیلما کی نیل۔اب خوش؟'' میں خوشی سے جھوم اٹھی۔چھ ماہ بعد پرتھوی کی ترقی کے ساتھ تبادلے کے آڈر بھی آ گئے۔تب تک نیل کی شکل وصورت اور صحت میں کافی سُدھار آ چکا تھا۔خود سُنبل اُسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی کہ یہ وہی چھوٹو ہے جو سارا دن رُوں رُوں کرتا رہتا تھا۔قاضی گنج چھوڑنے کا ملال جتنا ہمیں تھا اُس سے کہیں زیادہ سُنبل کو۔ایک گہرا اٹوٹ رشتہ بن گیا تھا ہم دونوں میں اور نیل وہ کڑی تھی جس نے ہمیں مضبوطی سے جوڑ دیا تھا۔سُنبل کی وجہ سے ہی میری بے رنگ زندگی میں ممتا کے سبھی رنگ بھر گئے تھے۔قرض دار ہو گئی تھی اُس کی اس مہربانی کی جو شاید اس جنم میں کبھی نہ چُکا پاؤں۔

قاضی گنج چھوڑنے کے بعد بھی رابطہ نہیں چھوٹا۔دیپک امریکہ چلا گیا اور پھر چراغ کو بھی بُلا لیا۔بچوں کے سنہرے مستقبل کے لیے سُنبل نے دل پر پتھر رکھ لیا۔چمن نے باپ کی دُکان سنبھال لی تھی اور بیاہ کے بعد الگ رہنے لگا تھا۔لِلّی کی شادی ادھیڑ عمر کے آدمی سے کی تو ضرور مگر اگلے ہی روز وہ واپس آ گئی اور ضد پکڑ لی کہ واپس اُس بوڑھے کے پاس نہیں جائے گی۔

نیل کی شادی میں اُنہیں بلایا مگر کوئی آیا بھی نہیں اور نہ ہی کوئی خبر۔پھر پرتھوی کے گزر جانے کے بعد میں نے سب سے واسطہ توڑ لیا خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا۔نا تو کبھی نیل کو سُنبل کے بارے میں اصلیت بتانے کی خواہش محسوس ہوئی اور نہ ضرورت۔سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہ بھول گئی کہ اُس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔نیل نے جب قاضی گنج جانے کی بات کی تو سارے بندھ ٹوٹ گئے۔سُنبل سے ملنے کو دل تڑپ اٹھا۔نہیں جانتی کہ وہ کس حال میں ہو گی۔ہو گی بھی یا نہیں؟

نیل نے ایک دو بار مجھے اُٹھانا چاہا مگر میں آنکھیں موند کر لیٹی رہی جیسے گہری نیند میں سوئی ہوں۔کار رُکی تو میرے خیالوں کا سلسلہ بھی ٹوٹا۔کار سے اُتر کر ٹانگے سیدھی کیں، کھانا کھایا اور سفر پھر شروع ہو گیا۔راستے میں نیل باتیں کرتا رہا۔سُنبل موسی اور اُس کے پریوار کے بارے پوچھتا رہا۔

ہمارے ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی کالج کے کچھ لوگ نیل کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔فریش ہو کر وہ اُن کے ساتھ نکل گیا اور ڈرائیور کو ہدایت دے دی کہ دو گھنٹے بعد بعد مجھے بتائے ہوئے پتہ پر لے جائے۔کام سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل پہنچ جائے گا۔سفر کی تھکان اُتار کر گھنٹے بعد ہی میں جانے کو تیار ہو گئی۔تحفے تو میں ساتھ لے کر آئی تھی پھر مٹھائی اور پھل راستے سے خرید لیے۔گاڑی جن راستوں سے ہو کر نکل رہی تھی سب کچھ نیا لگ رہا تھا کچھ بھی تو جانا پہچانا نہیں تھا۔تین دہائیوں میں قاضی گنج نے بھی خوب ترقی کی تھی۔سڑکیں کشادہ ہو گئی تھیں، عمارتیں اونچی اور ہر طرف لہلہاتے ہرے بھرے درخت، گلی میں پہنچتے ہی مجھے مکان پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی حالانکہ آس پاس کے سبھی مکان نئی طرز کے بن چکے تھے مگر وہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کے حالات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔دروازہ لِلّی نے کھولا۔بچپن میں دیکھا تھا پھر بھی پہچاننے میں ایک پل نہ لگا۔ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی، سیاہ وسفید بالوں کی آمیزش، وہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ماں جیسا تیکھا ناک اور باپ جیسا چوڑا دہانہ، خشک ہونٹ گندمی رنگت، حیرت سے دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کرتے میرے بولنے کا انتظار کرتی ہوئی منہ تکنے لگی۔

''لگتا ہے لِلّی نے اپنی موسی کو پہچانا نہیں؟''

''نیلما موسی؟ آپ نیلما موسی ہیں نا؟''

تپاک سے آگے بڑھ کر میرے گلے لگ گئی۔پھر ہاتھ پکڑ کر

''چہارسُو''

دروازے کے اندر لے آئی۔ دالان میں آم کے پیڑ کے نیچے تخت اور کرسیاں اُسی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور سامان رکھ کر باہر چلا گیا۔

''سُنبل کدھر ہے؟ اس سے کہو میں آئی ہوں۔'' کرسی پر بیٹھنے ہی لگی تھی اُس نے کہا:

''ماں ادھر نہیں آ سکتیں آپ کو اندر جانا ہوگا۔'' کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''کیوں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا پھر اُٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''کنچو دیکھ ماں سے ملنے کون آیا ہے؟ نیلما موسی آئی ہیں؟'' معصوم بچے کی طرح وہ چہک کر بولی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔

چھ فٹ کا جوان کنچو کمزور بوڑھی ماں کو گود میں اٹھائے بستر پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر اُس نے مسکرا کر کہا:

''پرنام موسی''

''جیتے رہو''

تکیے کا سہارا دے کر ماں کو بٹھا دیا تو میں سُنبل کی طرف تپاک سے بڑھی مگر وہ اجنبیوں کی طرح ویران نظروں سے مجھے تکنے لگی۔

''ماں پہچانتی نہیں کسی کو'' کنچو نے میرے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔

سُنبل کے پاس بستر پر اُس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی ہے۔ بالوں میں چاندی چمکنے لگی ہے، چہرہ جھریوں سے بھر گیا ہے۔ رنگ زرد، آنکھیں ویران، اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگنے لگی ہے۔ میں اُن آنکھوں میں اپنائیت تلاش کرتی رہی اور وہ اجنبی کی طرح دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے پوپلے منہ سے دھیمی نرم آواز میں بولی:

''کھانا کھا کر جانا''

اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔ کنچو نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا:

''اگر آپ اس طرح دل چھوڑنے لگی تو ہمیں حوصلہ کون دے گا؟''

لِلّی نے پانی کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے اپنے دوپٹے سے میری آنکھیں پونچھی تو میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

پھر میرے پوچھنے پر کنچو نے بتایا کہ پچھلے پانچ سالوں سے ماں کی یہ حالت ہے۔ ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ کسی کو نہیں پہچانتی سوائے ہم دونوں کے۔ دو چار جملوں کے علاوہ کچھ نہیں بولتی۔ بستر سے لگ گئی ہیں۔ اپنا کوئی بھی کام نہیں کر پاتیں۔ نہلانا، دھلانا، کھلانا پلانا سب وہ ہی کرتے ہیں۔ علاج چل رہا ہے مگر اُمید کی روشنی نظر نہیں آتی۔ وہ (Alzheimer) الزیمر کی شکار ہیں۔

''پہلے ہم اس کے بچے تھے اور اب یہ ہماری بیٹی بن گئی ہے۔'' کنچو نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

لِلّی چائے بنا کر لے آئی تو مجھے چائے کی پیالی تھمانے کے بعد لِلّی نے ماں کو چمچ سے پھونک مار مار کر ٹھنڈی کر کے بچوں کی طرح چائے پلانا شروع کر دی۔ پاس رکھے نیپکن سے منہ پونچھتی جاتی اور چائے پلاتی جاتی۔

کنچو نے پوچھنے پر بتایا دیپک اور چراغ صرف ایک مرتبہ ہی آئے تھے۔ دونوں نے وہیں گھر بسائے ہیں۔ فون پر ماں کا حال پوچھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی پیسے بھی بھیج دیتے ہیں۔ خود وہ فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ چمن کے بیوی بچے کبھی نہیں آئے البتہ وہ ملنے آتا رہتا ہے اور جب ماں اُسے نہیں پہچانتی اور ہم دونوں کو نام سے پکارتی ہے تو غصّے سے پھر کبھی نہ آنے کا کہہ کر چلا جاتا ہے۔ تھوڑے دن گزرنے کے بعد پھر آ جاتا ہے۔

''تم نے شادی نہیں کی؟''

''اچھا ہے نا نہیں کی۔ کی ہوتی تو ان دونوں کا کیا ہوتا؟'' مسکرا کر اُس نے جواب دیا۔ اتنی مشکلوں میں بھی پُرسکون رہنا اور مسکرا کر حالات کا مقابلہ کرنا یقیناً یہ سلیقہ اُس نے اپنی ماں سے سیکھا ہے۔

''کنچو'' سُنبل نے آواز لگائی۔

''لیٹنا ہے؟'' ماں کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے کہا۔

ماں کو گود میں اٹھا کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ بے حس لیٹی لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگی۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں ہمیشہ مجبوری، لاچاری، بے بسی ہی کیوں لکھی ہوتی ہے؟ نہ جانے کون سے گناہوں کی سزا ہے جو ختم ہی نہیں ہو رہی۔ بڑی امیدیں لے کر آئی تھی کہ سُنبل سے ملوں گی، دل کھول کر دونوں دُکھ سکھ بانٹے گے۔ نیل کو مل کر یقیناً اُسے خوشی ہوگی اور تھوڑی سی خلش بھی ضرور محسوس کرے گی۔ مگر میری سُنبل تو احساسات کی حدوں سے پار جا چکی ہے۔ یہ میری سُنبل نہیں یہ تو بیمار، لاچار عورت ہے جو صرف سانسوں کی گنتی پوری کر رہی ہے۔ اس اجنبی عورت کے پاس رُک کر کیا کروں گی؟ جانے کے لیے اُٹھی تو دونوں نے بڑی محبت اور اصرار سے رات اُن کے پاس ہی رکنے کو کہا مگر میری ہمت جواب دے گئی۔ سُنبل کو اسی طرح کچھ اور دیر دیکھتی رہی تو خود کو سنبھال نہیں پاؤں گی۔ اپنے عزیز کو ہر روز تِل تِل کر کے مرتے دیکھنا بھی ایک سزا ہے۔ ماں کے دونوں کھوٹے سکّے تو چل نکلے۔

''کل جانے سے پہلے نیل کے ساتھ آؤں گی'' اتنا کہتے ہوئے میں سُنبل کی طرف بڑھی۔ جھک کر اُس کا ماتھا چوما۔ مجھے لگا ایک ہلکی سی چمک اُس کی آنکھوں میں اُبھری مگر دوسرے ہی پل سب اُمید ختم ہو گئی جب دھیمی آواز میں بولی:

''کھانا کھا کر جانا''

ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے میں جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

باقی صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ کیجیے

لوح لاعی

آغا گل
(کوئٹہ)

بریمن میں شریمان شیام کمار کا وجود ایک نعمت تھا۔ اسکا تعلق سکھر سے تھا۔ یوں تو وہ برصغیر سے آنے والوں کو پُر تپاک انداز میں ملتا۔ ان کا سواگت کرتا۔ مگر بلوچستان کے ناطے وہ مجھے زیادہ ہی عزیز رکھتا۔ وہ مجھے اپنا ہم وطن سمجھتا۔ اس کی عمر تو اسّی برس سے کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی مگر بڑا چاک و چوبند رہتا۔ دراز قد، دبلا پتلا سفید رنگ میں ہلکی سی زردی جو کولواہ میں دوپہر کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ وقت کی تصویر تھا جیسے ارجن کارتھ لکیریں بناتا اسی کے چہرے سے گزرا ہو۔ اس کی دھیمی میٹھی آواز، با اخلاق لہجہ بس مخاطب کو مسحور ہی کر دیا کرتا۔ اس کی بیوی کامنی بھی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود کسی بیماری کا شکار نہ تھی۔ اس کا گھر پورا بھارت ورش تھا پاکستان، بنگالی، بہار، سکھ غرضیکہ سبھی کے لیے اس کا گھر آنند ماٹھ تھا۔ چونکہ اس کا گھر مندر تو نہ تھا لہٰذا اسے آنند ماٹھ کہا جاتا۔ وہ یوگا بھی جانتا تھا۔ باآسانی سر کے بل کھڑا ہو جایا کرتا۔ جسے وہ شرشا آسن کا نام دیا کرتا۔ اس کی شخصیت میں سب سے پُر تاثیر اس کی محبت بھری آنکھیں تھیں کرشن بھگوان کے انداز کی جن میں محبت سکون اور ہلکی ہلکی ہمہ وقت موجود محبت بسا کرتی۔ وہ دھرم کرم کا پالن کرتا، مگر عقیدوں کے تعصّبات سے کہیں بالاتر رہتا۔ عبداللہ کا جب دماغ کھسکنے لگا تو ہم اسے کشاں کشاں آنند ماٹھ میں شیام کے پاس بغرض علاج لے آئے۔

''یہ پاگل ہو گیا ہے، کسی گونگی لڑکی پہ مرنے لگا ہے، ہماری تربیت کے دو برس اب مکمل ہو رہے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ جرمنی میں سیاسی پناہ لے کر یہیں آباد ہو جائے گا اُس کی خاطر۔''

شیام نے ہمیں کافی پلائی، کیک سے تواضع کی ''محبت کی اعلیٰ سطح کا نام عشق ہے، جہاں من و تو کا سوال نہیں رہتا۔ عبداللہ کچھ تو بھی تو کہو۔'' اس نے رسان سے کہا وہ اس قدر جہاں دیدہ تھا کہ متعجب بھی نہ ہوا۔ عبداللہ یوں تو نورزئی تھا، افغانستان میں ڈالر اور ریال کے باعث جو فوج کشی ہوئی تھی بہت سے اسلامی ممالک جب جہاد کے نام پہ افغانستان چڑھ دوڑے تو دنیا جہاں سے کرائے کے سپاہی Mercenrges بھی منگوا لیے۔ سوڈان اور چیچنیا تک سے!

اس جنگ میں آخر کار سرمایہ دارانہ نظام کو فتح ہوئی مگر افغانستان تباہ و برباد ہو گیا۔ عبداللہ کا خاندان بھی ہجرت کر کے ژڑکاریز اور پھر کچلاک چلا آیا۔ عبداللہ یہیں پیدا ہوا پلا بڑھا۔ ملازمت بھی میرے ساتھ ہی اختیار کی۔ جانے کیوں تیس برس بعد انہیں واپس افغانستان دھکیلنے کی باتیں ہوئیں قانون گھڑے گئے تو وہ بڑا اجز بز ہوا۔ ہم ان دنوں جرمنی میں زیر تربیت تھے، بنگلہ دیش کا مطیع اللہ بھی ہمارے ساتھ تھا ہم تینوں مل جل کر دو برس کاٹ رہے تھے کہ اچانک ہی عبد اللہ کو عجیب جنونی قسم کی محبت ہو گئی بلکہ عشق ہو گیا۔ مطیع اللہ نے جھاڑ پھونک سے عشق کا بھوت اتارنا چاہا تو عبداللہ ناخوش ہوا تھا ''یہ سارے روحانی بزرگ افغانستان سے آئے تھے ہم ہی نے برصغیر میں اسلام پھیلایا اب تم مجھ پہ دم ڈال رہے ہو۔ واہ رہے زمانے'' مطیع اللہ نے معجوب ہونے کی جائے قہقہہ لگایا ''دوست علاج تو میں تمہارا کرتا رہوں گا تم جانتے ہو کہ بنگالی ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔''

یہی سبب تھا کہ عبداللہ کو لاعلاج سمجھ کر شیام کمار کے ہاں لیے چلے آئے تھے کہ وہ پگلا دوادارو سے گزر چکا تھا۔

شیام نے اسے کوئی اہم واقعہ قرار نہ دیا۔ ایک انسانی جذبہ سمجھ کر پیار و محبت سے معاملے کو کریدا۔

عبداللہ نے بتلایا کہ ایک بار وہ یونہی بے مقصد ہی گھومنے پھرنے کے ارادے سے اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا کہ دو ڈھائی ماہ ہی تو بچے ہیں۔ فریس کاس (ریستورانوں کی سڑک) اور جرمنی کے گومٹ لیش کائیٹ (آرام دہ ماحول) سے لطف اندوز ہو۔ دل بھر کے ام ویلٹ کو دل میں سمو لے۔ یوں تو بے لین، مُن شن، وائی ڈین شٹڈ گارڈ میں بھی رہا تھا۔ وادیٔ رائن کا بھی دلدادہ تھا۔ مگر بریمن اسے بے حد پسند تھا۔ ہم اس برامر سٹرائیے سے پیدل ہی چل نکلتے اس روز عبداللہ گھومتا پھرتا درختوں میں گھرے ایک ریسٹورانٹ میں جا نکلا۔ اس کی ٹیبل پر جو ویٹرس آئی وہ حسبِ معمول بہت ہی دل ربا مونی دبلی پتلی سی تھی اس کی آنکھوں میں ایک طلسمی طاقت تھی جیسے کہکشاؤں کے بلیک سٹار۔ جب وہ ہوش میں آیا تو دیکھا کہ وہ ویٹرس بدستور اسے حیرت سے دیکھے جا رہی ہے۔ چہرے اور بالوں سے وہ ہسپانوی لگ رہی تھی، سیاہ آنکھوں کے باعث اس گماں کو زیادہ تقویت ملی کہ وہ ہسپانوی ہی ہے۔ لہٰذا اس نے پشتو کی بجائے اردو میں کہا ''لوح لاعی! واقعی تم کس قدر حسین ہو۔ یونہی تو ملاح تمہارے لیے نہیں مرتے ہوں گے، دل چاہتا ہے کہ جان دے دوں تمہارے لیے! واہ۔ کیا مورت ہو۔'' ویٹریس کی آنکھیں ایک بار تو حیرت سے پھیل گئیں مگر اس کے چہرے پہ تاثرات نہ ابھرے، اس نے سر کے اشارے سے بتلایا کہ وہ اس کی زبان نہیں سمجھ سکتی۔ مینیو سامنے رکھ کر ایک انگلی اس پر ٹکائی کہ آرڈر دو۔ وہاں کی ویٹرس بال پوائنٹ ٹکا تو میں سیدھا ٹکا دیتی ہیں۔ آرڈر لینے کے بعد بال پوائنٹ کھینچتی ہیں تو دل بھی کھنچ جاتا ہے۔ پورا موت کا منظر ہوتا ہے۔ آرڈر نوٹ کر کے وہ دوبارہ بال پوائنٹ کو میان غنڈی میں سیدھا کھڑا کر لیتی ہیں مگر اس کا بال پوائنٹ خلاف معمول اس کے دائیں ہاتھ میں ہی تھا۔ عبداللہ نے آرڈر دیا اور پھر بچ بچا کر اس کے حسن کا طواف کرتا رہا کہ ویٹرس کو ناگوار نہ گزرے۔ جب اس نے کاؤنٹر کا چکر لگایا تو عبداللہ کا دل مچلنے لگا کہ وہ بس دیکھتا ہی چلا جائے۔ صدیاں، ہزاروں برس اور بہت سے جگ بیت جائیں یا پھر وقت

وہیں تھم جائے۔

ہمیں بالکل بھول کر ریسٹورانٹ میں اب وہ اکیلا ہی جانے لگا۔ مگر محبت کی دولت اکیلے کہاں سنبھلی ہے۔ اس نے مطیع اللہ کو رازداں بنالیا۔ وہ دونوں وہاں جایا کرتے۔ ویٹرس کسی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، سہ پہر کے بعد ہی وہ ڈیوٹی پہ آتی۔ ہمیں جو رقم ماہانہ تنخواہ کی صورت میں ملا کرتی ہم جب اسے اپنے ملک کی کرنسی سے ضرب دیتے تو ہول اٹھنے لگتا۔ جی چاہتا کہ گاندھی کی مانند مرن برت رکھ لیں۔ کیونکہ ان کی ہر شے حتی کہ پانی کی بوتل بھی ہمارے لیے بے حد مہنگی ہوا کرتی۔ ہمارے تو اڑک کا پانی کاریز میں بہہ جاتا ہے کبھی بھاؤ تاؤ نہ کیا۔ نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ پانی اس قدر مہنگا بھی ہوسکتا۔ پانی کا نرخ گوادر والا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ جستجو ہوئی کہ مجھے نکال کر آخر یہ جاتے کہاں ہیں۔ ایک روز میں نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی مانند ان کا چپ چپاتے پیچھا کیا اور فیلٹ ہیٹ سر پر ٹکا کالر کھڑے کر کے پہلو میں جا بیٹھا۔

اس ویٹرس کا نام عبداللہ نے ہی لوح لاعی رکھا تھا۔ جب وہ آئی تو دونوں مینیو سامنے رکھ کر یوں گفتگو کرنے لگے کہ لوح لاعی سمجھی آرڈر دینے کے لیے باہم اپنی زبان میں مشورہ کر رہے ہیں۔

''مطیع اللہ اگر میں جلوہ طور برداشت نہ کر پایا تو مجھے یہیں دفن کر دینا۔ اس کے گھر کے سامنے۔'' مطیع چہکا ''تصوف میں ہے کہ اگر عاشق صادق مر جائے محبت میں جان دے ڈالے تو وہ شہید ہے۔ اس کا باپ تمہیں عاقل خان کی مانند دیگ میں زندہ نہ ابال دے۔ جیسا کہ شاہ جہاں نے عاقل خان کا روسٹ بنا دیا تھا۔ تمہیں نہیں پتہ یہ ہسپانوی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔''

عبداللہ نے ایک ڈش کے نام پہ انگلی رکھی جیسے منگوانا چاہتا ہو۔

''مطیع اللہ میرا ایک تابوت بنانا جس میں شیشہ لگا ہو آنکھوں کے سامنے۔ میری ایک یادگار اس ریسٹورانٹ کے سامنے بنوا دینا۔ تاکہ آتے جاتے دیکھا روں اس شعلہ حسن کو۔'' مطیع اللہ نے فقرہ کسا ''دادا گیری تمہارے پرکھوں کا پیشہ رہا ہے۔ اسے اغوا کر کے افغانستان لے جانا۔ چادری پہنانا مزے سے رہنا۔'' میں نے ہنسی روکنے کے لیے گال چبایا۔ تاخیر کے باوجود ویٹرس بھی ذرا نہ جھلائی۔ نہایت سکون سے کھانے کے لیے ان کی پسند و ناپسند کا انتظار کرتی رہی۔ مطیع اللہ نے تبصرہ کیا۔

''مگر گونگی ہے بول نہ سکے گی، اپنی محبت بھی بیان نہ کر پائے گی۔ خیر اچھا ہی ہے! زیادہ دماغ نہیں چاٹے گی!!''

کھانا آیا تو میں کالر نیچے کر ہیٹ اتار ان کی میز پہ آ بیٹھا۔ میں نے لوح لاعی کو پلیٹ لانے کو کہا۔ شکر ہے اس کے کان تیز تھے وہ پلیٹیں لگانے لگی۔ بالکل ہی لاتعلق سی۔

''برادرانِ یوسف! میرے دوست نما دشمنوں تم اس حسن کی دیوی کے لیے غداری پہ اتر آئے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ عبداللہ نے ڈانٹا ''چپ رہو میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تمہاری بھابھی ہے! ادب سے نام لو۔''

مجھے سخت تاؤ چڑھا ''مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ اس بے چاری کو علم نہیں ہے تم عشق کے ون وے ٹریفک میں دوڑے چلے جا رہے ہو۔''

لوح لاعی سے نیپکن چھوٹ گرا، اس نے اشارے سے معذرت کی اور دوسرے لا کے لگانے لگی۔ میں مفاہمت پہ اتر آیا ''کام آسان ہے تو ریسٹورانٹ کی مالکہ سے پوچھو یہ ہیلن آف ٹرائے کون ہے۔''

مطیع اللہ کو تاؤ چڑھا ''یہ ہیلن آف ٹرائے نہیں جون آف آرک کہو۔ ذرا اس کے چہرے کی تقدیس دیکھو۔ یہ تو کالیداس کی شکنتلا ہے۔ مالکن بڑی خشک مزاج ہے۔ ایک تو ہماری جرمن زبان کمزور ہے ٹرنحائے زی بین اخت (تین۔ سات۔ آٹھ) یاد کرتے کرتے میرا تو جبڑا بھی اتر چکا ہے۔ اس سے پوچھا تو سرد مہری سے بولی میرے اسٹاف سے تمہارا کیا تعلق۔ یہ مسلمانوں کو یوں بھی خودکش حملہ آور سمجھتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ کہیں پولیس کو ہی نہ بلوا لے۔ یہاں کے پولیسیئے بھی بڑے چپڑقناتی ہیں۔ کوئی جرمن فون کرے تو بھاگے دوڑے چلے آتے ہیں۔ ہمارے دیکھو باہر خون کی ندیاں بہہ جائیں تھانے سے نہیں نکلتے۔

''لوح لاعی ہماری زبان نہیں جانتی تھی لاتعلق سی رہی اسی رات ہم نے فیصلہ کیا کہ معاملہ تشویشناک ہے۔ اسے شیام کے سپرد کر دیا جائے۔ شری مان تجربہ کار تھا۔ روحانی شخصیت تھا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتا۔ یوں بھی وہ شہر بھر کی قابلِ احترام شخصیت تھا ہم ڈھونڈھ ڈھانڈ کر کم قیمت کھانے منگوایا کرتے۔ اتنی طاقت نہ تھی کہ روز جا سکتے۔ ہفتے میں ایک بار جاتے اور عبداللہ کی دوستی میں باری باری بل ادا کرتے۔ تاکہ عبداللہ کا دھڑن تختہ ہی نہ ہو جائے۔

ایک بار لوح لاعی کھانے کے ساتھ ایک مہنگی ڈش بھی لے آئی۔ جسے دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ چونکہ مطیع اللہ کی جرمن اچھی تھی اس نے کہا کہ ہم نے تو یہ نہیں منگوائی۔ لوح لاعی نے سینے پہ ہاتھ رکھا یعنی میں اور تینوں کی جانب اشارہ کیا کہ یہ میری جانب سے تم تینوں کے لیے ہے۔ اس دن ایک فیسٹیول تھا۔

میں نے کہا ''عبداللہ مبارک ہو تمہاری محبت جیت گئی۔ دیکھو ہے تو گونگی مگر کیسی محبت کرنے لگی ہے۔'' عبداللہ سٹ پٹایا ''گونگے بہرے کیا محبت نہیں کر سکتے۔ پتھر کے بُت بول پڑتے ہیں معجزوں کا اب بھی وجود ہے، کیا عجب بول ہی پڑے۔ حنّان الفیل پالتا جیسی آواز میں۔''

شیام کمار نے ہماری باتیں سکون سے سنیں۔ ریسٹورانٹ کا پوچھا۔ لوح لاعی کا حلیہ پتہ دریافت کیا۔ پھر وہ اچانک ہی کھل اٹھا۔ وہ مسکرایا کرتا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہوا کرتی۔ مگر وہ بہت کم ہنسا کرتا اور ہنسی بھی ایسی ہلکی سی جیسے 650 سی سی کار اسٹارٹ ہوئی ہو۔ یوں گماں ہوا کہ جادو کی چھڑی اسے مل گئی ہے۔

''اچھا بھئی! کل تمہارا مسئلہ حل کر دوں گا۔''

ہم اچھل پڑے۔ کیونکہ شیام ایک سچا اور کھرا انسان تھا۔ وہ یقیناً سچ کہہ رہا تھا۔ فرطِ جذبات سے عبداللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عقیدت سے بوسہ دیا۔ ''میں زندگی بھر یہ احسان نہیں بھولوں گا۔'' عبداللہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جیسے ارضِ ششدر رہ گیا تھا کہ اس کا تربور بھگوان کا ہی ایک روپ ہے۔ کچھ دیر کے لیے ہم تینوں ہی حواس کھو بیٹھے۔ پھر رفتہ رفتہ ہم دوبارہ ہوش میں آئے۔ اس کی پتنی درمیان میں کافی بسکٹ پروسنے چلی آئی تھی۔ وہ بھی ایک ہمدرد ماں کی طرح ہماری بپتا سنتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مدر ٹریسا والی دکھ بھری محرومِ محبت بسی رہتی۔ کیونکہ اس کی اولاد نہیں تھی کبھی کبھی اس کی آنکھیں گہرے تاریک کہنوں سی اداس اداس دکھائی دیتیں پھر ان پہ ماتا چھا جاتی۔ وہ ایک مہربان خاتون تھی جسے جانے کیوں ماں کہنے کو جی چاہتا۔ وہ بھی مہمانوں کا بہت خیال رکھتی مگر ماس ٹیبل پہ کبھی نہ آتا۔

''اچھا بھئی کل چلیں گے، اور بھگوان کی کرپا سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

عبداللہ تشکر میں بھیگ گیا۔ دل چاہتا تھا کہ شیام کے قدم لیں۔ کامنی نے محبت سے جھڑکا ''تم کل کا کہہ رہے ہو، یہ کل عبداللہ کے لیے ایک یگ ہے، بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی جاؤ کل تک تو یہ سولی پہ ٹنگا رہے گا۔''

شیام ڈریس پرٹوکول کا بڑا خیال رکھتا، اس نے پن سٹریپ سیاہ سوٹ پہنا۔ سرخ ٹائی لگائی اور بولا ''اچھا بھئی چلو میرے Three Musketeers آج ہم فیصلہ کئے دیتے ہیں کہ جیت محبت کی ہی ہوا کرتی ہے۔ وہ ریسٹوارنٹ پہلے تو قریب لگا کرتا۔ اب یوں محسوس ہوا کہ ہزار ہا میل کے فاصلے پہ ہے۔ عبداللہ اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک واضح ارتعاش تھا، وہ شنگرف ہوا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے ریسٹورانٹ آیا۔ شیام نے کہا کہ پہلے تم سب جا کر بیٹھو میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ ہم حیران سے جا بیٹھے یوں لگتا تھا کہ جیسے خواب دیکھ رہے ہوں۔ لوح لاعی ہماری میز پہ آئی اشارے سے ویش (Wish) کیا۔ اب وہ اپنائیت سے پیش آتی۔ شیام کہیں لمبا ہی نکل گیا تھا۔ ہم نے وقت گزاری کے لیے کافی منگوائی کبھی شیطان دل میں وسوسے ڈالتا۔ منزب دل میں اتر آتا کہ کہیں شیام نے بھیانک جان لیوا مذاق ہی نہ کیا ہو پھر جیسے صدیاں بیت گئیں تو شیام ایک دوست کے ہمراہ چلا آیا جس کی عمر ساٹھ برس رہی ہوگی۔ وہ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھا۔ شکل وصورت سے معقول انسان دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ ہنس مکھ سا دکھائی پڑتا۔ شیام نے تعارف کرایا ''یہ تینوں میرے بیٹے ہیں جنہیں میں پیار سے Three Musketeers کہتا ہوں اور یہ میرے دوست ہیں مرزا صاحب۔ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے ہیں۔'' ہم نے نووارد سے بھی مصافحہ کیا اور اپنے ساتھ ہی میز پہ جگہ دی۔ ہم حیرت سے شیام کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارا مسئلہ فلسفے کے کسی پروفیسر سے ملنا نہ تھا۔ مگر بہ صورت مجبوری ہم سوال نہ کر پائے۔ مرزا نے ہم سے گلہ کیا کہ اس کے ہم وطن ہوتے ہوئے بھی ہم اس سے نہ ملے مطیع اللہ کو بھی اس نے شفقت سے سرزنش کی پھر شیام کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہاں غائب رہا اتنے عرصہ۔ شیام نے جواباً اپنی مسکراہٹ بکھیر دی۔

''مرزا۔ یہ لوح لاعی کون ہے۔''

مرزا مسکرایا ''وادیٔ رائن کے پانیوں میں ایک جل پری رہتی تھی جہازیوں کو دیکھ کر وہ چٹان پر آ بیٹھتی اور نغمہ الاپتی اس کا مسحور کن گیت، اس کا حسن دیکھ کر جہازی حواس کھو بیٹھتے اور ان کا جہاز چٹان سے جا ٹکراتا، سبھی غرقِ دریا ہو جاتے۔ پھر اس کا ایک مجسمہ اسی چٹان پہ بنا دیا گیا۔ تاکہ جہازی یاد رکھیں۔ تم تو جہاں گرد ہو تم نے Rhine Gorge میں اس کا مجسمہ تو دیکھا ہی ہوگا۔'' ادھر ہماری گفتگو چل نکلی اُدھر لوح لاعی مصروف تھی معاً اس کی نظر ہم پہ پڑی وہ تیزی سے مسکراتی ہوئی آئی۔ پروفیسر کو اس نے سلام کیا اور شیام سے کہا ''انکل آپ کیسے ہیں'' ہم ساکت وجامد رہ گئے۔ عبداللہ کے ہاتھ سے گلاس گرا ایک چھناکا ہوا۔ گلاس ریزہ ریزہ ہو گیا۔ مگر عبداللہ کا ہاتھ وہیں معلق رہا وہ ہوش کھو بیٹھا تھا۔ شیام نے ہم سے تعارف کرایا ''یہ میری بھتیجی ہے، مرزا صاحب کی بیٹی''

- بقیہ -

دو نیناں

''کھانا کھا کر جاتی تو ماں کو اچھا لگتا'' بلّی نے کہا۔

''تم فیکٹری کتنے بجے جاتے ہو؟'' میں نے بات بدل کر کنچو سے پوچھا۔

''کل چھٹی ہے میں گھر پر ہی رہوں گا۔ آپ دونوں ناشتہ ہمارے ساتھ کریں گے۔ ہمیں انتظار رہے گا۔''

میں نے مسکرا کر منظوری دے دی۔ پرس میں سے کچھ رقم نکال کر کنچو کو دینی چاہی تو اس نے لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا:

''اس کی ضرورت نہیں۔ کام چل جاتا ہے بس اس وقت تو صرف دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ دُعا ضرور کریں کہ ماں ٹھیک ہو جائے یا پھر۔۔۔'' اتنا کہہ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میری خود کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگیں۔ میں بھلا اُنہیں کیا دلاسہ دیتی۔ دلاسہ تو میرے پاس اُس ماں کو دینے کے لیے بھی نہ تھا جس کی نمناک نگاہیں مسلسل مجھ سے کوئی سوال کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ قبل اس کے اوپر والا کوئی چینکا ردکھائے میں تیز قدموں سے چلتی گھر سے باہر نکل آئی۔۔۔

ہرنام داس

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

ہرنام داس کے نامانوس سے نام سے میری پہچان شعور کی آنکھ کھولتے ہی ہوگئی تھی۔

اس نام کی چھاپ نہ صرف حویلی کے در و دیوار بلکہ اس کی ہر ایک چیز پر ہی بہت گہری تھی۔ گاگر، پرات، گلاس، پلیٹیں، چمچے، کف گیر، یہاں تک کہ بستروں کی چادروں، کمبل، کھیس، تلائیوں، رضائیوں اور تکیے کے غلافوں پر بھی جگمگاتا ہوا ہرنام داس کا نام میرے ذہن کی تختی پر کئی طرح کے نقش و نگار بناتا رہتا تھا۔

وسیع و عریض حویلی کے کمروں میں مجھے اکثر اَن دیکھے ہرنام داس کا اداس اداس سا ہیولا منڈلاتا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دن اچانک ہرنام داس میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا مگر میں یہ سوچ کر ہی گھبرا اٹھتی تھی۔

آخر ہرنام داس کون تھا؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ کیسا شخص تھا وہ جو اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلا گیا؟ میرے ذہن میں بہت سے سوال جوابوں کے لئے بے چین تھے۔

میں جیسے جیسے شعور کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی سچ پوچھو تو مجھے ہرنام داس سے ایک طرح کی ہمدردی سی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن کھانا کھاتے ہوئے پیتل کے بڑے سے گلاس کے پیندے پر ہرنام داس کا نام کندہ دیکھ کر میں نے بالآخر ماں سے پوچھ ہی لیا، ''ماں! یہ ہرنام داس کون ہے؟''

میرے منہ سے ہرنام داس کا نام سن کر توے پر روٹی ڈالتی ہوئی ماں یوں بِدکی جیسے اس نے کوئی بے حد ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔ ماں کا ہاتھ سخت گرم توے کے ساتھ جلتے جلتے رہ گیا۔

''تجھے اس سے کیا؟'' ماں نے درشتگی سے جواب دیا۔ ''خاموشی سے ناشتہ ختم کر کے سکول جا! جب دیکھو الٹے سیدھے سوال کرتی رہتی ہے۔''

ماں کے حوصلہ شکن جواب سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش وقتی طور پر تو سرد سی ہوگئی مگر یہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

سکول میں سبق یاد کرتے ہوئے بھی میرا دھیان ہرنام داس کی طرف ہی لگا رہا۔ ہل ہل کر ''ا''، ''ب''، ''پ'' کی تختی پڑھتے ہوئے جیسے ہی میں ''ہ'' پر آئی تو یک دم میرے منہ سے نکل گیا، ''میڈم ''ہ'' سے ''ہل'' کے علاوہ ''ہرنام داس'' بھی بنتا ہے۔'' میری زبان سے یہ نامانوس سا نام سن کر میڈم نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔

گھر میں ہرنام داس کے نام سے جس قدر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے حویلی کے چپے چپے سے اس نام کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار تو مجھے لگتا کہ شاید ہرنام داس میرے دادا تھے جنھوں نے ابا کو اپنی پسند کی شادی کرنے پر جائیداد سے عاق کر دیا تھا اور غصے میں ابا کو حویلی سے نکالنے کی بجائے خود ہی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔

ایک دن ابا کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے ہرنام داس کا ذکر چھیڑ دیا، ''ابا! ہرنام داس کیا میرے دادا تھے؟'' میرے اس اچانک سوال پر ابا کی بڑی بڑی آنکھیں غصے اور حیرت سے مزید پھیل گئیں۔

''چُپ ناہنجار! ہرنام داس تمھارے دادا کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم مسلمان ہیں اور یہ تو ہندوانہ نام ہے۔''

میں اپنے بے تکے سوال پر شرمندہ سی ہو کر رہ گئی۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' ابا کی بے طرح ڈانٹ سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔

ہمارے گھر میں لگتا تھا کہ دادا کی طرح ہرنام داس کا نام لینا بھی ممنوع تھا کیوں کہ دونوں کا نام سنتے ہی اماں اور ابا کی پیشانیاں شکن آلود ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کے شہد میں گھلے ہوئے لہجے ایک دم بِس ٹپکانے لگتے مگر اس قدر نامساعد حالات کے باوجود بھی میں ہرنام داس کے بارے میں سوچنے سے کنارہ کش نہ ہو سکی۔

حویلی کی شان و شوکت دیکھ کر لگتا تھا کہ ہرنام داس نے گاؤں کی واحد دو منزلہ پختہ حویلی کو بڑے دُلار سے بنایا ہوگا۔

حویلی کی نچلی منزل پر گلی کی طرف ایک کافی کشادہ بیٹھک تھی جو اب مردانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی دو بڑی بڑی کھڑکیاں اور نقش و نگار سے مزین ایک مضبوط چوبی دروازہ تو گلی میں کُھلتا تھا جب کہ دوسرا دروازہ گھر کی جانب بیٹھک سے ملحقہ بڑی سی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ بیٹھک میں سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی چیز اس کی کشادگی کے علاوہ ایک سا گوان کا نہایت ہی خوب صورت قدِ آدم آئینہ تھا جو دیوار میں بڑی مضبوطی سے نصب کروایا گیا تھا اور اس کی پیشانی پر بھی ہرنام داس کا نام کندہ تھا۔

ڈیوڑھی کا بڑا سا آہنی دروازہ اکثر بند رہتا تھا اور خاص خاص موقعوں پر ہی کھلتا تھا جب کہ اس میں بنا ہوا ایک اور چھوٹا دروازہ گھر میں آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس دروازے کے اوپر بھی ہرنام داس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا جسے ابا نے ''ہٰذا من فضلِ ربّی'' میں تبدیل کروا دیا تھا۔

مجھے اکثر اس دروازے سے رونے کی آوازیں آتی تھیں جیسے سسکیاں لیتا ہوا دروازہ کہہ رہا ہو۔

گلی کے موڑ پہ سونا سا ایک دروازہ
ترستی آنکھوں سے رستہ کسی کا دیکھے گا

''چہارسُو''

ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ دو بڑے سے برآمدوں میں کھلتا تھا۔ برآمدوں کے دونوں طرف دو رسوئیاں بنی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھی کے پاس کھلی رسوئی گرمیوں میں استعمال ہوتی تھی جب کہ برآمدوں کے دوسرے سرے پر بنی ہوئی پختہ رسوئی سردیوں میں زیرِ استعمال رہا کرتی تھی۔

اِس رسوئی میں بنی ہوئی ایک بڑی سی چمنی سے سردیوں میں سانپ کی طرح لہرا لہرا کر نکلتا ہوا دھواں مجھے بہت بھلا لگا کرتا تھا۔ ہم سب بہن بھائی اس رسوئی میں سردی میں آگ کے نزدیک بیٹھنے کے لئے اپنی اپنی چھوٹی سی رنگین پیڑھیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چولھے کے بہت قریب لاتے تو ماں ڈانٹ دیتیں، ''ارے کم بختو! جل مرنے کا ارادہ ہے کیا؟، پرے ہٹو!'' ماں کی ناراضگی کے خیال سے ہم اپنی اپنی پیڑھیاں قدرے پرے گھسیٹ کر بیٹھ جاتے۔

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے ہی میرا ننھا سا ذہن پھر ہرنام داس کا پیچھا کرنے لگتا۔

''کیا ہرنام داس کی ماں بھی اسی طرح اسے چولھے کے نزدیک بیٹھنے پر ڈانٹتی ہوگی؟ کیا اسے بھی سردیوں میں رسوئی کی چمنی سے سانپ کی طرح لہرا لہرا کر نکلتا ہوا دھواں اچھا لگتا ہوگا؟'' ایسے میں مجھے لگتا کہ ہرنام داس ایک چھوٹا سا بچہ بن کر رسوئی کی خالی پیڑھی پر بیٹھا ہم سب کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

حویلی کے پکے صحن کے دونوں اطراف برآمدے تھے جب کہ تیسری جانب ایک بڑا سا کمرہ تھا جو سردیوں میں مال مویشیوں کے باندھنے اور چارہ رکھنے کے کام آتا تھا۔ صحن کی چوتھی جانب بہت بڑا قطعۂ زمین تھا جس میں رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کے علاوہ پیپل، شیشم اور نیم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ ان کی چھاؤں میں گرمیوں میں مویشی بیٹھے جگالی کرتے رہتے تھے۔

اسی صحن کے ایک کونے میں تازی خانہ تھا جہاں ابا کے شکاری کتے ہمہ وقت منہ کھولے ہانپتے رہتے تھے۔ ان ہانپتے ہوئے کتوں کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے یہ سب ابھی ابھی ہرنام داس کو یہاں سے بھگا کر کہیں دُور چھوڑ کر لوٹے ہوں۔ پتلی پتلی تھوتھنیوں والے یہ پھرتیلے سے شکاری کتے مجھے بہت برے لگتے تھے، اس لئے ان سے میری کبھی بھی دوستی نہ ہو سکی۔

حویلی میں دو بڑے دالان تھے جن کی کھڑکیاں پکی رسوئی کے ساتھ والے برآمدے میں کھلتی تھیں۔ ان دونوں دالانوں کے پیچھے کئی چھوٹے بڑے کمرے تھے جن میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا رہتا تھا۔ ابا نے سختی سے ہم تینوں بہنوں اور چھوٹے بھائی کو ان کمروں میں جانے سے منع کر رکھا تھا۔ ''شاید وہاں ہرنام داس کا بھوت رہتا ہوگا۔'' میرا ننھا سا ذہن پھر الجھنے لگتا۔

سب سے بڑے دالان میں دن کے وقت بہت رونق رہتی تھی، کیوں کہ یہ کمرہ افرادِ خانہ کے ہمہ وقت اٹھنے بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس دالان کے ایک کونے میں جہازی سائز کا چوبی پلنگ تھا جس کے بڑے بڑے رنگین پایوں پر بہت خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ہم سب بہن بھائی ان پایوں کے ساتھ جھولتے اور پلنگ کے نیچے چھپ کر آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔

پلنگ کا سرھانہ ایک قدِ آدم آئینے کی مانند تھا جس کے درمیان میں ایک بڑا شیشہ نصب تھا جس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے خوب صورت رنگین شیشے لگے ہوئے تھے جن میں ہم سب بہن بھائی اکثر اپنا اپنا چہرہ دیکھا کرتے تھے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے ہرنام داس یاد آ جاتا، کیا وقت نے ہرنام داس کا چہرہ بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہوگا؟

اس آئینے کے اوپر بھی ہرنام داس کا لکھا ہوا نام دیکھ کر میں سوچ میں پڑ جاتی کہ ''ہرنام داس کو آئینے اتنے اچھے کیوں لگتے تھے؟ مگر ان آئینوں نے تو اس سے بے وفائی کر ڈالی۔'' ذہن سے آواز ابھرتی۔

''آئینے بے وفا نہیں ہوتے، بس اپنے اوپر پڑنے والا عکس منعکس کر کے دکھا دیتے ہیں۔ اب وہ چاہے ہرنام داس کی شبیہ ہو یا کسی اور کی۔''

میرے لئے حویلی کا سب سے زیادہ دل چسپ کمرہ دوسرا دالان تھا جو اس وقت سٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اس پر ہر وقت تالا لگا رہتا تھا۔ ماں کے علاوہ گھر کی مہری اور کارخانے کا منشی وہاں اکثر جاتے رہتے تھے۔ اس کمرے میں بے شمار چیزیں تھیں جن میں کاشت کاری کے آلات و اوزار، برتن، فرنیچر، بستروں والی بڑی پیٹی، اجناس کے کنستر، اچار کے مرتبان، سرکے، شہد اور شربت کی بے شمار بوتلیں قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں۔ جب بھی اس کمرے کا دروازہ کھلتا میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دروازے کے ساتھ چپک جاتی تھی کیوں کہ ہمیں اس کمرے کے اندر پاؤں رکھنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔

مجھے اس کمرے کی دیگر چیزوں سے تو کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی مگر وہاں پیتل، تانبے، کانسی اور چاندی کے بے شمار چھوٹے بڑے برتن دیواروں پر بنی ہوئی بڑی بڑی پرچھتیوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے جو مجھے بہت پُر اسرار لگا کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان تمام برتنوں کی پشت پر بھی ہرنام داس کا نام ہی کھدا ہوا ہوگا۔ یہی برتن مجھے بار بار اس کمرے کی طرف کھینچتے رہتے تھے۔ جب تک کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا، میں باہر کھڑی بڑی محویت سے ان برتنوں کو دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن مجھے یوں لگا جیسے سب برتن آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہوں۔ ''پتا نہیں ہمیں کب اس قید سے رہائی ملے گی؟'' ایک بڑی سی پرات نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''خود تو چلے گئے اور ہمیں سولی پر لٹکا گئے۔''

''برتن تو استعمال کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور یہاں دن رات پرچھتیوں پر لٹکا کر ہمارا تماشا بنا رکھا ہے۔'' ایک بڑی سی گاگر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

چاندی کی نہایت نفیس طشتری ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بولی، ''یہ تو سب نصیبوں کی باتیں ہیں۔ وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا؟''

''ہر چیز وقت اور موت کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔'' ایک کونے میں پڑی ہوئی بڑی سی جست کی پیٹی نے کسی بوڑھے فلسفی کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''چہارسُو''

اس پیٹی کے دُکھ شاید سب سے زیادہ تھے۔ایک تو وہ خود قید میں تھی، دوسرا اس کے اندر رکھی ہوئی بے شمار چیزیں بھی دن کی روشنی دیکھنے کے لئے ترستی رہتی تھیں۔بعض اوقات یہ سب چیزیں مل کر اس قدر شور کرتیں کہ پیٹی انھیں چُپ کراتے کراتے ہلکان ہو جاتی تھی۔

مجھے لگتا کہ پیٹی کا دکھ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیوں کہ اگر اس کمرے کے مکین جانتے ہوتے تو اس سے ہمدردی ضرور کرتے مگر انھیں تو بس اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ ابا نے ہرنام داس کو مار کر اس کمرے میں پیٹی کے نیچے دبا دیا تھا اور حویلی کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔ بڑی سی پیٹی کے نیچے ہرنام داس کی بے نام سی قبر پر نہ کوئی پھول چڑھانے والا تھا اور نہ ہی کوئی دیا جلانے والا۔

ایک دن میں نے ماں کو پڑوس کی ماسی خدیجہ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔وہ کہہ رہی تھیں کہ ''ہندو اپنے مُردوں کو شمشان گھاٹ میں جلاتے ہیں وگرنہ ان کی آتما بھٹکتی رہتی ہے۔''

اسی دن سے میں یہ منصوبے بنانے لگی کہ ہرنام داس کا مُردہ کیسے جلایا جائے۔کیا ساری حویلی کو آگ لگا دی جائے یا صرف اس کمرے کو؟

ماں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہرنام داس کی اداس سی آتما اس حویلی میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اس کی شانتی کے لئے اسے آگ میں جلانا ضروری تھا۔

ہرنام داس کا خیال یوں ہی میرے ساتھ دن رات آنکھ مچولی کھیلتا رہتا مگر عملی طور پر میرے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔

ایک دن گاؤں میں بڑی گہما گہمی تھی۔سب بھاگم بھاگ چوپال کی طرف جا رہے تھے۔

''سنا ہے ہندوستانی ملٹری آئی ہے، گھر گھر تلاشی لیں گے۔'' گلی میں تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے بختو موچی نے کسی دوسرے آدمی سے کہا۔

میرا دل چاہا کہ میں بھی بھاگ کر بختو موچی کے پیچھے پیچھے چوپال کی طرف جاؤں اور ملٹری والوں کو بتاؤں کہ میرے ابا نے ہرنام داس کو مار کر سٹور میں بڑی سی پیٹی کے نیچے دبایا ہوا ہے مگر مجھے اتنی دُور چوپال میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ملٹری ہمارے گاؤں میں ہرنام داس کو تلاش کرنے کے لئے ہی آئی ہے اور کسی وقت بھی وہ ہماری حویلی میں آ جائے گی۔میں دم سادھے ڈیوڑھی میں ماں کے پاس بیٹھی ہوئی گلی میں سے فوجی بوٹوں کے ساتھ دندناتے ہوئے پاکستانی اور ہندوستانی ملٹری کے جوانوں کو گزرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا؟ یہ سب تو ہماری حویلی کے سامنے سے گزر کر آگے چلے گئے ہیں؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

میرا الجھا الجھا سا ذہن کہہ رہا تھا کہ ''ہرنام داس تو یہاں دفن ہے مگر یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟'' مگر ماں سے کچھ بولنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

''وہ اگلی گلی کے نکڑ والے گھر میں بڑا خزانہ چھپا کر گئے تھے اور اب ہندوستانی ملٹری کو ساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ اس گھر کو کھود کر یہاں سے خزانہ نکالیں۔'' کوئی گلی میں کہتا ہوا جا رہا تھا۔

''اچھا، اچھا، وہی گھر جس میں مہاجر آ کر آباد ہوئے ہیں!''

''ہاں، بالکل وہی بڑا سا گھر۔'' دوسرے نے جواب دیا۔چلو یار وہاں چل کر ہم بھی تماشا دیکھتے ہیں۔دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں ملٹری کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر جوق در جوق خزانے کی تلاش کا تماشا دیکھنے امڈ پڑے۔

گھر کے لٹے پٹے مکین الگ افسردہ تھے کہ اس خزانے کا علم انھیں کیوں کر نہ ہو سکا وگرنہ وہ اسے کھود کر نکال لیتے۔

دو روز کی سخت کھدائی کے بعد بھی زمین میں دبائی گئی پیتل کی چھ گاگروں میں بند سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور نقدی کا کوئی نشان نہ مل سکا۔تیسرے روز کھدائی اتنی گہری ہو گئی کہ زمین سے پانی رِسنے لگا تو گاؤں کے نمبردار نے، جو اس سارے معاملے کی نگرانی کر رہا تھا، ہاتھ اٹھا دیے کہ ''بس، اب اس سے زیادہ کھدائی کی گنجائش نہیں ہے وگرنہ گھر کی دیواریں مسمار ہونے کا خطرہ ہے۔''

مجھے پورا یقین تھا کہ خزانے کی کھدائی سے فارغ ہو کر ملٹری ہمارے ہاں ہی آئے گی اور ہرنام داس کی لاش کو سٹور سے باہر نکالے گی مگر اسی روز سہ پہر کو ملٹری کے تمام جوان گاؤں سے واپس چلے گئے تو میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔

سیانے کہتے ہیں ''کچھ عرصے کے بعد خزانہ اپنی جگہ سے کھسکنا شروع ہو جاتا ہے۔'' نمبردارنی کسی سے کہہ رہی تھی۔

''کہیں یہ خزانہ کھسکتے کھسکتے نمبردار کے گھر تو نہیں چلا گیا؟'' میرے ذہن میں سوال کا کیڑا پھر کلبلانے لگا۔

''لگتا ہے خزانہ چل پڑا ہے۔'' ایک اور آواز آئی۔

''بھلا خزانہ کوئی ہرنام داس ہے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑا ہے۔'' میں نے ترنت دل ہی دل میں جواب دیا۔

گاؤں میں ملٹری والے واقعہ کے بعد کافی دنوں تک ابا افسردہ اور بے حد خاموش سے رہے۔ابا کی اس قدر طویل خاموشی مجھے بہت کھل رہی تھی۔

پھر ایک رات تاریکی میں سے جیسے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے کتابِ زیست کے کتنے ہی ورق ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

پردے آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔

حجاب اٹھتے گئے۔

گرہیں کھلتی گئیں۔

میں دم سادھے ساتھ والے بستر پر سوتی جاگتی ابا اور اماں کی سرگوشیاں اور کبھی قدرے اونچی آواز میں ہوتی ہوئی باتیں.....کبھی سرد آہیں..... کبھی

سسکیاں.....کبھی آنسو تو کبھی ہچکیاں، سننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے آدھی ادھوری باتوں سے ہی میری سماعتوں میں شگاف سے پڑتے جا رہے تھے۔

بن کے رہے گا پاکستان.....بٹ کے رہے گا ہندوستان.....لے کے رہیں گے پاکستان.....مسلم لیگ..... کانگریس..... جناح..... نہرو..... گاندھی..... ریڈکلف ایوارڈ.....تقسیم..... بٹوارا.....فسادات.....قتل و غارت.....اغوا.....جلاؤ گھیراؤ..... چیخ پکار.....منتیں سماجتیں..... لاشوں سے بھرے کنوئیں.....کٹی ہوئی چھاتیاں.....ادھڑے ہوئے پیٹ اور نیزوں پر لٹکتے ہوئے نوزائیدہ وجود.....سہانا خواب.....لہورنگ تعبیر.....ابااوراماں کی پسند کی شادی.....دادا ابا کا انھیں گھر سے نکال دینا.....امرتسر کی حویلی.....سکھوں کے جتھے.....بلوائیوں کا حویلی میں آگ لگانا.....لوٹ مار.....دادا.....دادی.....چچا ظفر کا شہید ہونا۔

چشمِ فلک تاریخ کے ہولناک ترین مناظر دیکھ رہی تھی۔

ابا کہہ رہے تھے،''جب میں نے ریحانہ کو تاک کر برچھی ماری تو وہ سیدھی اس کے دل پر جا کر لگی۔ مجھے ریحانہ کی وہ نگاہیں نہیں بھولتیں جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ جن ہاتھوں سے مجھے اُسے ڈولی میں بٹھانا تھا، انہی ہاتھوں سے میں نے اسے خون میں نہلا دیا۔ مگر میں کیا کرتا؟ اُسے اُس روز نہ مارتا تو وہ زندگی بھر ہر روز ہزار بار مرتی۔''

وقت کے سینے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہوئے ابا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

'' کیسے کیسے ہولناک منظر دیکھنے پڑے۔ کن مشکلوں سے صرف جانیں ہی بچا کر نکلے..... بھرے پُرے گھر چھوڑ دیئے۔ نہ جانے کس کے نصیب میں وہ سب تھا.....اور اِدھر ہمارے نصیب میں ہرنام داس.....'' اماں نے گلوگیر لہجے میں بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اَن چاہی ہجرتیں انسان کے وجود کو بہت سے ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہیں اور باقی ساری زندگی ان ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویریں مکمل کرنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ فضا میں جیسے ایک سرگوشی سی ابھری۔

'' دیکھا نہیں تھا، امرتسر اور لاہور کے درمیان کا علاقہ لاشوں سے کس طرح اٹا پڑا تھا جیسے کوئی بہت وسیع قبرستان ہو۔''

ابا نے اُدھ مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور دونوں کی سسکیاں رات کی تاریکی میں ایک دوسرے میں آہستہ آہستہ مدغم ہوتی چلی گئیں۔

سردی کی ایک زبردست لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر چکی تھی۔

مجھے لگا کہ میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح مر چکی ہوں اور میری لاش بھی لاہور اور امرتسر کے درمیان کہیں بے یارومددگار، بے گوروکفن پڑی سوال کر رہی ہے۔

اگر ہجرت ابا، اماں اور ہرنام داس کے مقدر میں لوحِ ازل پر لکھی جا چکی تھی۔ تو پھر کیا اِس قدر کشت وخون ضروری تھا؟

''اس ادل بدل میں کس نے کیا پایا اور کیا کھویا؟''

جس مٹی سے ان کے خمیر اٹھے، اسے یوں بے سروسامانی میں چھوڑتے ہوئے ان سب نے کیا سوچا ہوگا؟

وقت نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب بڑے بڑے طاقت ور اور حوصلہ مند لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ''is this all?''

یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔

وراثت

انجم جاوید
(کراچی)

بہت بے چین سا رہنے لگا ہوں
اور بہت ہی مضطرب سا بھی
یتیمی کا لقب
بچپن سے میری اُنگلی تھامے چل رہا ہے چارسُو
کبھی بھی موت سے میں ڈر نہیں پایا
یہ تو محبوبہ ہے میری
مری محبوبہ ہر ساعت
گریزاں سی رہی مجھ سے
چرا کے اپنا دامن بھاگتی مجھ سے رہی ہر پل
گھڑی یوں عمر کی بڑھتی رہی
لیکن!
مجھے اب خوف سا محسوس ہوتا ہے
گریزاں رہنے والی یہ میری محبوبہ
اب مجھ کو صدائیں دے رہی ہے
قرب میرا چاہتی ہے
اور مری نظریں
مرے بچوں پہ ٹھہری ہیں
○

''جہادِ زندگانی''

زیبا سعید

(کراچی)

بہی خواہوں، بزرگوں کی دعا اچھی نہیں لگتی
مریضانِ محبت کو دوا اچھی نہیں لگتی

یہ کیسے مومنیں ہیں کارزارِ زندگانی میں
جنہیں خود پیرویٔ فاطمہ اچھی نہیں لگتی

ہجومِ ناشناساں کام کر گیا جب سے
کریں کیا ہم کو شکلِ آشنا اچھی نہیں لگتی

اضافہ اور پریشانی میں ہوتا ہے سو ان کو
مری زلفِ پریشاں کی ہوا اچھی نہیں لگتی

جہادِ زندگانی کی نہیں حرمت سے جو نہیں واقف
انہیں تو شاعری بھی رزمیہ اچھی نہیں لگتی

حیا سے بڑھ کے زیور قیمتی کوئی نہیں ہوتا
جو عورت مشرقی ہو بے ردا اچھی نہیں لگتی

بدن پر جو بھلے لوگوں کے سجتی تھی سدا زیبا
ریاکاروں کے تن پر وہ قبا اچھی نہیں لگتی

ایم۔کے۔بھان تمنّا

(جموں، کشمیر)

دل کے ارماں یوں بھی نکالے جاتے ہیں
آنکھوں میں کچھ خواب بھی پالے جاتے ہیں

گردِ سفر تو رہ جاتی ہے پیچھے ہی
ساتھ سفر میں پاؤں کے چھالے جاتے ہیں

بڑی دیر تک رہتا نہیں ہے ان کا اثر
پردے حقیقت پر جب ڈالے جاتے ہیں

محفل کی رونق ہوتی ہے جن کے سبب
محفل سے وہ لوگ نکالے جاتے ہیں

کس قدر تسکین سی ملتی ہے دل کو
جب دل کے ارمان نکالے جاتے ہیں

جب نظروں کے اشارے ٹکرائیں ان سے
دل کی ہر اک بات اُڑا لے جاتے ہیں

دُور جو رہتے ہیں انسانی قدروں سے
لوگ وہ کس سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں

دل کو تمنّا ہوتے ہیں دونوں ہی عزیز
ساتھ خوشی کے غم بھی پالے جاتے ہیں

شگفتہ نازلی

(لاہور)

راستے میں کوئی شجر ہوتا
جھانکتا گھر سے کوئی در ہوتا،

ہے جمود و سکوت بے معنی
کوئی درپیش ہی سفر ہوتا،

راستہ کِس قدر سہل لگتا
ساتھ کوئی جو ہمسفر ہوتا،

جو نشانِ سفر بتایا تھا
رکھا واں پہ کبھی حجر ہوتا،

راستے کی تھکن اُتر جاتی
منتظر کاش کوئی گھر ہوتا،

کام جو کر چلے جداگانہ
ایسا ہی نفس ہے اَمر ہوتا!

○

عطاءالرحمٰن قاضی

(عارف والا)

زخم پت جھڑ کا کسی صورت چھپانا چاہیے
شاخ پر اک پھول، ہاتھوں سے بنانا چاہیے

کیا خبر قرنوں پہ پھیلی پیاس مٹ جائے یونہی
ہاتھ میں ٹوٹا ہوا ساغر اٹھانا چاہیے

آخرِ شب ہے عذابِ ہجر کی شدّت نہ پوچھ
درد بڑھتا جا رہا ہے مسکرانا چاہیے

بے نمو پہنائیوں میں رنگ کا دریا بہے
آئینے کے کھیت میں شعلہ اُگانا چاہیے

اتنی دُوری میں پڑا ہوں خود تک آنے کے لیے
روشنی رفتار ہُوں پھر بھی زمانہ چاہیے

چھوڑ کر آب و ہوا، اِس شہرِ امکانات کی
اُس کی آنکھوں کے فسوں میں ڈوب جانا چاہیے

زخم ایسا ہے کہ لَو دینے لگا ہے پھر عطاؔ
راز ایسا ہے کہ خود سے بھی چھپانا چاہیے

○

عارف شفیق

(کراچی)

میں تجھ کو یاد اگر کربلا نہیں رکھتا
تو آندھیوں میں جلا کر دیا نہیں رکھتا

سب اس کے بندے ہیں بس اتنا جانتا ہوں میں
میں اس سے ہٹ کے کوئی فلسفہ نہیں رکھتا

عجیب خوف ہے اس شہر میں کہ شام کے بعد
کوئی بھی گھر کا دریچہ کھلا نہیں رکھتا

تمہی کہو وہ بھلا کیسے جیت سکتا ہے
شکست کھانے کا جو حوصلہ نہیں رکھتا

یہاں بھی کشتیاں اپنی جلا کے آیا تھا
میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں رکھتا

تو میرے دل میں بھی نفرت بسیرا کر لیتی
اگر میں ذہن دریچہ کھلا نہیں رکھتا

مری فقیری پہ ہنستا ہے کیوں امیر شہر
میں اپنی گدڑی میں یہ دیکھ کیا نہیں رکھتا

مزاج لوگوں کے جب سے ہوئے ہیں زہریلے
کوئی بھی پھل ہو یہاں ذائقہ نہیں رکھتا

کیوں ایسی بستی میں آ کر تو بس گیا عارفؔ
جہاں کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

ہو گیا مشکل مرا جینا بہت
کر دیا اس نے مجھے رسوا بہت

میں تیرے قد کے برابر تو نہ تھا
ہو گیا ہوں تجھ سے اونچا بہت

پڑھنے لکھنے نے کیا بزدل مجھے
رعب تھا ورنہ یہاں میرا بہت

ہارنا ہم کو کہاں منظور تھا
ہم نے مانا تھا گھٹن رستہ بہت

کچھ نہ سوچا تیرے پیچھے چل دیا
ہر قدم کھایا مگر دھوکا بہت

بھیڑ مرے ہر طرف بڑھنے لگی
ہو گیا میں اور بھی تنہا بہت

○

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

رہا جب تک تری مرضی کے اندر
عناصر تھے مری مٹھی کے اندر

تماشا اُس کی آنکھوں میں عجب تھا
لگی تھی آگ سی پانی کے اندر

اِسے چھوڑ کر میں جاؤں گا کیسے
مجھے رہنا اِسی مٹی کے اندر

تھے اس کے نرم لہجے کے اثر میں
بدن جلنے لگا سردی کے اندر

جلی تو پڑ گئے بَل اور زیادہ
بندھا تھا میں عجب رسّی کے اندر

مہکتے موسموں کے سبز منظر
عجب کچھ لوگ تھے بستی کے اندر

پھٹے کپڑے فقط دیکھے ہیں تم نے
نظر آتا بھی کیا ہستی کے اندر

کبھی باہر عدیلؔ آیا نہیں ہے
پہاڑ ایسے چھپا رائی کے اندر

○

امر مہکی
(اٹک)

ترے فراق میں کب تک اِدھر اُدھر جائیں
جو تُو مِلے تو ترے بازوؤں میں مر جائیں

ہم اپنا درد لیے جائیں تو کِدھر جائیں
خفا نہ ہو تو ترے در پہ ہم ٹھہر جائیں

ترے بغیر کہیں بھی ہمیں قرار نہیں
ترا خیال ستاتا ہے ہم جِدھر جائیں

تری کتاب سے نکلے ہوئے ورق ہیں ہم
ہمیں سنبھال ہوا سے نہ ہم بکھر جائیں

ہمارے دکھ پہ کوئی بھی نہیں اُداس امرؔ
کسی کو کیا ہے بھلے جاں سے ہم گذر جائیں

○

احسان قادر
(لاہور)

وہ جن کے نشانے خطا ہو گئے ہیں
وہی لوگ ہم سے خفا ہو گئے ہیں

تری جستجو کا اثر کیا یہ کم ہے
گنہگار تھے پارسا ہو گئے ہیں

یہ انسان اپنی حقیقت میں کیا
مرے دیکھتے کیا سے کیا ہو گئے ہیں

تجھے پا بھی لیتے تو ناخوش ہی رہتے
چلو خیر سے ہم جدا ہو گئے ہیں

یہ کیا معجزہ ہے ترے در پہ آ کر
خطا کار اہلِ صفا ہو گئے ہیں

ہم اہلِ سخن اور اہلِ وفا تھے
تجھے مل کے فرد آشنا ہو گئے ہیں

یہ کیا عہدِ علم و ہنر ہے کہ جس میں
جہالت کو رتبے عطا ہو گئے ہیں

میں احسان قادرؔ اسی راہ پر ہوں
جہاں میرؔ سے پیشوا ہو گئے ہیں

○

ظہیر اقبال زیدی (میرپورخاص)

حقیقتوں سے مری جاں فسانہ اچھا ہے
کسی طرح سے تجھے بھول جانا اچھا ہے

جو یاد کربِ مسلسل کی ایک صورت ہو
تو ایسی یاد کو دل سے بھُلانا اچھا ہے

جسے بھی زخم لگے جاں بر نہیں ہوتا
تمہارے تیر نظر کا نشانہ اچھا ہے

جو آنکھیں تم کو کبھی جان سے بھی پیاری تھیں
اُنہیں کیا خون کے آنسو رُلانا اچھا ہے

جب اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلے
وہ وقت اچھا ہے، گزرا زمانہ اچھا ہے

گزرنے والوں کو پیچھے پلٹ کے مت دیکھو
جو کھیل ختم ہو، پردہ گرانا اچھا ہے

○

ظفر علی ظفر (اسنسول، بھارت)

جو تھے ذرے آسماں پر وہ ستارے ہو گئے
اے زمیں کچھ تو بتا کتنے خسارے ہو گئے

میں جو غوطہ زن ہوا تو مل گئے لعل و گہر
سنگ ریزے بحر کے خود ہی کنارے ہو گئے

اس قدر بیخوف آہو پھر رہے ہیں دشت میں
پوچھئے مت وحشتوں کے وارے نیارے ہو گئے

رکھ لیا میں نے بھرم اپنے جنوں کا بزم میں
لفظ شعروں کے مرے جب استعارے ہو گئے

اڑ رہی ہیں تتلیاں ہر شاخ گل پر آج کل
ہر طرف گلشن میں پھولوں کے نظارے ہو گئے

یہ ضروری ہے کہ چھیڑیں جنگ اب انکے خلاف
آج ہم اپنی زمیں پر بے سہارے ہو گئے

چوٹ سر پر لگتی ہے تو پاؤں میں ٹھوکر ظفرؔ
دشمن جاں سارے بام و در ہمارے ہو گئے

○

نوید سروش (میرپورخاص)

میں قمر ساتھ لے کے چلتا ہوں
اپنا گھر ساتھ لے کے چلتا ہوں

ساتھ چلتا نہیں ہے وہ میرے
میں مگر ساتھ لے کے چلتا ہوں

اپنے حالات سے نہیں غافل
ہر خبر ساتھ لے کے چلتا ہوں

اُس کو بھی بے خبر نہیں رکھتا
نامہ بر ساتھ لے کے چلتا ہوں

جو تمہیں دھوپ سے رکھے محفوظ
وہ شجر ساتھ لے کے چلتا ہوں

تیری یادون کو روشنی کے لیے
رات بھر ساتھ لے کے چلتا ہوں

بے گھری کا نہیں گلہ مجھ کو
اک نگر ساتھ لے کے چلتا ہوں

دار سے جانے کب صدا آ جائے
اپنا سر ساتھ لے کے چلتا ہوں

دوست دشمن پہ جو رہے ہمدم
وہ نظر ساتھ لے کے چلتا ہوں

میں بظاہر سروشؔ ہوں تنہا
ہم سفر ساتھ لے کے چلتا ہوں

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۱۰

کالی اپنا منہ کھول کر پھنکاری تو چترے نے جواباً اپنی دم کا چھنچھنا بجاتے ہوئے منہ کھولا۔ پھر دونوں نے اپنا اپنا منہ بند کیا اور اپنی اپنی زبان نکالی۔ اس زبان نکالنے کے عمل نے کوئی ایسا جادو کیا کہ کالی نے اپنا پھن سکیڑ کر سرزمین پر رکھ دیا۔ چترے نے جواباً بالکل ویسا ہی کیا۔ دونوں کے منہ کا درمیانی فاصلہ تقریباً ایک فٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں نے اپنی زبان نکال کر ایک دوسرے کو محسوس کیا۔ اور ان کے سروں کا درمیانی فاصلہ ایک ایک انچ کر کے گھٹنا شروع ہوا۔ پھر دونوں کے سر ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ دونوں کی زبانیں ایک دوسرے کو چھونے لگیں۔ زبان کے چھوتے ہی دونوں کے جسم ایک ساتھ اٹھے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے کے انداز میں لپٹ گئے۔ بالکل ایسے جیسے دو پرانے دوست کافی عرصہ بعد ایک دوسرے کو پہچان کر گلے ملتے ہیں۔ میں نے باپو کو حیرت سے دیکھا۔ وہ بھی میری طرح اس اسرار پر محوِ حیرت ہو کر کہنے لگے۔ تم نے دیکھا رامو۔ لگتا ہے یہ دونوں پچھلے جنم کے ساتھی ہیں۔ ہاں باپو میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہے، میں نے جواب دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے غار میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دونوں غار سے نکل کر مجھ سے لپٹ گئے۔ کافی دیر تک میرے ساتھ کھیلنے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد باپو بولے، سانپ بے پیر شے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کبھی ہمیں ڈس لے۔ میں نے اس کا زہر نکال کر خود کو بھی لگایا ہے اور تمہیں بھی لگانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک جار سے زہر بجھا کانٹا نکال کر مجھے چبھویا اور یہ عمل اگلے چند دن تک برقرار رکھا۔ اگلے چار دن تک میں باپو کو اپنے ہفتے بھر کی کارکردگی پوری تفصیل سے بتاتا رہا۔ انہوں نے میری ایک ایک بات بڑے غور سے سننے کے بعد بس اتنا کہا، لگتا ہے بڑے لوگ انجانے میں اپنے لیے مسائل پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے دونوں کے مسائل بڑی محنت سے مستقل طور پر حل کیے۔ اگر تم نواب کو بھی کھگل کے برادے والے پانی میں نہلا دیتے تو اچھا تھا۔ ہو سکتا ہے اب کوئی اور سانپ ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہو۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ اس بات کا امکان اگرچہ ہے ضرور لیکن بہت کم ہے۔

پچھلے چار دن سے کالی مجھے بہت کم نظر آئی تھی۔ جس دن مجھے کالج کے لیے گاڑی لینے آئی، کالی چترے کے ساتھ غائب تھی اس لیے اسے ساتھ نہیں لے جا سکا۔ ہاسٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو دروازے کے اندر فرش پر دو خطوط لندن سے آئے تھے۔ میں نے جینا اور ٹام کے خطوط کھول کر پڑھے اور ان کو اسی وقت جواب لکھ کر کمرے میں پڑے ہوئے لفافوں میں ڈال کر بند کر دیے۔ ایک مختصر خط اپنی منہ بولی بہن سارہ کو حسبِ وعدہ لکھ کر اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر اس وعدے کے ساتھ لکھا کہ میرا اگلا خط تفصیل سے لکھا ہوا آئے گا۔ اس کے بعد مہاراج کو، بابا کو، اور نواب صاب کو ایک ایک خط اپنے پہنچنے کی اطلاع کے ساتھ ان کی محبتوں کے شکریے کے طور پر لکھا۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو امر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگا۔ میرے کمرے میں چلو، چائے تیار ہو رہی ہے۔

میں اپنا کمرہ بند کر کے اس کے کمرے میں گیا جہاں ارون بھی موجود تھا۔ ہم تینوں چائے کے دوران اپنی چھٹیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے انہیں اپنی جے پور اور اجمیر والی مصروفیات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی انہوں نے اس کی تفصیل میں جانے کی کوشش کی۔ ہاں میں نے ارون کو ڈسنے والے سانپ کی واپسی کا ذکر ضرور کیا۔ وہ حیرت سے پوچھنے لگا، تو اب تم اس سانپ کا کیا کرو گے؟ فی الحال تو ہم نے اسے اپنے پالتو سانپ کیساتھ رکھ چھوڑا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش بھی نظر آتے ہیں، میں نے اسے بتایا۔ اچھا کبھی میں تمہارے ہاں چل کر اسے دیکھوں گا، ارون بولا اور ہاں میرے ڈیڈی تمہارے نہ آنے سے خاصے دل برداشتہ تھے۔ انہوں نے مجھے اکیلے شملہ نہیں بھیجا۔ کہتے تھے رامو کو اپنے ساتھ لاؤ گے تو شملہ جاؤ گے۔ پھر کہنے لگا یار اگر اپنے لیے نہیں تو کم از کم میرے لیے اب کے گرمیوں کی چھٹیوں میں آ جاؤ۔ اس بہانے تم لوگ میرا گھر بھی آ کر دیکھ جاؤ گے، امر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ سانپ میری کمزوری ہیں اور میرے تمام وعدے سانپوں پر آ کر ختم ہو جائیں گے۔ اگر سانپ کہیں درمیان میں نہ آئے تو ہم ضرور چلیں گے۔ اس پر امر نے پوچھا، اچھا تو اشوک کے ہاں سانپوں کا کیا مسئلہ تھا؟ میں نے کہا، اس کی تفصیل بتانا میری پیشہ وارانہ فطرت کے منافی ہے۔ بس اتنا بتا دوں کہ میں سانپوں کے سلسلے میں ان کے کسی کام ضرور آیا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے اس سلسلے میں مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دوسرے دن سے کلاسیں شروع ہو گئیں۔ مصروفیت بڑھ گئی پھر کچھ عرص کے بعد گیارویں کے سالانہ امتحانات شروع ہونے تھے۔ امتحانات کی تیاری کے لیے میں نے باقی دنیا سے گویا قطع تعلق کر لیا۔ میں نے پہلے کی طرح اپنا روزانہ کا معمول ایک بار پھر بحال کر لیا۔ یعنی کمرہ، لائبریری اور کبھی کبھار امر کے ساتھ چائے کی حد تک رہ گیا تھا۔ امتحانات شروع ہوئے تو اتوار کے روز اپنے گھر جانا بند کر دیا۔ امتحان کے بعد پریکٹیکل کے لیے ابھی کچھ دن باقی تھے۔

ایک روز میں حسبِ عادت لائبریری میں اپنا وقت گزار رہا تھا کہ مسٹر والٹن کا چپڑاسی مجھے بلانے آیا۔ میں چپڑاسی کے ساتھ مسٹر والٹن کے کمرے

کی جانب بڑھا تو اس نے کہا، جی وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں گرلز ہاسٹل میں ہیں۔ چپڑاسی کے ساتھ گرلز ہاسٹل کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں مسٹر والٹن کے ساتھ ایک بڑی عمر کی موٹی سی گوری عورت بیٹھی تھی۔ مسٹر والٹن نے عورت سے متعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا، یہ مس بوٹاک ہیں۔ مس بوٹاک لڑکیوں کے ہاسٹل کی وارڈن ہیں اور یہ تم سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی ہیں۔ مسٹر والٹن نے مس بوٹاک سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی شاید یہ کام میرے آنے سے قبل ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ مس بوٹاک مجھ سے کچھ کہتیں، انہوں نے چپڑاسی سے کہا، جا کر نیتو کو بلا لاؤ۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ہماری ایک طالبہ کو باہر جھیل پر ایک سانپ نے کاٹا ہے۔ اس کو ابھی تک اس کاٹ سے کوئی درد یا تکلیف نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں چاہتی ہوں آپ اس کی کاٹ کو ایک نظر دیکھ لیں، مسٹر والٹن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ سانپ کی کاٹ دیکھ کر کاٹنے والے سانپ کا نام بتا دیتے ہیں۔ آپ کاٹ دیکھ کر بتائیں کہ اس بچی کو سانپ کی کاٹ سے کسی قسم کا کوئی خطرہ تو نہیں۔ کچھ دیر بعد ایک دراز قد کھلتے رنگ کی شانوں تک گہرے کالے بال اور چہرے مہرے سے چینی یا جاپانی نقوش لیکن موٹی موٹی آنکھوں والی ایک غیر معمولی حسین لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی بھی ایک نظر ڈالنے کے بعد اس پر دوسری نظر ضرور ڈالتا ہوگا اور کئی گردنیں اس کو بار بار دیکھنے کے لیے مڑتی ہوں گی۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹے قد کی سانولی سی لڑکی بھی تھی۔ مس بوٹاک نے خوبصورت لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا، نیتو، یہ مسٹر ثمان ہیں۔ ہمارے سکول کے ایک ہونہار طالبعلم ہونے کے علاوہ یہ سانپوں کے علم پر بھی خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ تم ان سے اپنے سانپ سے ڈسے جانے کی تفصیل بیان کرو۔

لڑکی نے میری جانب دیکھنے کی بجائے اپنے ہاتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، میں بالکل ٹھیک ہوں مس۔ مجھے کسی کو کچھ بتانے یا دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکی کے بات کرنے کے انداز سے اور اس کی ہر ادا سے غرور صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے جس ہاتھ کی جانب اشادہ کیا تھا میں نے غیر ارادی طور پر وہ ہاتھ چھو کر زخم دیکھنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے دور کھینچتے ہوئے نخوت سے کہا، آپ کو میرا ہاتھ چھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ سانپ کاٹنے کے بعد سے اب تک مجھے معمولی سا درد بھی نہیں ہوا۔ میں نے جھینپ کر اپنا ہاتھ تو واپس کھینچ لیا لیکن اس دوران میں نے اس کے ہاتھ پر سانپ کی کاٹ کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

اس سے مخاطب ہونے کی بجائے میں نے بھی مس بوٹاک سے مخاطب ہو کر کہا، ایسا لگتا ہے اس لڑکی کو آری سانپ نے کاٹا ہے۔ اس سانپ کو آری سانپ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے جسم پر آری جیسے دندانے ہوتے ہیں۔ اور یہ سانپ جسم کے دندانوں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر ایسی آواز نکالتا ہے جیسے آری سے لکڑی چیری جا رہی ہو۔ بالکل ایسے جیسے چھنچھنا سانپ دُم بجا کر قریب آنے والے کو ہوشیار کرتا ہے ویسے ہی آری سانپ کی آواز نکال کر اپنے قریب آنے والے ہوشیار کرتا ہے۔ نیتو کے ساتھ آنے والی لڑکی نے میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا، جی جی بالکل۔ میں نے آری جیسی آواز کاٹ سے پہلے سنی تھی۔ مس بوٹاک نے مجھ سے پوچھا، کیا یہ سانپ زہریلا ہوتا ہے؟

جی ہاں، شیش ناگ کے بعد یہ سانپ ہمارے ملک میں پایا جانے والا سب سے زہریلا سانپ ہے۔ اس کی کاٹ سے درد نہیں ہوتا اور نہ ہی زخم دُکھتا ہے اس لیے بہت سے لوگ پروا نہیں کرتے۔ اس کا زہر ڈسے جانے کے دو تین گھنٹے بعد اثر کرنا شروع کرتا ہے۔ نیتو کے ساتھ آنے والی لڑکی سے میں نے پوچھا، اسے سانپ نے کب ڈسا تھا؟ کوئی ایک گھنٹہ پہلے، لڑکی نے جواب دیا۔ ساتھ آنے والی لڑکی سے میرے سوال پر نیتو کو اور زیادہ غصہ آ گیا۔ اس نے بھنّا کر بڑے گستاخانہ لہجے میں مس بوٹاک سے مخاطب ہو کر کہا، مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے مس۔ میں بالکل ٹھیک ہوں آپ لوگ خواہ مخواہ مجھے پریشان نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے نیتو پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور اس کے پیچھے اس کی سہیلی۔

ان کے اس طرح جانے کے بعد دونوں وارڈنوں نے میری جانب اس انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب اس لڑکی کا کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مس بوٹاک سے کہا، آپ اس پاگل لڑکی پر نظر رکھیں۔ یہ علاج سے بھاگ کر اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کاٹ کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے اس کو متلی کی کیفیت ہوگی پھر اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ برداشت کرنے سے جواب دے جائیں گی۔ پھر اس کے پاؤں ہاتھوں کی انگلیاں شل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ پھر اس کو کھانسی شروع ہوگی اور اس کے بعد اسے دمے کے مریض کی طرح سانس لینے میں تکلیف ہوگی۔ اگر اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کو طبی امداد نہ ملی تو یہ موت کے دہانے پر کھڑی نظر آئے گی۔ آپ اس لڑکی کی سہیلی کو بلا کر یہ سب کچھ بتا دیں۔

مس بوٹاک نے چپڑاسی کو بلا کر کہا، جاؤ اور جلدی سے مونا کو بلا لاؤ۔ اس سے پہلے کہ چپڑاسی مونا کو بلانے کے لیے جاتا، مونا بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی ہمارے کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگی، نیتو اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں گر پڑی ہے اور اب وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اسے متلی کی شکایت تو نہیں ہوئی تھی؟ میں نے مونا سے پوچھا تو وہ بولی، جی ہاں، گرنے سے پہلے اس نے متلی کی شکایت بھی کی تھی۔ میں اٹھتا ہوا بولا، آپ نیتو کو فوراً کلینک لے جائیں۔ میں اپنے کمرے سے منکے لے کر وہاں آتا ہوں۔ وہاں سے تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا۔ منکوں کا جار اٹھا کر کلینک بھی بھاگتا ہوا پہنچا تو نیتو ایک بستر پر نیم مُردہ آنکھیں کھولے گہرے گہرے سانس دشواری سے لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کسی پر توجہ دیے بغیر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس کو آری سانپ نے ہی کاٹا تھا۔ کاٹ پر منکا لگانے کی کوشش کی لیکن منکے نے چپکنے سے انکار کر دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ زہر زخم سے

نکل کر جسم میں پھیل گیا ہے۔ میں نے مسٹر والٹن اور مس بوٹاک کی جانب دیکھ کر کہا، اس لڑکی کو بچانے کا اب ایک ہی راستہ ہے کہ اسے میرا خون دیا جائے۔ پھر میں نے قریب کھڑی نرس سے کہا میں یونیورسل ڈونر ہوں۔ میرے خون کا گروپ ''O+'' ہے۔ میرا خون نکال کر اسے لگاؤ۔

تمہارا خون دینے سے کیا ہوگا؟ مس بوٹاک نے پوچھا۔ میرے خون میں اس سانپ کے زہر کا تریاق موجود ہے۔ اگر میرا خون اسے اگلے چند منٹوں میں نہ دیا گیا تو یہ لڑکی سانپ کی کاٹ سے جانبر نہ ہو پائے گی۔ میری اس تنبیہ پر نرس خون کی خالی بوتل لے آئی تو میں نے اسے کہا، بوتل میں خون لینے سے وقت ضائع ہوگا۔ تم میرے جسم سے خون لے کر اس کے جسم میں براہِ راست داخل کرو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ایک پلاسٹک ٹیوب جس کے دونوں سروں پر سوئیاں لگی تھیں نکالی اور ایک سوئی میرے جسم سے خون نکالنے اور دوسری سوئی نیتو کے جسم میں خود ڈالنے کے لیے داخل کر دی۔ میرا بستر قدرے اونچا رکھا گیا تھا۔ میرا خون اونچائی سے ثقل کی طاقت میں نیتو کے جسم میں داخل ہونے لگا تو میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔

کلینک کے عملے کے علاوہ اس وقت نیتو کے بستر کے پاس مسٹر والٹن، مس بوٹاک اور مونا کے علاوہ کچھ لڑکے اور لڑکیاں کھڑے مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں رچرڈ بھی کلینک آ پہنچا۔ شاید اسے بھی اس حادثے کی اطلاع بھجوائی گئی تھی۔ مجھے بستر پر لیٹے دیکھ کر رچرڈ نے پوچھا، تمہیں کیا ہوا ہے؟ میری بجائے مسٹر والٹن نے اسے تفصیل بتائی تو اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا، خون لینے کے بعد کب تک اس لڑکی کی حالت سنبھل سکے گی؟ میں نے جواب دیا، مجھے اس کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ اس لڑکی میں کتنا زہر داخل ہوا ہے اور دوسری یہ کہ میرے خون میں اس سانپ کے زہر کا کتنا تریاق موجود ہے۔ نیتو کی آنکھیں اگرچہ کھلیں تھیں اس کے باوجود وہ اپنے حواس میں نہیں تھی اور وہ اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔ خون دینے کے دوران میری آنکھیں مسلسل نیتو کے پاؤں کے ناخنوں پر جمی تھیں۔ جب ناخنوں کی نیلاہٹ سرخی میں بدلنے لگی تو اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونا شروع ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس کو سانس لینے میں آسانی ہونے لگی اور اس کے چہرے کی زردی پھیکی پڑنے لگی۔ یہ تمام نشانیاں اچھی تھیں۔

کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد میں نے نرس سے خون روکنے کو کہا۔ اس نے ہم دونوں کے جسم سے سوئیاں نکال لیں۔ میں نے اٹھتے ہی نیتو کے پاؤں کے تلوے پر گدگدی کی تو اس نے آنکھیں کھولے بغیر اپنے پاؤں سکیڑ لئے جو اس کے پاؤں میں سانپ کا کٹ کا اثر زائل ہونے کے بعد اس کی کھوئی ہوئی طاقت کے واپس آنے کی دلیل تھی۔ اس کے بعد میں نے سب سے مخاطب ہو کر کہا، یہ لڑکی ایک گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک ہو جائے گی۔ رچرڈ نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا، تم ایک بار پھر ہمارے کام آئے ہو۔ مسٹر والٹن اور مس بوٹاک نے بھی بڑے جوشیلے انداز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ اب یہاں میرا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے میں چلتا ہوں۔ مجھے یقین ہے اب آپ کو میری ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر میری ضرورت پڑے تو میں اپنے کمرے میں ہوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں اپنے منکوں کا جارا اٹھائے ہوئے کلینک سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں امر کے ہاں گیا۔ جہاں ارون بھی حسب توقع موجود تھا۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ارون اور امر سے پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ کیمسٹری اور فزکس کے پریکٹیکل کے درمیانی وقفے کے دوران وہ میرے ساتھ چلیں گے۔ انہیں کل اپنے ہاں جانے کے لیے تیار رہنے کا کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے نیتو والے واقعے کے بارے میں ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

دوسرے دن کیمسٹری پریکٹیکل کے بعد ارون اور امر کے ساتھ گاڑی پر گھر کی راہ لی۔ ارون اور امر بھی امتحانوں کے بعد کچھ سستانا چاہتے تھے۔ دونوں پہلے بھی ہمارے ہاں آ چکے تھے۔ انہیں باپو سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا اور باپو بھی دونوں سے کھل کر باتیں کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں مَیں نے باپو سے آری سانپ والے واقعے کا ذکر بھی نہیں کیا۔ میں نے ارون کو دور سے چتر ا دکھایا ضرور مگر اس کے قریب نہیں جانے دیا۔

اگلے دو دن جلدی گزر گئے۔ تیسرے دن ہم ہاسٹل واپس آ کر فزکس کے پریکٹیکل کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ فزکس کے امتحان سے فرصت کے بعد دوسرے دن میرا نباتات کا پریکٹیکل تھا اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں لائبریری جا کر تیاری کرنے بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ مونا میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولی، میں پچھلے دو دن سے آپ کو کھوج رہی تھی۔ پھر مس بوٹاک کے ذریعے مسٹر والٹن سے معلوم ہوا کہ آپ گھر چلے گئے ہیں۔ لگتا ہے آپ یہاں سے کہیں قریب ہی رہتے ہیں۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔ آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ جی فرمایئے، میں نے کہا۔ یہاں نہیں، کیا آپ ایک گھنٹے تک جھیل کے کنارے آ سکتے ہیں؟ مونا بولی۔ ایک کی بجائے دو گھنٹے بعد زیادہ بہتر رہے گا۔ اس وقت دوپہر کا ایک بجا ہے میں دو گھنٹے میں اپنی تیاری مکمل کر کے وہاں آ جاؤں گا۔ میں نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جی اچھا شکریہ، وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ہماری گفتگو بڑے دھیمے لہجے میں ہوئی تھی اس لیے کسی اور نے نہیں سنی تھی۔ مونا کے جانے کے بعد میں امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

مجھے اپنا کام سمیٹتے ہوئے دو گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگے تو میں حسبِ وعدہ جھیل کے کنارے پہنچا۔ جہاں مونا کے ساتھ نیتو بھی بیٹھی تھی۔ جی فرمایئے، آپ نے مجھے بُلایا ہے؟ میں نے قریب کھڑے ہو کر مونا سے پوچھا۔ میں نے

نہیں، نیتو نے آپ کو بُلوایا ہے، وہ نیتو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ میں نے نیتو کی جانب دیکھ پر پوچھا، جی فرمایئے؟ تم نے مجھے مرنے کیوں نہیں دیا؟ نہ جانے میں کب سے مرنے کی پرارتھنا کر رہی تھی۔ بھگوان نے میری سنی اور تم درمیان میں ٹپک پڑے۔ میں کسی طرح بھی نیتو کی جانب سے رُش لہجے میں کسی ایسے سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ٹپکا نہیں ٹپکایا گیا تھا۔ ویسے میری بلا سے تم جب چاہو مر سکتی ہو۔ اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے مجھے بچایا ہی کیوں تھا؟ اس نے کڑواہٹ سے کہا۔ میں نے تمہارا علاج کر کے اپنے پیشے کا تقاضہ پورا کیا ہے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے جھیل کے پانی میں ڈوب مرو، یا کچھ کھا کر مر جاؤ۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں بچانے کے لیے نہیں آؤں گا۔ میرے جواب میں ویسی ہی کڑواہٹ تھی جیسی اس کے سوال میں تھی۔ میری جان بچا کر تم اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھ رہے ہو گے، ہاں؟ اس نے مجھے مزید چوٹ دینے کی کوشش میں کہا۔ نہیں، میں کوئی ہیرو شیرو نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے تمہاری جان بچائی ہے۔ زندگی بھگوان کی دین ہے اور وہی جب تک چاہے ہمیں زندہ رکھتا ہے میں نے بھی بدستور کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

اور تم یہ بھی سمجھتے ہو گے کہ تم نے میری جان بچا کر میرا دل جیت لیا ہے؟ اس نے ایک اور تلخ وار کیا تو مجھے اس پر اور زیادہ غصہ آ گیا اور میں نے کہا، نہ جانے تمہیں کس نے اس غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ مجھے تمہارا دل جیتنے کا شوق نہیں اور اگر سچ پوچھو تو مجھے تم سے بات کرنے کا بھی کوئی شوق نہیں۔ میں یہاں کبھی نہ آتا اگر بلایا نہ گیا ہوتا۔ میں مزید کچھ کہے بنا وہاں سے واپسی کے لیے مڑا تو مونا نے مجھے روکتے ہوئے کہا، پلیز آپ نیتو کو سمجھنے کی کوشش کریں، یہ آپ کو چھیڑ رہی تھی۔ میں نے کہا، مجھے اس کو سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی سہیلی ہے اس لیے آپ ہی اسے سمجھئے یا اس کا بھگوان اسے سمجھے۔ اور جہاں تک چھیڑ خوانی کا تعلق ہے تو وہ اپنوں سے اور پیاروں سے کی جاتی ہے، غیروں اور اجنبیوں سے نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ یہ کہتا ہوا میں وہاں سے چل پڑا تو پیچھے سے نیتو کی آواز آئی، اگر میں تمہارے لیے اجنبی ہوں تو تم نے خون دینے کے بعد میرے پاؤں پر گدگدی کیوں کی تھی؟

میں نے رُک کر پیچھے دیکھا اور کہا، اگر میری گدگدی نے آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کا مقصد کوئی چھیڑ خوانی نہیں تھا۔ تو پھر گدگدی کا مقصد کیا تھا؟ اس نے اپنی بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانک کر معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔ سانپ کا زہر پاؤں پر اثر انداز ہو کر ان کی طاقت سلب کر لیتا ہے جس کی وجہ سے تم اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں تمہارے پاؤں گدگدا کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زہر کا اثر زائل ہونے کے بعد تمہارے پاؤں دوبارہ حساس ہو گئے ہیں یا نہیں۔ اور ہاں اگر کبھی موقع ملے تو کسی سے بات کرنے کی تمیز ضرور سیکھ لینا۔ میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے واپس چل دیا۔ پیچھے سے دونوں آوازیں دے کر مجھے روکنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن میں نہیں رکا۔

مجھے اس لڑکی کے مغرور ہونے کا اندازہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب اس نے مجھے اپنا ہاتھ چھونے سے منع کر دیا تھا۔ آج مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ خوبصورت نیتو مغرور ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دماغی خلجان میں بھی مبتلا تھی۔

میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ ارون سے راستے میں ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا، تم کہاں غائب تھے؟ ذرا جھیل تک گیا تھا، میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے کہ چند روز پہلے تم نے کس کو بچایا تھا؟ میں نے کہا، ہاں ایک مغرور لڑکی جس کا نام نیتو ہے کو بچایا تھا۔ تمہیں معلوم ہے وہ کون ہے؟ ارون نے پوچھا۔ نہیں اور نہ ہی اسے جاننا چاہتا ہوں، میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ارون حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، تم کافی غصے میں ہو، خیر تو ہے؟ میں نے تمہارا غصے والا یہ روپ آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اسے کچھ دیر پہلے جھیل پر گزرا ہوا واقعہ سنایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا، بھئی واہ، مزہ آ گیا۔ ایسے میں ہم امر کے کمرے میں پہنچے۔ ارون نے امر کو وہ واقعہ سنایا تو وہ دونوں ہنسنے لگے۔ تمہیں کس بات کا مزہ آیا ہے اور اس واقعے میں ہنسنے والی بات کونسی ہے؟ میں نے دونوں کو ہنستے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ تم نے تو کمال کر دیا، دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔ کاہے کا کمال؟ میں نے بدستور حیرت سے پوچھا۔ تم نے اسے وہ کچھ کہا ہے جو اس کالج میں آج تک کوئی کہنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس میں نہ کوئی کمال کی بات ہے اور نہ ہی کسی جرأت کی۔ میں نے اس کے بارے میں جو محسوس کیا بغیر کسی لاگ لپٹ کے اسے کہہ دیا، میں نے جواب دیا۔

ارون بولا، تم اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتے، نیتو ہمارے کالج کی حسین ترین اور مغرور ترین لڑکی مشہور ہے۔ کسی لڑکے کو گھاس نہیں ڈالتی۔ ایک دو لڑکوں کو تو سب کے سامنے بے عزت بھی کر چکی ہے۔ ان میں راجکمار اشوک کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی ہے۔ باپ کشمیری میمن ہے اور ماں چینی ہے اس لیے کھانڈ کو چینی کہتی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً تقریباً کھانڈ کی تمام فیکٹریاں اُن کی ملکیت ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے شراب کشید کرنے کی بھی کئی کارخانے ہیں۔ میں نے کہا، میری صحت پر نہ پہلے کچھ فرق پڑتا تھا اور نہ اب پڑتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے اپنے لیے ہے۔ دوستوں سے باتیں کر کے میرے من کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا۔

دوسرے دن امر اور ارون امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ارون نے مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کہہ دیا کہ پھر کبھی چلوں گا۔ نباتات کا پریکٹیکل دینے کے بعد ایک روز کی چھٹی تھی اس لیے لائبریری نہیں گیا۔ میرے پاس پچھلے کئی دنوں سے خطوط آئے ہوئے تھے لیکن امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے کسی کو جواب نہ دے سکا تھا۔ سارہ باجی کا خط بھی آیا ہوا تھا۔ ان کے خطوط بڑے سادہ اور محبت بھرے ہوتے تھے۔ نہ جانے

میرے جی میں کیا آیا میں نے نیتو کا سارا واقعہ سارہ باجی کو لکھ دیا۔ میرا یہ خط کافی طویل ہو گیا لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ آخر دل کی بھڑاس کہیں تو نکالنا تھی۔ اس کے بعد جینا، ٹام، بابا اور مہاراج کو بھی خطوط لکھے۔ خطوط لکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس ڈاک کے ٹکٹ ختم ہو گئے تھے۔ بغیر ٹکٹ کے لفافے ہاتھ میں لئے ڈاکخانے کی جانب چل پڑا۔ ٹکٹ خریدنے کی لائن میں کھڑا ہوا تو پیچھے سے کسی نے ہیلو کہا۔ مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے مونا کھڑی تھی۔ میں نے بھی روایتاً جواب دیا۔ پوچھنے لگی، آپ آج لائبریری کیوں نہیں آئے؟ میں نے روکھے انداز میں جواب دیا، مجھے آج لائبریری جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کل والے واقعے سے ابھی تک ناراض معلوم ہوتے ہیں، اس نے کہا۔ نہیں مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے بی بی، میں نے جواب دیا۔ کہنے لگی، میں اپنی نہیں نیتو کی بات کر رہی ہوں۔ میں نے کہا، انسان اپنوں اور پیاروں سے شکوہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ آپ کی سہیلی سے میرا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اس سے ناراض ہونے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔

ایسے میں ٹکٹ لینے کی میری باری آ گئی۔ میں نے ٹکٹ لے کر کچھ تو لفافوں پر چسپاں کرنے کے بعد لفافے کلرک کو دئے اور باقی ٹکٹ اور لفافے اپنے ساتھ لے کر ڈاکخانے سے نکلا تو مونا بھی میرے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولی، آپ میرے ساتھ صرف ایک بار جھیل تک آ جائیں، پلیز۔ اپنی بے عزتی کروانے کے لیے؟ میں نے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ نہیں بالکل نہیں۔ کوئی آپ سے اپنی کل والی حرکت پر معافی مانگنا چاہتا ہے، مونا نے جلدی سے جواب دیا۔ آپ اس کوئی کو بتا دیں کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے، میں نے لفظ کوئی پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پلیز، آپ سمجھنے کی کوشش کریں، مونا نے ملتجی ہو کر کہا۔ میں نے جواب دیا، مونا جی۔ میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہا ہوں۔ میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس مسئلے میں نہ پڑیں اور اپنی سہیلی سے کہیں کہ وہ بھی اس معاملے کو مزید الجھانے کی بجائے اگر یہیں ٹھپ کر دے تو ہم سب کا بھلا ہو گا۔ میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا اور آج ایک بار پھر اپنی بات دُہراتا ہوں۔ نہ میں کوئی ہیرو ہوں، نہ ہی میں نے کسی پر کوئی احسان کیا ہے، اور نہ ہی مجھے کسی کا دل جیتنے کا شوق ہے۔ میں نے اپنے پیشے کے متقاضی اپنا فرض نبھایا ہے اور بس۔ جس کے لیے نہ مجھے کسی کا شکریہ چاہیے اور نہ ہی کسی کی معذرت۔

ہم دونوں ایک ساتھ ڈاکخانے سے نکلے تو مجھے چاچو نظر آئے۔ ان کا نظر آ جانا میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ میں مونا سے معذرت کرتا ہوا ان کی جانب بڑھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر میری جانب آئے۔ ان کو میری جانب آتا دیکھ کر مونا پیچھے رہ گئی۔ میرے قریب آ کر وہ شکایتی لہجے میں بولے، رامو بیٹے خیریت تو ہے تم کافی دنوں سے نظر نہیں آئے؟ امتحان میں مصروف تھا چاچو، میں نے جواب دیا۔ پرچے کیسے ہوئے؟ الحمدواللہ اچھے ہو گئے ہیں چاچو۔ پریکٹیکل پرسوں ختم ہوں گے، میں نے کہا۔ تمہاری ماں تمہارے لیے اداس ہے۔ کہہ رہی تھی راموا ب مہینوں شکل نہیں دکھاتا۔ میں نے کہا، میں بھی امی کے لیے اداس ہو رہا ہوں۔ آپ آج گھر جاتے ہوئے مجھے ساتھ لیتے جائیں۔ کل میری چھٹی ہے اور پرسوں آخر پریکٹیکل ہے اس لیے کم از کم آج اور کل میں امی کے پاس رہ لوں گا۔ پھر پرسوں پریکٹیکل کے بعد گھر چلا جاؤں گا۔ تو پھر ابھی چلو، میں گھر ہی جا رہا تھا، انہوں نے کہا۔ ہم بڑے گیٹ سے باہر آئے تو چاچو کو ایک سکوٹر کے پاس رکتے دیکھ کر میں نے خوشی سے پوچھا، آپ نے یہ سکوٹر کب لیا ہے چاچو؟ کوئی دو مہینوں سے اوپر ہو گئے ہیں، چاچو نے سکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ چاچو کا گھر کالج سے قریب تھا۔ امی مجھے دیکھ کر میری بلائیں لیتے ہوئے بولیں، اب تم اتنے لمبے ہو گئے ہو کہ میں تمہارا ماتھا بھی ڈھنگ سے نہیں چوم سکتی۔ میں نے جھک کر اپنا ماتھا ان کے لبوں پر رکھ دیا۔ انہوں نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا، اچھا مجھے بتاؤ آج کیا کھاؤ گے؟ تم جو کہو گے پکاؤں گی۔ آپ سب کچھ اچھا پکاتی ہیں۔ اس لیے جو پکائیں گی میں جی بھر کر کھاؤں گا، میں نے جواب دیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس لڑکی سے اپنی جان چھڑانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مونا نے مجھے چاچو کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھ کر جاتے دیکھا ہو گا اس لیے کم از کم کل تک کے لیے میری خلاصی ہو گئی تھی۔ کل شام ہاسٹل واپس جا کر کمرے میں پریکٹیکل کی تیاری کر لوں گا اور پرسوں سویرے پریکٹیکل دے کر گھر چلا جاؤں گا۔ اس طرح اگلے دو ہفتوں بعد نئی کلاسیں شروع ہونگی تو سب کچھ اعتدال پر آ چکا ہو گا۔ امی اور چاچو کے ساتھ میں دوسرا دن گزار کر شام کے وقت ہاسٹل گیا اور اپنے کمرے میں ہی پریکٹیکل کی تیاری کر کے سو گیا۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر پریکٹیکل دے کر جیپ پر بیٹھ کر گھر پہنچا تو باپو کسی مریض کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ میں سیدھا کالی کے پاس گیا، مجھے دیکھ کر کالی اور چترا میرے پاس آئے تو میں نے دونوں کو اٹھاتے ہوئے کالی سے پوچھا کیسی ہے تو کالی؟ اس نے جواباً میرا منہ چوم لیا۔ اور تو کیسا ہے رے؟ میں نے چترے سے پوچھا، اس نے اپنا منہ میری دوسری گال پر رکھ دیا۔

دونوں سانپ میرے دونوں کندھوں پر رینگنے لگے اور میں ان کو لے کر باہر جھرنے پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ باپو مریض سے فارغ ہو کر میرے ساتھ آ کر بولے، تمہارا چہرہ کیوں اترا ہے رے؟ میں نے کہا، شاید امتحانوں کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہوں گا ورنہ تو میں اچھا بھلا ہوں۔ کہنے لگے، نہیں، کوئی بات ضرور ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، تم غیر معتدل صورتِ حال میں بالکل ایسے لگتے ہو۔ ہاں چند دن ہوئے ایک واقعہ مجھ پر کسی قدر اثر انداز ہوا ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ میرا چہرہ اتر جائے، میں نے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں باپو کو نیتو والا واقعہ سناتا، جھونپڑی کی ڈھلوان کی جانب سے مجھے قدموں کے ساتھ باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کئی لوگ باتیں کرتے ہوئے اوپر آ رہے ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب سے پہلے ہمارے پرنسپل رچرڈ کا چہرہ نمودار ہوا، اس کے بعد ایک اجنبی چہرہ اور ان کے پیچھے ایک لمبی چینی عورت کے

ساتھ اُترے اُترے چہرے والی نیتو تھی۔

میں ابھی تک کالج کے کپڑوں میں تھا اور دونوں سانپ اب بھی میرے کندھوں پر رینگ رہے تھے۔ رچرڈ میرے کندھوں پر رینگتے ہوئے سانپ دیکھ کر بولا، امتحان سے فارغ ہوتے ہی تم اپنے پالتو کھلونوں سے جی بہلا رہے ہو۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔ پھر اس نے میرا تعارف اپنے ساتھ آنے والے لمبے قد، گورے اور سڈول جسم کے مالک سے کراتے ہوئے کہا، یہ نیتو کے پاپا، مسٹر وکرم میمن ہیں۔ انہوں نے چینی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور یہ نیتو کی ممی لانی میمن ہیں۔ پھر اس نے مجھے زرد نیتو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور نیتو سے تم پہلے مل چکے ہو۔ نیتو کا چہرہ ایسے زرد تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ پھر انہوں نے سب سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا، اور میرے دوست یہ ہیں مسٹر راموشان جن سے ملنے کے لیے آپ یہاں آئے ہیں۔ پھر اس نے باپو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ ہیں شان جی، ہمارے راموکے باپو۔ میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور نیتو کے آگے صرف ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

باپو بولے آپ لوگ اندر چل کر بیٹھیں۔ ہم سب اندر آ گئے تو میں نے دونوں سانپوں کو کندھوں سے اٹھا کر غار کے دہانے پر رکھ کر مڑا تو رچرڈ کہنے لگا، مسٹر اور مسز میمن ذاتی طور پر تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک سپیرے کی حیثیت سے اپنا کام کیا تھا کسی پر کوئی احسان نہیں کیا تھا اور پھر نیتو جی نے پہلے ہی میرا شکریہ ادا کر دیا تھا، نیتو کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ نیتو نے میرے اس جملے پر چونک کر میری جانب ایسے دیکھا جیسے میں نے کوئی غیر متوقع بات کہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔ شاید سکھ کا سانس اسی کو کہتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی گلابی رنگت لوٹ آئی تھی۔ وکرم نے میری جانب رخ کر کے کہا، تم نے میری اکلوتی اولاد کو بچا کر مجھے زندہ رہنے کا بہانا دیا ہے۔ پھر اس نے نیتو کو اپنی بغل میں دباتے ہوئے کہا، یہ میرا طوطا ہے طوطا۔ اس میں میری جان ہے۔ وکرم کی بیگم نے مجھے بڑی شستہ ہندی میں کہا، ہمارے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے الفاظ نہیں ہیں۔ ایک چینی عورت کے منہ سے اتنی اچھی ہندی سن کر میں نے بے ساختہ کہا، آپ کمال کی ہندی بولتی ہیں۔ آپ نے اتنی اچھی ہندی بولنا کہاں سے سیکھا؟ کہنے لگی، شکریہ۔ ہندوستان میں رہ کر ہندی ہی بولنی چاہیے۔ میں نے پہلے چین میں ہندی پڑھی اور سیکھی تھی۔ باقی ہندی مجھے وکی نے سکھائی ہے۔

اس کے ساتھ ہی لانی نے ایک گہری سانس لے کر اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر کہا، وکی ذرا اچھی طرح سونگھ کر بتاؤ کہ تم یہاں کیا سونگھ رہے ہو؟ وکرم نے گہری سانس لی اور کہا، ہاں تم درست کہتی ہو ڈارلنگ، میں اچھی شراب کی بو سونگھ رہا ہوں۔ پھر اس نے میری جانب مڑتے ہوئے کہا، کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے یہاں شراب موجود ہے؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں، باپو شراب خود ہی کشید کرتے ہیں شاید آپ وہی سونگھ رہے ہیں۔ کیا تم اپنی بنائی ہوئی شراب ہمیں چکھانا پسند کرو گے؟ اچھی بو والی شراب میری کمزوری ہے اور وہ کہیں بھی ملے میں پیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ جی بالکل، میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھ سے پہلے باپو اٹھے اور انہوں نے مٹی کے دونوں کٹوروں میں شراب ڈال کر ایک کٹورہ وکرم کو دیا اور دوسرا اس کی بیوی کو دینے کے لیے آگے بڑھایا تو وکرم نے کہا، ہم دونوں ایک کٹورے میں پئیں گے۔ باپو نے دوسرا کٹورہ رچرڈ کو دے دیا۔ وکرم نے پہلے ایک ہلکا سا گھونٹ لے کر دارو چکھی پھر ایک بڑا گھونٹ لے کر زور سے سانس لیتے ہوئے کہا، یہ ہے ہمارے ہندوستان کی شراب۔ کون کہتا ہے ہندوستانی شراب دنیا میں بننے والی اعلیٰ شراب کا مقابلہ نہیں کر سکتی؟ اس نے ایک اور بڑا گھونٹ لینے کے بعد کٹورہ اپنی بیگم کو دیتے ہوئے کہا، اب تم اسے چکھ کر خود ہی فیصلہ کرو ڈارلنگ۔

لانی نے پہلے کٹورے میں شراب کو سونگھا، پھر ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا، میں نے دنیا کی مہنگی ترین شراب پی ہے لیکن ایسی ذائقے دار شراب بہت کم پینے کو ملتی ہے۔ رچرڈ بولا اور مٹی کے پیالے میں پینے سے اس کے ذائقے میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اب میں تمہارے ہاں کثرت سے چکر لگایا کروں گا۔ وکرم نے باپو سے پوچھا، شان جی یہ کس چیز کی شراب ہے؟ گڑ کی، باپو نے بتایا۔ لانی نے پوچھا اور یہ کتنی پرانی ہے؟ ایک سال پرانی ہے، میں نے جواب دیا۔ لیکن یہ ذائقے میں سو سالہ پرانی شراب کو پیچھے چھوڑ گئی ہے، وکرم نے لقمہ دیا۔ اس میں کسی چیز کی کمی نہیں، اس کی ترشی اور مٹھاس کا سنگم ایسا ہے کہ پینے والے کو نہ تو اس کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی میٹھا زبان سے چپکتا ہے، لانی بولی۔ وہ لوگ ہمارے ہاں کی شراب سے کچھ اتنے متاثر ہوئے تھے کہ باقی سب کچھ بھول بھال کر اس کے ذائقے میں کھو گئے۔ اچانک وکرم کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ہمیں اب چلنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی تمام لوگ کھڑے ہو گئے، مہمان نوازی کا شکریہ رچرڈ بولا۔ آپ کا اپنا گھر ہے جب چاہیں آئیں میں نے جواب دیا۔

میں ان کو چھوڑنے ان کی گاڑی تک آیا۔ وہ ایک لمبی سی کالی کار میں آئے تھے۔ جاتے جاتے انہوں نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں واپس جھونپڑی میں آیا تو باپو کو بتایا کہ میں اس لڑکی کے بارے میں آپ سے بات کر رہا تھا۔ پھر میں نے باپو کو نیتو کی ساری کہانی بڑی تفصیل سے سنائی تو انہوں نے کہا، لگتا ہے تم نے اس لڑکی کو کھری سنا کر اس کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔ وہ لوگ جب تک بیٹھے رہے لڑکی کی تمام تر توجہ تمہاری جانب تھی۔ وہ تمہاری ہر حرکت اور ہر بات کو بڑی توجہ سے دیکھ اور سن رہی تھی۔ جبکہ تم نے ایک بار بھی اس کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے کہا، باپو معلوم نہیں اتنے سلجھے ہوئے والدین کی بیٹی ایسی بدتمیز کیوں ہے؟ باپو کہنے لگے، تمیز فطری شے ہے جو سیکھی نہیں جا سکتی۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے والدین کے سامنے اس کی کوئی برائی نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری اس بات پر وہ تم سے اور زیادہ متاثر ہوئی ہے۔

باقی صفحہ ۱۰۰ پر ملاحظہ کیجیے

گلیوں میں بھٹکتی بھوک

میں ایک عورت ہوں

شاہ رخ حیدری
(تہران)

میں کہ اک شادی شدہ عورت ہوں
میں کہ اک عورت ہوں
ایک ایرانی عورت
رات کے آٹھ بجے ہیں
یہاں خیابان سہروردی شمالی پر
باہر جارہی ہوں
روٹیاں خریدنے کو
نہ میں سجی بنی ہوں
نہ میرے کپڑے جاذب نظر ہیں
مگر یہاں سرعام
یہ ساتویں گاڑی ہے
مرے پیچھے پڑی ہے
کہتے ہیں، شوہر ہے یا نہیں،
میرے سنگ سیر کرو
جو بھی چاہو گی تجھے لے دوں گا
یہاں تندور چی ہے
وقت ساڑھے آٹھ ہوا ہے
آٹا گوندھ رہا ہے مگر پتہ نہیں کیوں مجھے دیکھ کر آنکھیں مار رہا ہے
نان دیتے ہوئے اپنا ہاتھ مرے ہاتھ سے مس کر رہا ہے
یہ تہران ہے
سڑک عبور کی تو گاڑی سوار مری طرف آیا
گاڑی سوار قیمت پوچھ رہا ہے
رات کے کتنے؟
میں نہیں جانتی تھی راتوں کی قیمت کیا ہے
یہ ایران ہے
میری ہتھیلیاں نم ہیں
لگتا ہے بول نہیں پاؤں گی
ابھی میری خجالت اور رنج کا پسینہ خشک نہیں ہوا تھا
کہ گھر پہنچ گئی
انجنیئر کو دیکھا
ایک شریف مرد جو دوسری منزل پر
بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا ہے
سلام آقائے مہندس
بیگم ٹھیک ہیں؟
آپ کی پیاری بیٹی ٹھیک ہے؟
والسلام، تم ٹھیک ہو؟
خوش ہو؟
نظر نہیں آتی ہو؟
سچ تو یہ ہے آج رات میرے گھر کوئی نہیں
اگر ممکن ہے تو آجاو،
نیلوفر کا کمپیوٹر ٹھیک کردو
بہت گڑبڑ کرتا ہے
یہ میرا موبائل ہے،
آرام سے جتنی بات چاہے کرنا
میں دل مسوستے ہوئی کہتی ہوں، بہت اچھا
اگر وقت ملا تو ضرور
یہ سرزمین اسلام ہے
یہ امام رضا اور امام زادوں کی سرزمین ہے
یہاں اسلامی قوانین رائج ہیں
مگر یہاں جنسی مریضوں نے مادہ۔۔۔۔۔۔بکھیر رکھا ہے
دین، نہ مذہب، نہ قانون
اور نہ تمہارا نام حفاظت کرسکتا ہے
یہ ہے اسلامی جمہوریہ

اور میں ایک عورت ہوں
میرا شوہر چاہے تو چار عقد کرے اور چالیس عورتوں سے متعہ بھی کر لے
البتہ میرے بال مجھے جہنم میں لے جائیں گے،
اور مردوں کے بدن کا عطر انہیں بہشت میں لے جائے گا
مجھے کوئی عدالت میسر نہیں ہے
اگر میرا مرد طلاق دے تو باغیرت کہلائے
اگر میں طلاق مانگوں تو کہیں
حد سے گذر گئی، شرم کھو بیٹھی
میری بیٹی کو بیاہ کے لیے میری اجازت درکار نہیں
مگر باپ کی اجازت لازمی ہے
میں دو کام کرتی ہوں، وہ کام سے آتا ہے آرام کرتا ہے
میں کام سے آ کر پھر کام کرتی ہوں
اور اسے سکون فراہم کرنا مرا ہی کام ہے
میں کہ ایک عورت ہوں
مرد کو حق ہے کہ مجھے دیکھیں
مگر غلطی سے اگر
مرد پر مری نگاہ پڑ جائے
تو میں آوارہ اور کثیف خیال کہلاؤں
میں ایک عورت ہوں، اپنے تمام محدود پن کے بعد بھی عورت ہوں
کیا مری پیدائش میں کوئی غلطی تھی؟
یا وہ مقام غلط تھا جہاں میں بڑی ہوئی
میرا جسم، میرا بدن، میرا وجود
ایک اعلیٰ لباس والے مرد کی سوچ اور۔۔۔۔۔
زبان کے چند فقروں کے نام بیچ ہے
اپنی کتاب بدل ڈالوں یا سرزمین کے مردوں کی سوچ
یا کمرے کے کونے میں محبوس رہوں
میں نہیں جانتی
میں نہیں جانتی کہ کیا میں دنیا میں برے مقام پر پیدا ہوئی ہوں
یا برے موقعے پر پیدا ہوئی ہوں

○

گول آئینہ

پروین شیر
(کینیڈا)

رات ہے آدھی
شہر کی پلکیں نیند سے بوجھل
گھنا اندھیرا خاموشی کے
شانوں پہ سر رکھے اُس کی
بانہوں میں بانہیں ڈالے ہر سو رقصاں ہے
دورِ فلک کے ہاتھوں میں اک
گول آئینہ رخشندہ ہے
ابر کی چادر سے اپنی اک
جھلک دکھا کر چھپ جاتا ہے
صدیوں پارینہ ہے لیکن
اب بھی کتنا نیا نیا ہے
عکس کئی چہروں کے اس میں
ہم آہنگ ہوئے جاتے ہیں
یہ آئینہ یادکدہ ہے
گزرے لمحوں کے سب نوری
قطرے پی کر دمک رہا ہے
کتنے منظر، کیسے کیسے
آسودہ اور ناآسودہ
جذبے اس کے
سینے میں روشن ہیں اب بھی
لحظہ لحظہ
آدھی رات بھی مر جائیگی
گُل ہوگا روشن آئینہ
سارے منظر چھپ جائیں گے۔۔۔!

○

''فکرِ جدید''

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

کہا جو ہم نے وہ تُم نہ سمجھے
کہا جو تم نے وہ ہم نہ سمجھے
مگر ہم اتنا تو جانتے ہیں
تُم جا رہے ہو، ہم آ رہے ہیں
دکھائے جن تقاضوں کے کرتب
اُن گزرگاہوں سے ہم لوٹ آئے
ہم نے بچّو تمہاری مانند
لبوں پہ نہ تھے قفل لگائے
مشورہ کوئی جب بزرگ دیتے
بصد احترام مان لیتے
ذرا بھی حیل و حجت نہ کرتے
بنتے یوں گلزار، پُر خار رستے!

مگر اے نسلِ نو،
یہ دیوانگی، یہ فکرِ جدید تیری
''میری زندگی، میرا طور و طریق
مداخلت قطعی ممنوع''
شکن در شکن بصورت صنّاعی
تمہاری جبیں ہے لب یہ کنندا
علاوہ ازیں
کرمکِ ریشم کی صورت گرد اپنے
کوکون[1] بُن رہے ہو، پھنستے جاتے ہو

عالمِ بے خبری میں ہو، مآل سے بے خبر بھی ہو۔!!
ایسے دگرگوں حالات میں بچّو
میرا تم سے یہ کہنا
''لوٹتے وقت شیوار ریسٹوران سے اپنے
مرغ و ماہی لیتے آنا''
حق بہ جانب ہے پدر تمہارا
تا کہ گفتگو کا کوئی سلسلہ تو ہو جاری
دل کے اندھیارے میں در آئے اُجالا
ہماری ذرا سی مداخلت سے
کوئی رستہ تو نکلے، کوئی در تو وا ہو
بات بن جائے تو بُرا بھی کیا ہے۔
مگر تمہاری کج فہم سوچ پر،
حیران ہوں، ہنسی بھی آتی ہے
طعنہ زنی پر تمہاری
''مرغ و ماہی دمے کا ہوا ہے رسیا،
اب پدر ہمارا''

صد حیف! اس فکرِ جمیل پر تمہاری۔

○

[1] Cocoon انگریزی میں

جب پڑھ لیا اخبار

یونس صابر
(پشاور)

ہر روز پڑھوں اخبارِ ادب
سب اہلِ قلم کا کام غصب
عمر اور یوسف حسن[1] ملنگ
انجوائے کیا خوب اُن کے سنگ
لاتے ہیں دُور کی کوڑی یہی
ان میں ہیں نشاطِ سرحدّی
حماد حسن! کوریڈور ترا
ہر رائٹ اپ ہے شہزور ترا
صدیوں پہلے ساغر صدیقی ساتھ ہم بھی
جب گھنٹوں گھنٹوں بیٹھا کئے
جب بند مٹھی میں اُسے دیا
اُس نے میرے ہاتھ کو چُوم لیا
قائم ہو صغر پتی ایوارڈ
کافی ہے اگر بتی ایوارڈ
کیا آج تلک وہ جلتی ہیں
راجہ خسرو کی بتیاں بھی
اور اپنے منیر نیازی جی
جو بسار گئے دن رتیاں بھی
کیسی رہے صابر صاحب کی
جھونگے میں سہی چاہتیاں بھی

○

[1] صوفی ازم کانفرنس انسٹی ٹیشن کے دوران

''یادوں کا خزینہ''

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

گر محبت کو وفاؤں سے نبھایا تُم نے
ہم بھی دل پیش کریں گے تمہیں جانِ جاناں

دل میں جب ہُوک اُٹھی جان سے بیگانہ ہوا
بڑی مشکل سے بچا لائے اسے جانِ جاناں

ہم تیری بزم سے نکلے تھے نہ آنے کے لیے
تیرے اصرار پہ لوٹ آئے ہیں جانِ جاناں

ہم نے سمجھا تھا پریشاں بھی رہے ہو گے تم
انہی سوچوں میں چلے آئے ہیں جانِ جاناں

تیرا وعدہ تھا پلٹ آئے تو جاں حاضر ہے
اسی اقرار پہ لوٹ آئے ہیں جانِ جاناں

اب جو دل توڑا، کہیں دور چلے جائیں گے
پھر نہ کہنا کہ خطا ہو گئی جانِ جاناں

تیری یادوں کا خزینہ یہیں رہ جائے گا
یوں گزر جائیں گے اس راہ سے جانِ جاناں

میری یادیں بھی سمٹ جائیں گی چلتے چلتے
یہی دنیا ہے جو چھِن جائے گی جانِ جاناں

کیوں نہ پھر پیار کی اک راہ بنا لیں اپنی
جس پہ چلنے میں بقا ساتھ ہو جانِ جاناں

○

دھوئیں میں آگ

وشال کھُلر
(لدھیانہ، بھارت)

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

نیند نیند خواب ہے
چاشنی گلاب ہے
اپنا ماہتاب ہے
اپنا آفتاب ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

گیت گیت بانسری
پریت پریت آدمی
راگنی ہی راگنی
جسم جسم بھوک ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

رنجشیں نہ دوریاں
خواہشیں ادھوریاں
درہمی نہ برہمی
دور ہے نہ پاس ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

کالیاں نہ کالیاں
گوریاں نہ گوریاں
رسم رسم چاندنی
روپ کی بہار ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

آسماں ہی آسماں
روشنی دھواں دھواں
آگہی رواں رواں
جانے کیا تلاش ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

بھول بھول رحمتیں
پھول پھول رنگتیں
خوشبوئیں گلاب ہیں
جیت ہے نہ مات ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

بول بول چپ ہے کیوں
آنکھ آنکھ بند کیوں
ہونٹ ہونٹ لالیاں
محبتوں کی عید ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

کام واسنا نہیں
کوئی آشنا نہیں
جو ہے اس سے آشنا
پریم گرنتھ پاٹھ ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

رات رات کامنا
شام شام راستہ
صبح صبح فلسفہ
کیا یہ کوئی کھیل ہے
زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

آئینے میں آئینہ
بے بسی میں کیا دھرا
بے بسی کو بھول جا
اس میں ایک راز ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

بتکدے سے میکدہ
فلسفے کا فلسفہ
پربتوں کے پار ہے
کوئی رام بان ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

کہکشاں ہی کہکشاں
نرم نرم سائباں
جس طرف بھی جایئے
آرزو جوان ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

وصل کی گھٹا گھٹا
ہجر سے ہٹا ہٹا
آسماں پھٹا پھٹا
تن میں اک ابال ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

روشنی کو کیا کریں
تیرگی سے سب ڈریں
جو کرے ہے سو بھرے
بندگی سپاس ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

رنگ رنگ آس ہے
بھوک ہے نہ پیاس ہے
کون اب اداس ہے
اس میں تو مٹھاس ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

قول ہے قرار ہے
درد بے شمار ہے
درد کی دکان سی
کون سا مقام ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

درد میں کراہ میں
اک خوشی کی چاہ میں
کشتیاں اڑا چلو
کارواں سیال ہے

زندگی کا راگ ہے
اس دھوئیں میں آگ ہے

فرح کامران
(نیویارک)

شور کرتا ہے کوئی باہر روز
کوئی مرتا ہے میرے اندر روز

جانے کس کی تلاش ہے ہم کو
دل بھٹکتا ہے اب بھی در در روز

اس کی وحشت بھری نگاہوں میں
ہم نے دیکھا ہے ایک منظر روز

اک شب ہجر کاٹنے کے لیے
پار کرتی ہوں میں سمندر روز

جب سے تو چھوڑ کر گیا ہے مجھے
وقت برسا رہا ہے پتھر روز

ڈگمگاتی ہوں بارہا دن میں
پھر سے اٹھتی ہوں کھا کے ٹھوکر روز

اک وہی شخص اک وہی چہرہ
ڈھونڈتی پھر رہی ہوں گھر گھر روز

○

قطعات

مرے مشاعرہ بازی گران اہلِ سخن
دِکھاتے ہیں جو نشستوں ، مشاعروں میں فن
انہیں خبر ہی نہیں، ہے ادب عجب میدان
سو اس میں بازی گری سے نہ بڑھ سکے گی شان
انہیں خبر ہی نہیں، کیا ہے اس کا خمیازہ
بکھر کے رہتا ہے آخر ہوس کا شیرازہ
نقب لگائیں سیاست سے یا کہ آوازہ
ادب میں ہوتا نہیں کوئی چور دروازہ

آفتاب مضطر (کراچی)

''گھنگھرو خوشی کے''

شگفتہ نازلی (لاہور)

گھنگھرو بجتے نہیں خوشی کے کیوں۔۔۔
گجرے سجتے نہیں خوشی کے کیوں۔۔۔
کلیاں مسکان کی شگفتہ نہیں۔۔۔
کس قدر چپ ہنسی کے پتے ہیں۔۔۔
شاخیں ساری شریر، سوچ میں گم۔۔۔
دُور تک پھیلا اِک سناٹا ہے۔۔۔
ہے کوئی چاپ اور نہ سرگوشی۔۔۔
منجمد بحر ہے اُداسی کا۔۔۔
اور اُس پار اک مہیب سی دُھند۔۔۔
اب تو لگتی خوشی ہے ایسے کہ۔۔۔
جیسے روٹھی ہوئی سہیلی ہو۔۔۔
نغمہ بھولا ہوا کوئی جیسے۔۔۔
اور انمول لمحہ بیتا سا۔۔۔
جانے کس کی نظر خوشی کو لگی۔۔۔
جیسے گھنگھرو خوشی کے ٹوٹ گئے۔۔۔
گر نہیں ٹوٹے تو ہیں رُوٹھ گئے۔۔۔!

''ارضِ پاکستان''

۱۴۔اگست کی دلی مبارکباد کے ساتھ!!

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

بڑھتا جائے چاہتوں کا سلسلہ
ایسا ہو موسم مرے اب دیس کا
تلخ یادیں، تلخ باتیں بھول کر،
کیجیے اپنے سفر کی ابتدا!
ہر طرف خوشیاں ہوں ارض پاک پر
روشنی ہی روشنی ہو جا بہ جا
اتفاق و اتحادِ قوم سے!
خوب پھولے اور پھلے گلشن مرا
اے خدائے مصطفےٰ، ربِّ کریم!
رحمتوں کی بھیک کر ہم کو عطا
بخش دے ہر نعمتِ دنیا و دیں
ہے انیسؔ بے نوا کی یہ دعا

○

''دعا زمین''

فیصل عظیم (کینیڈا)

پروین کمار اشک صاحب کی کتاب ''دعا زمین'' ایک فقیر کی صدا ہے، یہ ایک درویش کا نعرۂ مستانہ بھی ہے اور دان کرنے کا اندازِ مستانہ بھی جس میں ایک بے خودی اور بے ساختگی ہے اور یہی بے ساختہ طرزِ اظہار ان کے کلام کا وصفِ خاص ہے جو اسے بھیڑ سے الگ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کتاب میں شامل کلام خود کتاب کے عنوان کی طرح ہے جس میں دعا کی بہت سی جہتیں ہیں اور دعا کی علامت بڑے منفرد انداز سے استعمال ہوتی نظر آتی ہے۔ عام بول چال کا انداز، درویش کی نگاہِ تند اور محبت کی صلائے عام ایک جگہ ہو کر گویا اس کتاب کو درویش کے حجرے کا دیا بنا رہے ہیں۔ اس کلام کے اسلوب، تشبیہات اور استعارات پر اشک صاحب کی واضح چھاپ ہے۔ اصل کی طرف رجوع کی خواہش، بوڑھے کی دعا سے نسبت، محبت کی کچی مٹی کی سی زبان، ننگے پن کی تشبیہ سے انسان کی اصل کی طرف توجہ دلانا، یہ انہی کا اختصاص ہے اور شاید یہ انفرادیت ہی اس کلام کو مکمل جواز بھی ہے۔ اس کلام میں دیوار اٹھانے کے استعارے سے بھی مختلف انداز میں کام لیا گیا ہے۔ سنہری مچھلی میں امید تراشنا، میرے نزدیک اس میں بھی نیا پن ہے۔ ایک درویش کی فکری پونجی کیا ہوتی ہے! تتلیاں، پھول، آنسو، چٹان، ندی، کشتی، بچے اور بوڑھے اور پروین کمار اشک کی گٹھڑی میں یہ موتی چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادب میں اور ادیبوں میں فقیری اور تصوف ایک فیشن بن چکا ہے اور اب اس بناوٹ سے بیزاری ہوتی ہے، یہاں تک کہ دوغلے پن کے پہلو میں تصوف کے شناسا مضامین کی بھرمار محض نمائشی معلوم ہوتی ہے مگر پروین کمار اشک صاحب کے ہاں کی فقیری ان کی اپنی ہے، مانگے کی یا دکھاوے کی خاک نشینی نہیں ہے، اس لیے یہ خالص ہے۔ اس لحاظ سے ''دعا زمین'' ایک خاک نشیں کے بوریے پر بنے نقش و نگار کی سی سچائی اور خلوص رکھتی ہے۔ یہ کلام، غزل کی زمینوں پر واقعی دعا کی ایک نئی زمین ہے جو والہانہ پن سے بچھائی گئی ہے اور جو سب کے لیے ہے، سرحدوں سے مبرّا اور محبتوں سے بھرپور۔ کتاب سے میرا انتخاب:

وہ پیش رو ہے مگر راستہ نہیں دیتا
بزرگ ہو کے بھی دیکھو دعا نہیں دیتا

دل کی کتاب سے سوکھا پھول اُٹھاتا ہوں
رو رو کے ''خوشبو خوشبو'' چلّاتا ہوں

ہر دیوار کے پیچھے سو دیواریں ہیں
کتنی دیواریں میں روز گراتا ہوں

تو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا
میں تو پانی میں اُترا تھا دریا تیرے کہنے پر

بزرگوں کا بس اک کمرہ بچا کر
تو جب چاہے پرانا گھر گرا دے

چراغِ درد کسی بام پر نہیں جلتا
تمام شہر میں میرا مکان روشن ہے

دل کے زخم پہ مرہم کام نہیں کرتے
دل کے زخم پہ بوسہ رکھا جاتا ہے

جسم کو روح سے ملا دینا
ارے دیوار مت اُٹھا دینا

پار کے منظر نے موقعے پر آنکھیں دیں
میں اندھا دیوار اُٹھانے والا تھا

یہ کس نے قتل کیا شہرِ خوش کلام مرا
میں جس سے بات کروں بے زباں نکلتا ہے

نہ پکڑی قافلے کی جس نے انگلی
وہ بچہ سب سے آگے چل رہا تھا

مرے صحرائے شب میں ایک بھی جگنو نہیں آتا
شعاعِ ماہ کیوں کر آئے گی جب تُو نہیں آتا

بھیڑ کو چیرنا ہی پڑتا ہے
بھیڑ میں راستہ نہیں ہوتا

آنکھیں مر جاتی ہیں یار
اتنی دور نہ جایا کر

بوسہ دیتے ہیں اسے آج بھی آنسو میرے
اس کے آئینے میں ہے آج بھی چہرا میرا

اس کا چہرہ تھا مرے چہرے پر
جب نقاب اس نے اُتارا میرا

خدا کی بے رخی پر رو رہی ہے
دعا مجھ سے لپٹ کر رو رہی ہے

کیا یہ مسجد ہے صرف مومن کی!
کیا یہ کافر ہیں سب خدا کے بغیر!!

میں ترا بے خواب بالک، ماں بتا میرے لیے
کوئی لوری کیوں نہیں، کوئی کہانی کیوں نہیں

لگا کے آگ میں آیا تھا نیم شب جس کو
ہوئی جو صبح تو دیکھا مکان میرا تھا

بہت رویا میں دیواروں سے مل کر
مکاں خالی ہوا جب ساتھ والا

تو کلمہ پڑھ کے پرندوں کو ذبح کرتا ہے
خدا معاف کرے سب عبادتیں تیری

''میرے کشکول میں''

معین کمالی (کراچی)

عارف شفیق کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال سے قبل جی چاہتا ہے کہ ان کے نئے مجموعہ کلام کے نہایت بامعنی عنوان پر انہیں کھل کر داد دی جائے ''میرے کشکول میں ہیں چاند سورج'' ایک ایسا تخیل ہے جو انسان کے زمین و آسمان کے روابط کو آشکار کرتا ہے عارف شفیق نے اپنے کلام کے حسن کی طرح یہ اچھوتا عنوان منتخب کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ زمین پر رہ کر بھی آسمان اور اس میں موجود اجسام تک رسائی کو انسان کا حق سمجھتے ہیں البتہ انہوں نے اپنے فطری عجز وانکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی وسیع دامنی کے بجائے ''میرے کشکول میں'' کہنا پسند کیا اس کشکول میں چاند سورج اور تارے سمٹ آئیں تو یہ مبالغہ سہی لیکن شاعر کے حسن تخیل کی معراج ہے علامہ اقبال نے واقعہ معراج کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا تھا:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یعنی آسمان اور اس میں موجود تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر دی ہیں اس لیے عارف شفیق اپنے کشکول میں چاند سورج رکھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں منصور احمد کے رنگین سرورق اور کتاب کی پشت پر فطرت کے پس منظر میں عارف شفیق کی سر جھکائے تصویر دونوں اس قدر خوبصورت اور معنی خیز ہیں کہ قاری کتاب کھولنے سے پہلے دیر تک ان ہی کو الٹ پلٹ دیکھتا اور ان کے سحر میں گم رہتا ہے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں شاعری کا آغاز فارسی کلام سے ہوا تھا۔ اردو زبان وجود میں آنے سے پہلے یہاں بادشاہوں کی اور سرکاری زبان فارسی ہی تھی پھر جب اردو نے فروغ پایا تو اس زبان کے بہت سے شاعروں نے عربی اور فارسی کے کلام کو اگر پیچھے نہیں چھوڑا تو کم از کم اس کا ڈٹ کر مقابلہ ضرور کیا۔ اردو کے صرف دو شاعروں غالب اور اقبال کے کلام کا فکر کی بلندی اور الفاظ کے آہنگ کے لحاظ سے دنیا کی کسی بھی زبان کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام سے مقابلہ و موازنہ کیا جاسکتا ہے اردو زبان جب عوام و خواص کی گھٹی میں پڑ گئی اور ان کی معاشرت میں رچ بس گئی تو جگہ جگہ سخن فہمی اور سخن گوئی کی محفلیں جمنے لگیں۔ آج کے دور میں بھی اردو شعراء کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جن کا اسلوب دوسروں سے مختلف اور منفرد ہو۔ عارف شفیق کا شمار ان شاعروں میں کیا جاسکتا ہے جن کے پاس شعور کی پختگی کے علاوہ احساس کی گرمی بھی ہے تخیل کی بلندی بھی ہے اور الفاظ کا آہنگ بھی۔ اور یہ سب اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ ہے کہ سننے اور پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔ عارف شفیق نے اپنی شاعری میں آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے اپنا رشتہ زمین سے بالکل نہیں توڑا ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کا انسانوں سے تعلق برقرار نظر آتا ہے ان کے ہاں ناانصافی کے خلاف احتجاج مزاحمت اور انقلاب کا رخ اختیار کر گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عارف شفیق کی شاعری میں اپنے رب سے وابستگی اور نبی رحمتؐ سے شیفتگی کا اظہار بڑھتا جارہا ہے جس کی مثالیں ان کی غزلوں میں بھی جابہ جا نظر آتی ہیں۔ روایتی حمد و نعت کے بجائے عارف شفیق نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذکر مختلف اشعار میں ادب و احترام کے ساتھ نہایت دلآویز انداز میں کیا ہے:

میری شہ رگ سے بھی تُو ہے نزدیک تر میں نے مانا مگر
دل نہ چاہے مرا اتنا بھی فاصلہ اے خدا اے خدا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقیدت و محبت کا انداز ملاحظہ ہو:

جس مٹی میں جاگ رہا ہے وہ تیرا محبوب
اس مٹی کی خاک بنا دے پیارے اللہ سائیں

عارف شفیق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اس میں بھی عرفانِ الٰہی اور معرفتِ ذات کی تجلیاں دیکھئے:

اس لیے وقتِ سحر جاگ رہا ہوتا ہوں
میں پرندوں سے ترا ذکر سنا کرتا ہوں
دل تو لے جاتا ہے ہر روز خدا کے گھر میں
جانے کس خوف سے میں بت سا بنا رہتا ہوں

علمائے کرام کہتے ہیں کہ اسلام بیس فیصد عقائد و عبادات اور اسّی فیصد معاملات کی تعلیم دیتا ہے اس حقیقت کا اظہار عارف شفیق نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

آنسو پونچھے دکھ بانٹے انسانوں کے
میں نے بھی تو ساری عمر عبادت کی

زیر نظر مجموعہ میں عارف شفیق کی شاعری کے اس قدر خوبصورت نمونے ہیں کہ اس محدود کالم میں ان کے مختصر حوالے پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہے ہر شاعر کی طرح وہ بھی بدلتی ہوئی کیفیات کے ساتھ مختلف شعر کہتے ہیں چند شعر ملاحظہ کیجیے:

پھول اور کتاب لے گیا شب خواب گاہ سے
میرے سرہانے کون یہ تلوار چھوڑ کر
اٹھا لیں کہیں ہتھیار ہم قلم رکھ کر
ہمارے صبر کو اتنا بھی آزماؤ مت

ایک حساس انسان اور شاعر کے طور پر عارف شفیق ہندوستان سے اپنے آباء و اجداد کی ہجرت اور بعد کے حالات کو شعر کے روپ میں ڈھالتے رہے ہیں مثلاً:

میں تو کراچی کی سڑکوں پر بے گھر پھرتا ہوں
اک گھر اب بھی رہ تکتا ہے سرحد کے اس پار
اس دھرتی پر آج بھی عارف میں تو مہاجر ہوں
میرا نام نسب لکھا ہے سرحد کے اس پار

جب تصور ''ماں'' کا ہو

جاوید اختر چودھری
(برمنگھم)

برمنگھم (برطانیہ) کے ایک معروف شاعر جناب محمد اقبال بھٹی کا شعری مجموعہ ''ماں کے اندر ایک سمندر'' ایسا نہیں کہ آپ یہ کلام سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جائیں۔ اس کی تمام تر نظمیں اور غزلیں اتنی پر بہار ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے اور پھر بھی سیرابی نہ ہو۔ بس بہار کا موسم ہر قاری کے دل میں بس جاتا ہے اور اس لیے کہ اس میں شامل حمد و نعت کے ساتھ دیگر نظمیں اور غزلیں ایسا غنائی آہنگ لئے ہوئے ہیں جو از خود یاد ہو جاتی ہیں۔ ایسا فن بھی بہت کم لوگوں کو ہمارا پروردگار عنایت کرتا ہے۔ اور پھر جب تصور ''ماں'' کا ہو تو ہر لفظ مٹھاس بن کر دل میں جذب ہو جاتا ہے اور ذہن میں رچ بس جاتا ہے۔ خود شاعر نے کہا ہے،

حرف و معنی نئے اور انداز بھی
بات جو بھی ہو سب سے جدا میں کروں

یہ دعا رب نے قبول کر لی کیونکہ آخری شعر میں وہ خود دعا گو ہیں:

کچھ نہ مانگوں بجز اک نگاہِ کرم
ہاتھ دامن پسارے دعا میں کروں

بریڈفورڈ برطانیہ میں مقیم جناب یعقوب نظامی خود بھی ایک نامور ادیب ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے لیے ایک مضمون لکھا ہے۔

''شلوار کرتے میں ملبوس بھٹی صاحب ایک رعب دار شخصیت ہیں۔ مگر ان کی قربت حاصل ہو اور ملاقات دوستی میں بدل جائے تو جس طرح شکر دودھ میں مل کر ایک ایسی مٹھاس پیدا کر دیتی ہے جس کے پینے سے سرور محسوس ہوتا ہے۔'' انہوں نے مزید لکھا ہے۔

''انہیں خوش قسمتی سے شریک حیات بھی ایسی ملی ہیں جو مہمان نوازی میں ان سے دو قدم آگے ہیں۔''

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بھابھی زیب النساء سے ملنے کے بعد یقین آ جاتا ہے کہ جناب اقبال بھٹی کی شخصیت کی تکمیل بھابھی صاحبہ کے شریک حیات بننے کے بعد ہی ہوئی ہے۔ اس جملے کو بھٹی صاحب کے ساتھ زیادہ نہ سمجھا جائے کیونکہ ''ماں'' کے بعد ''بیوی'' ہی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو ایک مرد کے حسنِ کردار کو مکمل کرتی ہے۔

ہم جب بھی بھٹی صاحب کے گھر گئے ہیں کشمکش میں پڑ گئے ہیں کہ میزبانی میں کس کو زیادہ نمبر دیئے جائیں؟ اس سوال کو حل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جواب چاہیے تو بھٹی صاحب کے گھر پہنچ جائیں۔

شاعر اقبال بھٹی کی کتاب ''ماں کے اندر ایک سمندر'' میں صفحہ نمبر ۱۸۸ پر ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ آپ بھی ضرور ملاحظہ کریں۔ نظم کا عنوان ہے ''اپنے وطن کے نام''

کہاں اور کس سے شکایت کروں
وطن لوٹ کر پاسباں کھا گئے
کیا دردمندی سے ہم نے جو شکوہ
کہا اس پہ کیسے کہاں کھا گئے

ایک اور غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:

اقبالؔ بجھائے بجھ نہ سکے
آگ لگے جب پانی میں

اس کتاب میں سلطانہ مہر نے ان کی سوانح کے طور پر تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ (محمد اقبال بھٹی) دسمبر ۱۹۴۷ء میں اپنے نانا کے گھر ساہیوال چک نمبر EB/135 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی چک میں برگد تلے قائم ایک مدرسے میں حاصل کی اور پھر راولپنڈی کے ایک مضافاتی قصبہ ''بیول'' میں آ گئے۔ یہ بھی ان کے نانا کے گھروں میں سے ایک گھر تھا۔ سیکنڈری تعلیم بھی بیول میں ہی حاصل کی اور ستمبر ۱۹۶۴ء میں برطانیہ آ گئے۔''

اقبال بھٹی نے دورانِ ملازمت پر دھیرج کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھا اور پھر اخبارات میں مراسلات لکھنے شروع کیے۔ اللہ نے ان کے قلم کو وہ طاقت و کمال بخشا کہ ان کے قلم کی سیاہی پڑھنے والے کے دل و دماغ کے لیے روشنی بن گئی۔ باالفاظ دیگر ان کے قلم کی سیاہی دراصل روشنائی کہلانے کی مستحق بن گئی۔ اور اب برطانیہ میں اردو ادب کا ایک جانا پہچانا نام اقبال بھٹی بنکر اردو ادب کی چمک دمک قریہ قریہ پھیل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے وطن سے دور نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

پرندہ واپسی کی سوچتا ہے
ارادے باندھتا ہے توڑتا ہے
عمل ہجرت کا ہے جاں سے گزرنا
خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے

اردو ادب کے ایک نامور ادیب متوفی انور سدید نے اقبال بھٹی کے بارے میں لکھا تھا:

''محمد اقبال بھٹی کی دوسری خوبیوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ وہ شاعر بھی ہیں اور سیدھے سادے دیہاتی گبھرو جوان کے دل میں احساس کے تار لرز رہے ہیں اور ان سے نغمے نکل رہے ہیں جو ان کی داخلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔۔۔ اب ان کی شاعری کی نئی کتاب ''ماں! اب گلے لگا لو مجھ کو'' شائع ہوئی ہے جس کی نغمگی معنویت کے تاثر کو کروٹ دیتی ہے اور ناسٹلجیا کی اس کیفیت کی آئینہ دار بن جاتی ہے جو دھرتی سے الگ ہو جانے اور اپنی والدہ محترمہ کے قدموں سے دور ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے اور ہجرت کے موضوع کو اجاگر کر دیتا ہے۔ بنیادی حقیقت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ محمد اقبال بھٹی تلاشِ روزگار کے سلسلے میں برطانیہ نہ جاتے اور پاکستان میں ہی

قیام پذیر رہتے تو ان کے اندر کا شاعر شاید ان کے نہاں خانہ دل میں ہی سویا رہتا''
(''ماں کے اندر کے ایک سمندر''صفحہ نمبر ۱۵)

عمران شاہد بھنڈر اپنے ایک مضمون بعنوان ''خارجی و باطنی تال کا امتزاج۔۔۔محمد اقبال بھٹی میں لکھتے ہیں:

''عمومی نکتہ نظر سے اردو شاعری کا کلی رجحان تنزلی اور بحران سے مبرا نہیں ہے۔ پاکستان ہو یا ہندوستان، تخلیقی شاعرانہ عمل ناپیدگی کا شکار ہو کر نقل و تکرار کو اپنے باطن میں سمائے ہوئے ہے۔ اس امر کا ادراک ستر کی دہائی میں درس و تدریس سے وابستہ سنجیدہ نقادوں کو ہو چکا تھا، بالخصوص ان کو جو ادب و شاعری کو مغربی ادب کے مقابل رکھ کر پرکھتے تھے۔ انہوں نے اسی اثنا میں مغربی ادبی و تنقیدی کتب کے تراجم کی سنجیدہ کوششیں بھی کیں۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ جہالت، روایت کی طرح اردو شاعری کا جزو لازم بن گئی ہے۔'' (حوالہ بالا۔ صفحہ نمبر ۳)

اور آگے لکھتے ہیں:

اردو ادب میں اعلیٰ شعری تخلیقات اب داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ موضوعات کا شدید فقدان ہے۔ اگر کسی شاعر کو عورت کے ہونٹ یا کمر پسند آ گئے تو نقل بازنقل کا علم لہراتے ہوئے دوسرے شاعر کی پسندیدگی میں ہی اپنی پسند تلاش کرتا ہے۔ ہونٹوں کا تجربہ یا پھر اُن دیکھا احساس پیدا کرنا وہ اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا۔ نتیجتاً خود ساختہ دانشوروں کی تخلیقات کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اقبال بھٹی کے لیے تخلیقی عمل سے گزرنے کے لیے نقل کے عمل سے گزرنا ضروری نہیں بلکہ حسیاتی تجربہ ہے اور اس سے حاصل شدہ خام مواد کو ذہن و احساس کے سپرد کر دینا کافی ہے۔ اقبال کے احساسات و جذبات میں شدت اور تخیل میں پرواز کا عنصر محدود ہے تاہم وہ جہاں پر بھی تخت نشین ہے اقبال کی رسائی کافی ہے۔ (صفحہ نمبر ۳۷۔۳۸)

اقبال بھٹی کی فطری تال پر مبنی شاعری میں استعارے اور تشبیہات کا فقدان ایک چونکا دینے والا امر ہے۔

اعلیٰ شاعری میں یہ عوامل اسلوبیاتی یکتائی کے لیے لازم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی طبع کے فطری پن کے باوجود ان عوامل کے استعمال سے گریز کیا۔ اگر اقبال بھٹی اکتساب کے عمل سے گزر کر استعاراتی اور تشبیہی عوامل کو شعوری کھچاؤ کے تحت استعمال کرتے تو شاید ان کا باطنی ردھم متاثر ہو جاتا جس سے ان کی شاعری جمالیاتی سطح پر اپنا استحکام برقرار نہ رکھ پاتی۔ (حوالہ بالا صفحہ نمبر ۴۰) اور آخر میں۔۔۔

''صرف یہی کہ اقبال بھٹی کی شاعری کو آفاقی نکتہ نظر سے سماجی جدوجہد میں بطور ہتھیار یا پھر فلسفیانہ تفکر کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہلکے پھلکے احساسات تلے پڑھ کر ہی اس میں مضمر حقیقی جمالیاتی شناخت قائم کی جا سکتی ہے۔ اقبال بھٹی اپنی شاعری سے الگ نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے افکار، کردار اور محسوسات سمیت اسی میں سمائے ہوئے ہیں۔ بہر حال آج کے اس انحطاط پذیر دور میں اقبال بھٹی جیسے شعراء کی قدر افزائی کرنی ضروری ہے۔ (حوالہ بالا۔ صفحہ نمبر ۴۲)

- بقیہ -

''زہریلا انسان''

بات کا رخ بدلتے ہوئے میں نے کہا، باپو کالی اور چترا ایک دوسرے میں خاصے گھل مل گئے۔ باپو بولے، دونوں جہاں بھی جاتے ہیں ایک ساتھ جاتے ہیں۔ اب تو یہ سارا سارا دن غائب رہنے لگے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں پھرے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کالی اسے اپنا علاقہ بڑی تفصیل سے دکھا رہی ہے۔ دن ڈھلنے لگا تھا، میں اپنے لیے ایک کٹورے میں تھوڑی سی شراب انڈیل کر اپنے بستر پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ کٹورہ خالی کر کے سویا تو پھر میری آنکھ صبح باپو کے اٹھانے پر کھلی۔ اٹھ کر دانت صاف کیے، لنگوٹ پہن کر جھرنے پر نہا کر تازہ دم ہو کر کرتا پاجامہ پہن کر باپو کے ساتھ دودھ کا ناشتہ کیا۔ خالی ذہن پر آج کتابوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لیے بین اٹھا کر جھرنے کے پاس بیٹھ کر بجانے لگا۔ کافی دیر تک بین بجاتا رہا۔ اس دوران کالی اور چترا میرے پاس آ گئے۔ کچھ دیر ان سے کھیل میں وقت گزارا۔ انہیں اندر رکھ کر بستر پر لیٹا تو باہر سے باپو کی آواز آئی، رامو بیٹے کچھ لوگ تمہیں ملنے آئے ہیں۔ باہر نکلا تو نیتو اور اس کے والدین کو ایک بار پھر اپنے ہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کل کی نسبت آج نیتو زیادہ ہشاش بشاش لیکن سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی جس نے اس کے حُسن میں اضافہ کر دیا تھا۔

آپ! خیر تو ہے؟ میرے منہ سے نکلا۔ وکرم نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، بھئی آج ہم خالص کاروباری وجہ سے آئے ہیں۔ کاروباری وجہ سے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ سو فیصدی کاروباری وجہ سے، لانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کہا، چلو اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ انہیں جھونپڑی میں لایا تو وکرم میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے، شان جی آپ بھی آ جائیں۔ باپو اور میں باپو کے بستر پر بیٹھ گئے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید وکرم بابو مجھے اپنی بیٹی کو بچانے کا کچھ صلہ دینا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اگر ان لوگوں نے ایسا کچھ کیا تو میں اس خاندان کو کھڑے کھڑے اپنے ہاں سے نکال دوں گا۔ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ پہلے بیٹی نے میری توہین کی اور اب والدین ہماری غربت کا مذاق اڑانے آئے ہیں۔

کام دھینو

(اردو یکبابی ڈرامہ)

سلام بن رزاق

(بھارت)

(پردہ اُٹھنے کے فوراً بعد اسٹیج کی دائیں جانب سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹتی ہے جیسے صبح ہو رہی ہو۔ اسٹیج بالکل خالی ہے۔ صرف درمیان میں ایک چھوٹا سا چبوترا نما پلیٹ فارم بنا ہے۔ جوں جوں روشنی پھیلتی جاتی ہے اسٹیج کے دائیں بائیں سے بیلوں اور گایوں کے ڈکرانے، بکریوں کے ممیانے کسی عورت کے چلانے، کسی بچے کے چیخ کر رونے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ ایک شخص ایک ونگ سے نکل کر پلیٹ فارم پر بیٹھا دانتون کرنے لگتا ہے۔ ایک گوالا اپنے سر پر دودھ کی کین لیے دائیں ونگ سے لپ لپ جھپ جھپ گزرتا ہے۔ بائیں ونگ سے ایک دوسرا گوالا ہاتھ میں دو خالی کین لیے آتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پرنام کرتے ہیں اور مخالف ونگوں میں چلے جاتے ہیں۔ دانتون کرنے والا شخص اُٹھ کر ونگ کے اندر چلا جاتا ہے۔

تبھی بائیں ونگ سے ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ تین لوگ بائیں ونگ سے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں بھونپو ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں بینر ہے جس پر بڑا سا سورج کا نشان بنا ہوا ہے۔ تیسرے شخص کے گلے میں ڈھول ہے۔ تینوں اسٹیج کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈھول والا ڈھول بجا رہا ہے۔ تینوں کے گلے میں ہرے رنگ کے رومال ہیں۔ بھونپو والا اسٹیج پر گھوم گھوم کر اعلان کرتا ہے۔)

بھونپو والا: ''بھرت پور کے باسیو! جاگو، غفلت کی نیند سے جاگو، ابھی نہیں جاگے تو کبھی نہیں جاگو گے۔ دیکھو..... دیکھو..... رات بیت گئی اندھیرا چھٹ گیا۔ ناانصافی، نابرابری، بھوک اور بے کاری کا اندھیرا..... نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ سورج جو اُجالے کا پیغامبر ہے، روشنی کا ہرکارہ اور زندگی کا اشارہ ہے۔ یاد رکھو! سورج صرف اونچی عمارتوں اور محل دوملوں کو روشن نہیں کرتا۔ وہ جھگی جھونپڑیوں میں بھی اپنا نور بکھیرتا ہے۔ سورج ہماری خوش حالی اور مسرتوں کا ضامن ہے۔ یاد رکھو! سورج کا نشان، جاگ اٹھا ہندوستان جاگو، بھرت پور کے باسیو! تم بھی جاگو اور تمھارے ہمارے اور سب کے لیڈر قوم کے رہنما، امیروں کے ہمنوا، غریبوں کے ہمدرد، انسان دوست، انسانیت نواز عالی نسب، عالی دماغ، الحاج، مرزا نوشاد علی ابن ناشاد علی کو ووٹ دو..... مرزا نوشاد علی.....!''

تینوں: زندہ باد، زندہ باد

(اس دوران دونوں طرف کی ونگس سے لوگ آنکھیں ملتے جماہیاں لیتے نکلتے ہیں۔ بے دلی سے بھونپو والے کی تقریر سنتے ہیں۔)

بھونپو والا: صاحبو! آیئے، گرام پنچایت کے میدان میں بابائے قوم الحان مرزا نوشاد علی ابن ناشاد علی بہ نفس نفیس

آپ سے خطاب کرنے تشریف لا رہے ہیں۔

(بھونپو والا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ونگ کے دائیں طرف سے نکل جاتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد ایک ایک کر کے لوگ بھی جماہیاں لیتے ہوئے واپس ونگ میں چلے جاتے ہیں۔ اب اسٹیج پر ایک بوڑھا اور ایک نوجوان رہ جاتے ہیں۔)

بوڑھا: اے ببوا! یہ مرزا نوشاد علی کون ہیں رے؟

ببوا: کوئی نیتا معلوم ہوتے ہیں۔

بوڑھا: ہمرے جمانے میں تو گاندھی بپّا، جواہر لال نہرو، مولانا آجاد جیسے لوگ نیتا ہوتے تھے۔ یہ کیسے نیتا ہیں رے، مرجانو شاد علی..... ابن ناشاد علی.....

ببوا: یہ نئے زمانے کے نیتا ہیں کاکا۔

بوڑھا: کتاب کرنے آرہے ہیں..... کیا مطلب؟

ببوا: کتاب نہیں..... خطاب.....

بوڑھا: ہاں، ہاں، وہی کھتاب کرنے آرہے ہیں۔ مطلب کیا کرنے آرہے ہیں؟

ببوا: بھاشن دینے آرہے ہیں۔

بوڑھا: بھاشن دینے ہم سمجھے..... کتاب مانے کوئی پاٹھ واٹھ کرنے آرہے ہیں۔

ببوا: پاٹھ تو پنڈت لوگ کرتے ہیں کاکا۔ نیتا لوگ تو بھاشن دیتے ہیں بھاشن۔

بوڑھا: (تنک کر) ہاں..... ہاں..... اِتّا تو ہم کو بھی مالوم ہے۔ ہم کو ودّیا مت سیکھا۔ کل کا چھوکرا چلا ہے ہم کو سیکھانے..... اونہہ.....

(بوڑھا پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ اور ببوا کھسیانا سا حیران نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر خود بھی کاندھے اُچکا کر اس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔)

فیڈ آؤٹ

فیڈ اِن

(اسٹیج کے چبوترا نما پلیٹ فارم کے اوپر ایک کرسی رکھی ہے۔ سامنے گاؤں والے بیٹھے ہیں۔ سب آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے ہیں۔ دو لوگ آپس میں چلم کے کش لگا رہے ہیں۔ ایک شخص ہتھیلی پر تمباکو کو مسل رہا ہے۔ ایک بیٹھے بیٹھے منہ پر دو انگلیاں رکھے، پچ، سے ایک طرف تھوکتا ہے۔ دو لوگ کسی بات پر ایک دوسرے کے تالی مار کر زور سے ہنستے ہیں۔ اتنے میں ڈھول کی آواز کے ساتھ دائیں ونگ سے وہی بھونپو والا داخل ہوتا ہے۔ اب اس کے ساتھ ڈھول والا اور بینر والا بھی ہے۔ ان کے گلے میں ہرے رنگ کا گمچھا ہے۔ بھونپو والا اعلان کرتا ہے۔)

بھونپو والا: آ گئے، آ گئے..... تمھارے ہمارے اور سب کے لیڈر..... بابائے

قوم حاجی نوشادعلی تشریف لا رہے ہیں۔

(اس کے پیچھے ونگ سے کالی شیروانی، سفید چوڑی دار پاجاما پہنے سر پر فرکی بھوری ٹوپی اوڑھے، گلے میں ہرے رنگ کا کُرتا ڈالے نوشادعلی داخل ہوتے ہیں۔ان کے پیچھے ان کے چار ساتھی، کرتا پاجاما پہنے سر پر گول ٹوپیاں اوڑھے آتے ہیں۔مرزا نوشادعلی کی چھوٹی فرنچ کٹ داڑھی بھی ہے۔نوشادعلی کبھی آداب کرتے، کبھی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے چبوترے پر رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔)

بھونپوالا: (نعرہ لگاتا ہے۔) مرزا نوشادعلی.....

(نوشادعلی کے ساتھی زندہ باد.....زندہ باد کی تکرار کرتے ہیں۔نوشادعلی کے ساتھ آئے ہوئے دو لوگ انہیں ہار پہناتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔مگر چبوترے کے سامنے بیٹھے ہوئے گاؤں والے خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔)

بھونپوالا: اب آپ کے ہر دلعزیز لیڈر الحاج مرزا نوشادعلی آپ سے خطاب کریں گے۔آیئے حاجی صاحب!

(نوشادعلی اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی تقریر شروع کرتے ہیں۔)

نوشادعلی: بھرت پور کے باسیو! ہمارا نام نوشادعلی ابن ناشادعلی ہے۔ہم اس گاؤں کے نہیں ہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس گاؤں میں آنے کا ہمیں اتفاق ہوا۔ہم یہاں کے کسی شخص سے واقف نہیں ممکن ہے کبھی آپ نے ہمارا نام نہ سنا ہو۔مگر یقین جانیے ہم نے خواب میں بار بار اس گاؤں کو دیکھا ہے۔ہاں خواب میں دیکھا ہے۔ایسا لگتا ہے یہاں کی گلیاں، یہاں کے مکان، یہاں کے پیڑ پودے، یہاں کے جانور انسان سب سے ہمارا گہرا رشتہ ہے۔آپ کو دیکھ کر ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔ہم ایک ایک چہرے سے آشنا ہیں۔ہمیں آپ میں سے کسی کا نام بھی نہیں معلوم مگر آپ کے چہرے ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں۔ہم جانتے ہیں بھرت پور کے باسی گوالا برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ہم نے جب بھرت پور آنے کا ارادہ کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ بھرت پور کے باسیوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ صرف اس امیدوار کو ووٹ دیں گے جو اُن کی برادری سے تعلق رکھتا ہو۔یعنی جو گوالا ہو اسی کو اپنا ووٹ دیں گے۔بڑا اچھا فیصلہ ہے۔اس معاملے میں ہم بھی آپ کے حامی ہیں۔اپنی برادری کو عزت دینا۔اسے آگے بڑھانا،

اس کی حمایت کرنا اچھی بات ہے۔مگر ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس حلقے سے چودہ امیدوار کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک بھی آپ کی برادری سے تعلق نہیں رکھتا یعنی کوئی بھی امیدوار گوالا نہیں ہے۔میں بھی گوالا نہیں ہوں مگر میں جو بات کہنے جا رہا ہوں اسے غور سے سنیے میں ایک سچا ہندوستانی ہوں اور ساتھ ہی ایک پکا مسلمان بھی ہوں ایک طرف مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میرے اجداد نے اس سرزمین سے اتنا پیار کیا کہ اسے فردوس بریں بنا دیا۔تو دوسری طرف مجھے فخر ہے کہ میں اس رسولؐ کا کلمہ پڑھتا ہوں جس نے دائی حلیمہ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔کون تھی دائی حلیمہ؟ بتایئے کون تھی دائی حلیمہ؟

بھونپوالا: میں بتاتا ہوں.....

نوشادعلی: ہاں.....بتاؤ.....تم بتاؤ.....

بھونپوالا: دائی حلیمہ ایک گوالن تھیں۔

نوشادعلی: صحیح جواب.....دائی حلیمہ ایک گوالن تھیں گوالے مویشی پالتے ہیں نا، گائے، بھینس، بکریاں وغیرہ.....دائی حلیمہ بھی بکریاں پالتی تھیں! اس حساب سے وہ گوالن ہی تو ہوئیں۔میرا رسولؐ میرا کالی کملی والا، گوالا نہیں تھا مگر اس نے دائی حلیمہ کی بکریاں چرائی تھیں۔

نوشادعلی کا ساتھی ۱: سبحان اللہ

نوشادعلی: اپنے مقدس ہاتھوں سے بکریوں کا دودھ دوہا تھا۔

ساتھی ۲: جزاک اللہ

نوشادعلی: انہیں دلارا اور پٹکارا تھا۔

ساتھی ۳: ماشاءاللہ

نوشادعلی: بے شک وہ گوالا نہیں تھا مگر اس نے وہ سارے کام انجام دیے تھے جو ایک گوالا دیتا ہے۔

ساتھی ۴: اللہ.....اللہ.....

نوشادعلی: اب آپ ہی بتایئے جب میرے پیارے نبیؐ آقائے نامدار دو جہاں کے سردار نے دودھ دوہا ہے اور بکریوں کے گلے کی نگہبانی کی ہے تو پھر ان کی امت کا ایک گنہ گار خادم بھلا اس کام کو کرنے میں فخر کیوں نہیں محسوس کرے گا۔(چاروں ساتھی اور بھونپوالا.....مرزا نوشادعلی.....زندہ باد، کے نعرے لگاتے ہیں۔)

نوشادعلی: آج اس بھرت پور میں گوالوں کی اس چھوٹی مگر پرانی بستی میں، میں اپنے آقائے نامدار، سرکار دو عالم کی خاک پا کے صدقے میں اپنے آپ کو گوالا برادری میں شامل کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔

(چاروں ساتھی اور بھونپوالا، نعرے لگاتے ہیں نوشادعلی زندہ باد، انقلاب زندہ باد.....)

نوشادعلی: میں آج آپ کے سامنے اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میں گوالا نہیں ہوں مگر گوالوں سے الگ بھی نہیں ہوں۔

(چاروں ساتھی ایک بار پھر نعرہ لگاتے ہیں۔)

نوشادعلی: مجھے معلوم ہے کہ اس متبرک کام میں ہر کوئی میرا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے۔بیسوں لوگ اپنی اپنی گائیں اور بھینس پیش کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں.....میں گاؤں کے آخر میں جس غریب گوالے کا گھر پڑے گا اسی کی گائے کا دودھ دوہوں گا۔کیوں کہ میرے آقاؐ کو بھی غریبوں سے محبت تھی۔

(چاروں ساتھی زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں گاؤں والے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گردنیں ہلاتے ہیں۔نوشادعلی چبوترے سے اتر کر اسٹیج پر ایک چکر لگاتے ہیں آگے آگے بھونپو والا نعرے لگاتا ہوا چل رہا ہے۔ان کے پیچھے ان کے ساتھی ہیں۔گاؤں والے بھی چپ چاپ ان کے ساتھ چل رہے ہیں مگر وہ نعرے نہیں لگاتے۔نوشادعلی اس طرح پرنام کرتے آداب کرتے اور ہاتھ

ہلاتے چلتے ہیں جیسے سڑک پر اور مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں لوگ کھڑے انہیں دیکھ رہے ہیں۔ آخر وہ بائیں طرف کی ونگ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے ان کے ساتھی اور گاؤں والے بھی نکل جاتے ہیں۔)

فیڈ آوٹ

فیڈ اِن

(اسٹیج کے چبوترے پر اب ایک مٹکا رکھا ہے، چبوترے کے ایک کنارے مادھو اکڑوں بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اس کے بدن پر صرف ایک دھوتی ہے اور سر پر میلا پٹکا بندھا ہے۔ چبوترے کے نیچے ایک گائے بندھی جگالی کر رہی ہے۔ اس کے گلے میں گھنٹی رہ رہ کر بج اٹھتی ہے۔ پاس ہی مادھو کی بیوی جمنا بیٹھی اُپلے تھاپ رہی ہے۔ اس کے پاس ہی گوبر کا ٹوکرا رکھا ہے، اتنے میں دائیں ونگ سے ڈھول کی ڈھم ڈھم کے ساتھ نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مادھو اور اس کی بیوی چونک کر آواز کی طرف دیکھتے ہیں۔ اتنے میں بھونپو والا ڈھول والا اور بینر والا اسٹیج پر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے نوشاد علی اور ان کے ساتھی ہیں۔ ان کے پیچھے گاؤں والے بھی ہیں مادھو بیڑی پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بھونپو والا نوشاد علی سے کہتا ہے۔)

بھونپو والا: حاجی صاحب! یہی ہے گاؤں کا آخری مکان..... یہ مادھو ہے اور یہ اس کی گائے ہے۔ (پھر ایک خاص لے میں کہنا شروع کرتا ہے۔) مادھو غریب ہے۔ اس کی گائے بھی غریب ہے۔

بینر والا: مادھو سیدھا ہے۔ اس کی گائے بھی ویسی ہی سیدھی ہے۔

ڈھول والا: (ڈھول پر تھاپ مار کر) مادھو کسی سے جھگڑا نہیں کرتا۔ اس کی گائے بھی کسی کو سینگ نہیں مارتی۔

بھونپو والا: مادھو روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لیتا ہے۔

بینر والا: اس کی گائے بھی اللہ میاں کی گائے ہے۔ دانہ دنکا بھوسی چوکر..... کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر

بھونپو والا: مادھو کبھی کوئی خواب نہیں دیکھتا۔

ڈھول والا: اس کی گائے بھی کوئی خواب نہیں دیکھتی۔

بینر والا: اس کی گائے گوٹھے میں کھونٹے سے بندھی رہتی ہے۔

ڈھول والا: مادھو بھی اپنی گرھستی کی کھونٹی سے بندھا ہے۔

بھونپو والا: آیئے حاجی صاحب! آیئے مبارک ہاتھوں سے اس کا دودھ دوہ کر ایک نئی تاریخ کا آغاز کیجیے۔ (بھونپو والا مادھو کی طرف مُڑ کر) مادھو بھائے۔ یہ حاجی نوشاد علی صاحب ہیں۔ تمھارے علاقے سے الیکشن میں کھڑے ہیں۔ یہ تمھاری اجازت سے تمھاری گائے کا دودھ دوہ کر گوالا برادری میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ تم اجازت دیتے ہونا.....؟

(مادھو منہ کھولے سب کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔)

بھونپو والا: مادھو بھائے بولو..... تم اجازت دیتے ہونا!

(مادھو اب بھی چپ ہے نوشاد علی کے چاروں ساتھی ایک ساتھ سخت لہجے میں کہتے ہیں۔

چاروں ساتھی: اجازت دیتے ہونا.....؟

(مادھو گھبرا کر جلدی جلدی گردن ہلاتا ہے بھونپو والا چلاتا ہے۔)

بھونپو والا: اجازت ہے..... اجازت ہے۔

(ساتھی نعرے لگاتے ہیں اتنے میں کوئی پیتل کا ایک لوٹا لے کر آتا ہے۔ نوشاد علی اپنی شیروانی کی آستین چڑھا کر گائے کے پیروں کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی لوگ ناظرین کی طرف پشت کر کے مادھو، نوشاد علی اور گائے کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ تینوں ناظرین کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ڈھول بجانے والا ناظرین کی طرف رخ کر کے زور زور سے ڈھول بجاتا ہے۔ اسٹیج سرخ روشنی میں نہا جاتا ہے۔ تبھی دائیں ونگ سے ایک نیم برہنہ شخص وحشیانہ رقص کرتا ہوا اور بدن پر کوڑے برساتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر بھبھوت ملا ہے اور بدن پر گلال پڑا ہے۔ اس کے پیروں میں گھنگھرو بندھے ہیں۔ اس کے بال اس کے کاندھوں پر جھول رہے ہیں وہ رقص کرتا ہوا۔ اپنے بدن پر کوڑے برساتا ہوا۔ ڈھول کی تھاپ پر دائیں ونگ سے بائیں ونگ کی طرف چلا جاتا ہے۔ سرخ روشنی فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔ دائرے میں کھڑے لوگ خوشی سے نعرہ لگاتے ہیں۔ ''حاجی نوشاد علی..... زندہ باد''

ساتھی ہی لوگ دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ نوشاد علی فاتحانہ انداز میں کھڑے ہیں پیتل کا لوٹا ان کی دو ٹانگوں کے بیچ نظر آتا ہے، مادھو پھٹی آنکھوں سے ان سب کو دیکھ رہا ہے۔ گائے بیٹھی دھیرے دھیرے جگالی کر رہی ہے۔

نوشاد علی مادھو سے کہتے ہیں۔)

نوشاد علی: بھائی مادھو! ہم تمھارے بہت شکر گزار ہیں۔

بھونپو والا: مطلب یہ کہ آبھاری ہیں۔

نوشاد علی: ہاں، آبھاری ہیں تم نے ہمیں اپنی گیّاں کا دودھ دوہنے کا موقع دیا۔ تمھاری کشادہ دلی۔

بھونپو والا: یعنی اُدارتا.....

نوشاد علی: ہاں..... اُدارتا کا ذکر ہم ودھان سبھا میں بھی کریں گے۔ ساتھ ہی تمھیں اور تمھاری گائے کو زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ (مجمع کی طرف مڑ کر) بھائیو! اب تو آپ لوگوں کو یقین ہو گیا نا کہ نوشاد علی آپ کا اپنا بندہ ہے۔

(مجمع کے لوگ تو چپ رہتے ہیں۔ بھونپو والا بینر والا اور ڈھول والا جی ہاں، 'جی ہاں' کرتے ہوئے گردنیں ہلاتے ہیں۔ نوشاد علی اپنے ساتھیوں کے نعروں کے درمیان ہاتھ جوڑے ہوئے ونگ سے باہر نکل جاتے ہیں ان کے پیچھے گاؤں والے بھی نکل جاتے ہیں مادھو اپنی گائے کے پاس کھڑا ان سب کو جاتے ہوئے حیران نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گائے کے پیروں کے پاس دودھ کا لوٹا الٹا پڑا ہے۔ دودھ فرش پر بہہ چکا ہے۔ مادھو کی بیوی جواب تک ونگ سے جھانک رہی تھی تیزی سے اسٹیج پر آتی ہے اور مادھو کو جھنجھوڑ کر پوچھتی ہے۔

بیوی: یہ سب کیا ہے؟

مادھو: (ابھی تک حیران کھڑا ہے) مالوم نہیں۔

بیوی: کون تھے یہ لوگ؟

مادھو: (جیب سے بیڑی نکالتے ہوئے) مالوم نہیں۔

بیوی: انہوں نے اپنی گیاں کا دودھ کیوں نکالا؟

مادھو: (بیڑی ہونٹوں میں دباتے ہوئے) مالوم نہیں۔

بیوی: (اسے جھنجھوڑتے ہوئے) تم نے پوچھا نہیں؟

مادھو: (بیڑی اس کے منہ سے گر جاتی ہے۔) پوچھا تھا مگر انہوں نے جو کچھ بتایا میری سمجھ میں نہیں آیا۔

بیوی: ارے انہوں نے جبردستی اپنی گیاں کا دودھ نکالا اور تم چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے

مادھو: پھر کیا کرتا؟

بیوی: ان کو روکا کیوں نہیں؟

مادھو: روکا تھا.....مگر وہ رکے نہیں۔

بیوی: میں نے سویرے ہی گیاں کا دودھ نکالا تھا۔ اور اب ایک گھنٹے کے بعد ان لوگوں نے پھر اس کا دودھ نکالا۔ اس پر ظلم یہ کہ بنا کھائے پیئے پورا دودھ گرا کر چلے گئے۔

(مادھو چبوترے پر اکڑوں بیٹھ کر بیڑی سلگاتا ہے اور کش لیتا ہے۔)

بیوی: (مادھو کی بیوی کپڑے سے فرش کا دودھ پونچھتی ہے) ہم گیاں پالیں اسے دانہ کھلائیں اس کا گوبر اٹھائیں اس کی دیکھ بھال کریں اور کوئی بھی آئے اور اس کا دودھ نکال کر چلا جائے کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی روکنے والا نہیں۔ کسی کو کیا مالوم ایک ایک بوند دودھ کے لیے ہم کتنا پسینہ بہاتے ہیں کتنا کھون جلاتے ہیں۔

(کپڑا لے کر چلی جاتی ہے۔ مادھو اکیلا چبوترے پر بیٹھا ہے۔)

فیڈ آؤٹ

فیڈ اِن

(اسٹیج کے چبوترے پر ایک کرسی رکھی ہے چبوترے کے ایک کونے میں دو لوگ بیٹھے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں ٹرانزسٹر ہے جس سے گیت نشر ہو رہا ہے۔)

گیت: آہیں نہ بھری، شکوے نہ کئے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا.....

(دونوں گیت سنتے ہوئے گردن ہلا رہے ہیں اتنے میں دائیں ونگ سے ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ دونوں ٹرانزسٹر بند کر کے ادھر دیکھتے ہیں۔ بھونپو والا ونگ سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے بینر والا بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ جس پر ایک بہت بڑے رتھ کا نشان ہے۔ دوسرے کے گلے میں ڈھول ہے اور وہ جھوم جھوم کر ڈھول بجا رہا ہے، تینوں کے گلے میں کیسری کا رنگ کے رومال ہے۔ بھونپو والا کہہ رہا ہے۔)

بھونپو والا: بھرت پور کے باسیو! یاد رکھیے جس طرح بہتی ندی کا دھارا نہیں رکتا۔ سمے بھی نہیں رکتا مگر ندی پر بند باندھ کر اس کے دھارے کو روکا جا سکتا ہے، موڑا جا سکتا ہے، اسی طرح آپ کا ایک صحیح فیصلہ سمے کے دھارے کو موڑ سکتا ہے۔ بھائیو! اتہاس کے رُخ کو موڑنے کا سمے آ گیا ہے۔

(ونگ کے اندر سے شنکھ پھونکنے کی آواز آتی ہے۔)

بھونپو والا: سُنیے، سمے کی آواز سنیے.....سمے آپ کو پکار رہا ہے۔

(دائیں ونگ سے پنڈت اونکار ناتھ اور ان کے چار ساتھی داخل ہوتے ہیں۔ یہ چاروں وہی ہیں جو نوشاد علی کے ساتھ تھے پہلے ان کے گلے میں ہرا رومال تھا۔ اب کیسری رنگ کا رومال ہے۔) پنڈت اونکار ناتھ سفید دھوتی کرتا اور جیکٹ پہنے ہوئے ہیں ماتھے پر تلک لگا ہے گلے میں پھولوں کی مالا ہے۔ ان کے گلے میں بھی کیسری رنگ کا گمچھا ہے، وہ ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے چبوترے پر رکھی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھی ان کی جے جے کار کرتے ہیں۔ بائیں ونگ سے گاؤں والے ایک ایک دو دو کر کے چبوترے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔)

بھونپو والا: بھرت پور کے باسیو! سروشری پنڈت اونکار ناتھ آپ کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ پنڈت جی کے پتا شری سورگیہ ہزاری پرساد کے نام سے آپ سب بھی بھلی بھانتی پریچت ہیں۔ یہ وہی ہزاری پرساد ہیں جنہوں نے پورے دیس میں رتھ یاترا نکال کر بھارت واسیوں کے من میں دھرم کی جوت جگائی تھی۔

ساتھی ۱: یہ وہی ہزاری پرساد ہیں جنہوں نے پورے دیش سے کروڑوں روپے دان لے کر آنند پور میں کرشن بھگوان کے بھویہ مندر کی ستھاپنا کی ہے۔ جس کی سالانہ یاترا میں آپ لوگ بھی درشن کے لیے جاتے ہیں۔

ساتھی ۲: پتا شری تو دھرم کی سیوا میں وشواس رکھتے تھے مگر پنڈت اونکار ناتھ لوک سیوا میں وشواس رکھتے ہیں۔ (جے جے کار کے نعرے) اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی آواز ودھان سبھا تک پہنچے تو پنڈت اونکار ناتھ کو ووٹ دیجئے کیوں کہ پنڈت اونکار ناتھ کی آواز آپ کی آواز ہے۔ پنڈت جی کا نشان رتھ ہے۔

ساتھی ۳: یہ وہی رتھ ہے جس پر بیٹھ کر ان کے پتا شری ہزاری پرساد نے پورے بھارت ورش میں جن جاگرن کا ابھیان چھیڑا تھا۔

ساتھی ۴: یاد رکھیے رتھ ہمارے دھرم، ہماری سنسکرتی اور ہمارے راشٹر کا پرتیک ہے۔ پنڈت اونکار ناتھ کی.....جے.....سب.....نعرے لگاتے ہیں۔)

بھونپو والا: لیجئے اب خود پنڈت جی آپ کو سمبودھت کریں گے۔

(پنڈت اونکار ناتھ اٹھتے ہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو پرنام کرتے ہیں۔ پھر گلا صاف کر کے بولنا شروع کرتے ہیں۔)

پنڈت اونکار ناتھ: بھرت پور کے باسیو! ہمارا آپ کا سمبندھ بہت پرانا ہے میرا پریچے دیا جا چکا ہے۔ میں اپنے بارے میں زیادہ باتیں کرنا یا سننا پسند نہیں کرتا۔ اصلی پریچے نام سے نہیں کام سے ہوتا ہے (تالیاں) میں بھی اپنا اصلی پریچے اسی وقت دوں گا جب آپ مجھے چن کر ودھان سبھا میں بھیجیں گے اور مجھے سیوا کا اوسر دیں گے۔ میں کام میں وشواس رکھتا ہوں اور کام کو ہی اپنا دھرم ایمان سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں بھرت پور کے لوگ بڑے کام کاجی ہیں وہ فالتو راج نیتی میں اپنا سمے نشٹ نہیں کرتے مگر یہ بھی سچ ہے کہ راج نیتی کے بنا دیش کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ ایک صاف

ستھری سرکار بنانے کے لیے آپ جیسے نسوارتھ لوگوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔ سنا ہے کہ آپ لوگوں نے صرف اپنی برادری والے کو ووٹ دینا طے کیا ہے۔ آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر لوک راجیہ میں ہر ایک کو اپنے اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا پورا پورا ادھیکار ہے۔ میں آپ کے اس فیصلے کا دل سے سواگت کرتا ہوں۔ دو گھنٹے پہلے یہاں ایک بھجن پدھارے تھے۔ سنا ہے انہوں نے ایک لمبا چوڑا بھاشن بھی دیا۔ مگر آپ جانتے ہیں ان مہاشے کا بھرت پور اور بھرت پور کے لوگوں سے دور دور تک کوئی سمبندھ نہیں۔ سنا ہے انہوں نے گائے کا دودھ دوہ کر اپنے آپ کو گوالا ثابت کرنے کا ناٹک بھی کیا۔

بھونپو والا: ہاں.....ناٹک بھی کیا۔

پنڈت: مگر ناٹک میں اور اصلیت میں بہت بڑا انتر ہے۔ میں کہتا ہوں صرف دودھ دوہنے سے کوئی گوالا نہیں ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے پیغمبر کی مثال دی کہ وہ بکریاں چراتے تھے اور دودھ دوہتے تھے۔ بہت اچھی بات ہے ہم ان کے پیغمبر کا سمان کرتے ہیں۔ مگر بھائیو! میں پوچھتا ہوں ان مثالوں کے لیے آخر سمندر پار جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پرانوں اور دھرم پستکوں میں سب سے بڑی مثال تو ماکھن چور، نندلال، ہری گوپال شری کرشن کی ہے۔ (نعرہ) مجھے بتایئے شری کرشن سے بڑا گوالا اس دھرتی پر پیدا ہوا ہے؟

ساتھی: نہیں.....نہیں.....نہیں.....

پنڈت: نہیں نا.....تو پھر سن لیجئے ہمارا یعنی پنڈت اونکار ناتھ کا رشتہ سیدھے کرشن گوپال ہی سے جڑتا ہے۔

(پنڈت اونکار ناتھ کے لوگ ان کی جے جے کار کرتے ہیں۔)

پُنڈت: ہمارے پوروجوں کا سمبندھ شری کرشن کی دوارکا سے ہے کرشن بھکتی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے پتا شری نے پورا جیون لگا کر آنند پور میں بھگوان شری کرشن کا بھویہ مندر استھاپت کیا۔ (نعرہ) ہم گوالے نہیں ہیں مگر ہم سب سے بڑے گوالے کرشن بھگوان کے سیوک اور اُپاسک ہیں۔ رہی دودھ دوہنے کی بات تو بھائیو! ہم بھگوان کرشن کے نام پر اسی وقت چل کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو دودھ دوہ کر بتائیں گے۔ اور اُسی گئو ماتا کا دودھ دوہیں گے جس کا اس سے پہلے دوہا گیا تھا۔ (نعرہ) ارے پرائے آ کر ہماری ماتا کا دودھ دوہ لیں اور ہم جو اس کی سنتان ہیں اپنی ماتا کے کشیر امرت سے وَنچت رہ جائیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

(پنڈت اونکار ناتھ کے ساتھی دوہراتے ہیں۔ نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا،

پھر پنڈت اونکار ناتھ کی جے جے کار کرتے ہیں پنڈت اونکار ناتھ چبوترے سے نیچے اترتے ہیں ایک بار پھر سنکھ پھونکا جاتا ہے ڈھول بجاتے نعرے لگاتے سب اسٹیج پر ایک چکر لگاتے ہیں۔ اونکار ناتھ ہاتھ جوڑے سب کو پرنام کرتے ہیں اور ونگ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ پورا جلوس ان کے پیچھے پیچھے اسٹیج سے نکل جاتا ہے۔)

فیڈ آؤٹ

فیڈ اِن

(مادھو پہلے کی طرح چبوترے پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی بیوی گائے کو بھوسی کھلا رہی ہے)

جمنا کی بیوی: (گائے سے) کھالے بھوسی کھالے گوری.....تو ناراض مت ہو.....تو تو ہماری ماتا ہے۔ ماتا کبھی سنتان سے ناراج ہوتی ہے کیا۔ ماتا کا ہردے تو آکاش کی طرح وشال ہوتا ہے۔ جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ پر گوری ہم بھی کیا کریں۔ ہم ٹھہرے گریب، گریب کو اس سنسار میں سب سہنا پڑتا ہے گوری۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ گریب سنسار میں پھکت سہنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کا جلم سہنے کے لیے کشٹ سہنے کے لیے بھوک سہنے کے لیے بے انتی سہنے کے لیے، دوسروں کی مار اور دھتکار سہنے کے لیے یہ سب بھاگیہ کا کھیل ہے گوری بھگوان نے ہمارے بھاگ میں یہی سب لکھا ہے۔ جو لکھا ہے اسے بھوگنا تو پڑے گا نا گوری.....لے.....ناراج مت ہو.....بھوسی کھالے.....

(گائے گردن ہلاتی ہے تبھی دائیں ونگ کی طرف سے شنکھ پھونکنے، ڈھول بجانے اور نعرے لگانے کی آوازیں آتی ہیں۔ مادھو گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جمنا بھی گھبرائی نظروں سے آواز کی طرف دیکھتی ہے اتنے میں بھونپو والا، دائیں ونگ سے اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کے پیچھے بینر والا اور ڈھول بجانے والا آتے ہیں ان کے پیچھے پنڈت اونکار ناتھ اور پورا جلوس آتا ہے۔ مادھو کی بیوی جمنا ونگ کے کنارے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

بھونپو والا: (مادھو کی طرف اشارہ کر کے) پنڈت جی: یہی ہے مادھو اور یہ ہے اس کی گائے صبح حاجی نوشاد علی نے اسی گائے کا دودھ دوہا تھا۔

پنڈت اونکار ناتھ: (ہاتھ اٹھا کر) ہم کو سب پتہ ہے۔ غریب آدمی کے اور گائے کے بارے میں ہم سے زیادہ کون جانتا ہے۔ (مادھو سے) مادھو بندھو! دھنیہ ہو تم اور تمھاری گائے مگر بھائی مادھو! ایک پرائے ویکتی نے تمھاری گائے کا دودھ نکالا۔ یہ گئو ماتا کا اپمان ہے۔ ارے ایک ماسہاری بھلا گئو ماتا کی گریما اور پوترتا کو کیا سمجھے گا۔ ان کے لیے گئو ماتا کیول پرانی ہے۔ ہمارے لیے گئو ماتا بھگوان ہے۔ اس کے بھیتر تینتیس کوٹی دیوی دیوتا براجتے ہیں۔ (ہاتھ جوڑ کر) مادھو بھائی، ہم تم سے پرارتھنا کرتے ہیں ہمیں اپنی گیاں کا دودھ دوہنے دو۔ ہم ماتا کا دودھ دوہ کر سب کی طرف سے پرائشچت کرنا چاہتے ہیں۔ ارے ہم تو گئو ماتا کے پجاری ہیں۔ اصلی گوالا ہمارے سوا کون ہو سکتا ہے۔

(مادھو منہ کھولے کھڑا ہے۔ اتنے میں ایک آدمی پیتل کا لوٹا لے آتا ہے۔ پنڈت اونکار ناتھ کہتے ہیں۔)

پنڈت اونکار ناتھ: نہیں.....دودھ دوہنے سے پہلے ہم گئو ماتا کی شدھی کریں گے۔

ایک آدمی: شدھی؟

اونکار: ہاں، شدھی.....پرائے ہاتھوں کے سپرش نے ماتا کو اپوتر کر دیا ہے۔ ہم پہلے ماتا کو پوتر کریں گے۔ بعد میں دودھ دوہیں گے۔

(سب واہ، واہ کرتے ہیں اور اونکار ناتھ کی جے جے کار کرتے ہیں اتنے میں ایک پنڈت دھوتی چوٹی اور تلک لگائے منتر پڑھتا ہوا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کمنڈل ہے۔ وہ گائے کے پاس کھڑے ہو کر منتر پڑھتا ہے اور کمنڈل کا پانی گائے پر چھڑکتا ہے۔ پھر پنڈت اونکار ناتھ سے کہتا ہے۔)

پنڈت: پنڈت جی! گئو ماتا کی شدھی ہوگئی اب آپ بنا سنکوچ کے ماتا کا دودھ دوہ سکتے ہیں۔

(شنکھ پھونکا جاتا ہے۔ کمنڈل والا پنڈت ونگ سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور پنڈت اونکار ناتھ گائے کے پیروں کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار پھر سب ناظرین کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں، ڈھول والا اسٹیج کے بیچ میں کھڑے ہو کر ڈھول بجانے لگتا ہے اور پہلے کی طرح وہی نیم برہنہ شخص وحشیانہ رقص کرتا ہوا اور اپنے بدن پر کوڑے برساتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اسٹیج سرخ روشنی میں نہایا ہے۔ وحشی رقص کرتا ہوا بائیں ونگ سے باہر نکل جاتا ہے۔ سرخ روشنی فیڈ آؤٹ ہوتی ہے اور نیم دائرے میں کھڑے لوگ نعرہ لگاتے ہیں۔ 'پنڈت اونکار ناتھ کی جے' بھیڑ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پنڈت اونکار ناتھ درمیان میں کھڑے ہیں۔ لوٹا ان کے پیروں کے بیچ میں ہے۔ لوگ پنڈت جی کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈالتے ہیں۔ پنڈت جی وہ پھولوں کی مالا گائے کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھتے ہیں۔)

اونکار ناتھ: مادھو بھائی کہاں ہے؟

ایک ساتھی: (اشارہ کر کے) وہ ادھر کھڑا ہے۔

(پنڈت جی اس کے قریب آتے ہیں۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔)

اونکار ناتھ: دھنیہ ہو مادھو! تم اور تمھاری گائے..... آج پورے راشٹر کی آتما کا پرتیک بن گئے ہیں۔

(سب لوگ پنڈت اونکار ناتھ کے ساتھ مادھو اور گئو ماتا کے نام کے بھی نعرے لگاتے ہیں۔ پنڈت اونکار ناتھ اپنے جلوس کے ساتھ باہر نکل جاتے ہیں۔ مادھو آہستہ آہستہ چلتا ہوا گائے کے پاس آتا ہے۔ مادھو کی بیوی بھی آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پیار سے گائے کی پیٹھ سہلاتے ہیں گائے کے گلے کی گھنٹی بجتی ہے۔ دونوں گائے کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔)

فیڈ آؤٹ

فیڈ اِن

(اسٹیج پر چبوترے کے پاس گائے اسی طرح بیٹھی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گردن ہلا رہی ہے۔ اس کے گلے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اتنے میں دائیں ونگ سے ایک بار پھر ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ مادھو بائیں ونگ سے گھبرا کر باہر نکلتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کی بیوی جمنا بھی ہے۔ دائیں ونگ سے وہی بھونپو والا اور اس کے دونوں ساتھی داخل ہوتے ہیں۔ اب ان کے گلے میں نیلے رنگ کا رومال ہے۔ بینر والے کے ہاتھ میں جو بینر ہے اس پر ایک بڑے جہاز کی تصویر ہے اور ڈھول والا حسب سابق جھوم جھوم کر ڈھول بجا رہا ہے۔)

بھونپو والا: بھرت پور کے باسیو! اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں دیش کی نیا کا کرن دھار تمھارا اپنا امیدوار گپت راؤ سنپت راؤ آ گیا ہے۔ گپت راؤ کی جیت آپ کی جیت ہے۔ کیوں کہ گپت راؤ بھی آپ کی طرح غریب ہے نادار ہے۔ گپت راؤ کی جے..... غریب آدمی کی جے اتنے میں گپت راؤ اسٹیج پر آتا ہے اس کے گرد چار لوگ جو نوشاد علی اور پنڈت اونکار ناتھ کے ساتھ تھے۔ گلے میں نیلے رنگ کا رومال باندھے ناچ رہے ہیں۔ وہ گا رہے ہیں۔

ساتھی: گپت راؤ کی جے ہو..... جے ہو..... جے ہو
غریبوں کی جے ہو..... جے ہو..... جے ہو
ناداروں کی جے ہو..... جے ہو..... جے ہو
لاچاروں کی جے ہو..... جے ہو..... جے ہو
گپت راؤ کی جے ہو..... جے ہو..... جے ہو
جے ہو..... جے ہو.....

(گپت راؤ ان کے درمیان نیلے رنگ کا کرتا دھوتی اور گلے میں نیلے رنگ کا رومال باندھے سب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہے۔ پھر وہ بھونپو والے سے لے میں پوچھتا ہے۔

گپت راؤ: مادھو کدھر ہے.....؟ مادھو کدھر ہے.....؟

بھونپو والا: (اسی طرح لے میں مادھو کی طرف اشارہ کر کے) مادھو اُدھر ہے۔ مادھو اِدھر ہے۔

گپت راؤ: گیّاں کہاں ہے؟ گیّاں کہاں ہے؟

بھونپو والا: (گائے کی طرف اشارہ کر کے) گیّاں یہاں ہے گیّاں یہاں ہے۔

(گپت راؤ ہی ہی کرتا ہوا مادھو کے پاس جاتا ہے۔)

گپت راؤ: مادھو بھائے! میرا نام گپت راؤ ہے۔ نادار غریب لوگ کی سیوا کے لیے الیکشن میں کھڑا ہوں۔ میں بھی پہلے تمھارے مافک گریب تھا مادھو بھائے! ابھی اپنے کو بھگوان نے دو پیسہ دیا ہے اپن نے پیسہ تو بہت کمایا مادھو بھائے..... مگر گریبی کو نہیں بھولا کیا..... پیسا کیا ہے ہاتھ کا کھیل ہے۔

(گپت راؤ کی بغل میں کھڑا ایک شخص فوراً تصحیح کرتا ہے۔)

شخص: کھیل نہیں میل ہے..... پیسا ہاتھ کا میل ہے،

(گپت راؤ اس شخص کو چپت لگاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔)

گپت راؤ: پہلے کیوں نہیں بولا۔ (مادھو سے) ہاں پیسا کیا ہے ہاتھ کا میل ہے۔ ادھر آیا۔ ادھر گیا پیسا کمانا کوئی بات نہیں..... پیسا تو..... وہ..... کنپٹی پر انگلی رکھ کر وہ..... وہ..... کرنے لگتا ہے۔ وہی شخص پھر لقمہ دیتا ہے۔)

شخص: پیسا تو رنڈی بھی کماتی ہے۔

گپت: پہلے کیوں نہیں بولا۔

(شخص کو چپت مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے وہ شخص خود ہی اپنا گال آگے کر دیتا ہے۔ گپت راؤ چپت نہیں لگاتا اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور مادھو سے کہتا ہے۔)

گپت: ہاں..... پیسا تو رنڈی بھی کماتی ہے، میرے کو کچھ الگ کرنے کا تھا

سوچا گریبوں کی سیوا کرنا چاہیئے۔سالی اپنے دیس میں کتنی گریبی ہے چالیس پرتی شت لوگ گریبی کی چھایا کے نیچے جیتے ہیں۔

شخص: غریبی کی ریکھا کے نیچے جیتے ہیں۔

(بول کر فوراً چپت کھانے کے لیے اپنا گال آگے کر دیتا ہے۔)

گنپت راؤ: (چپت لگا کر) ابے چوپ.....ریکھا کے نیچے کوئی کیسے جی سکتا ہے سالا.....چھایا کے نیچے جیتے ہیں.....

شخص: سوری، آپ صحیح کہتے ہیں چھایا کے نیچے جیتے ہیں۔

گنپت: سالا ڈبل ایم۔اے ہے۔پر اب تک چھایا اور ریکھا کا فرق نہیں معلوم (مادھو سے) ہاں تو سوچا گریبوں کی سیوا کرنا چاہیے۔ (ہاتھ جوڑ کر) میرے کو سیوا کا ایک موکا دو مادھو بھائے! دیکھو گریب ہی گریب کے کام آتا ہے۔ یہ پیسے والے تو ایک نمبر کے حرامی..... ہیں۔گریب کا کھون چوستے ہیں اور اپنی تجوری بھرتے ہیں۔سالے جونک ہوتے ہیں جونک.....میرے کو مالوم ہوا ہے کہ میرے پہلے اِدھر دو دو نیتا لوگ آ کر گیا۔تمھاری گائے کا دودھ بھی نکالا دونوں پاکھنڈی تھے۔کھالی تلک لگانے سے کوئی ہندو نہیں ہوتا۔

شخص: نہیں ہوتا۔نہیں ہوتا

گنپت: کھالی داڑھی رکھنے سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔

شخص: نہیں ہوتا۔نہیں ہوتا۔

گنپت: ویسا چ کھالی گائے کا دودھ نکالنے سے کوئی گوالا نہیں ہو جاتا۔میں بھی گوالا نہیں ہوں۔مگر میں بچپن سے گئو ماتا کی سیوا کرتا آیا ہوں۔اس کا گوبر اٹھانا، اس کو نہلانا، اس کا دودھ نکالنا، اپنے کو جبانی یاد ہے۔ارے میرا پورا جیون گائے بھینس کے گوٹھے صاف کرنے میں گزرا ہے۔یہی اپنا کام ہے۔ دودھ کیسے نکالا جاتا ہے میرے سے پوچھو۔ مادھو بھائے میرے کو اپنی گائے کا تھوڑا دودھ نکالنے دو۔

مادھو: (سختی سے) نہیں.....بھگوان کے لیے.....اب اور نہیں.....میری گائے کے تھن میں اب ایک بوند بھی دودھ نہیں ہے۔ میں اب اسے ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔تم دوسری کسی گائے کا دودھ نکالو۔

گنپت: مادھو بھائے، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔گائے تو بہت ہے۔مگر ان لوگوں نے تمھاری گائے کا دودھ نکالا ہے۔اب میرے کو بھی تمھاری اچ گائے کا دودھ نکالنا پڑے گا۔نہیں تو میرا اپمان ہوگا۔ایک گریب کا اپمان سارے گریب لوگ کا اپمان ہے.....مادھو بھائے! گنپت راؤ سب کچھ سہہ سکتا ہے.....پر اپمان نہیں سہہ سکتا میں تھوڑا سا دودھ نکالوں گا۔جاستی نہیں گریب کی اجت گریب کے ہاتھ میں ہوتی ہے مادھو بھائے! بس تھوڑا سا دودھ.....

مادھو: بالکل نہیں.....وہ مر جائے گی۔اس کے تھن میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔

گنپت: ایسا مت بولو مادھو بھائے! گئو ماتا سب کی ماتا ہے۔ ماتا کبھی اپنی سنتان کو نراش نہیں کرتی۔دودھ تھوڑا سا بھی نکلے گا تو چلے گا۔ایک دم تھوڑا سا.....

مادھو بھائے! گریب کی اجت کا سوال ہے۔

(مادھو نہیں نہیں کر رہا ہے اتنے میں گنپت راؤ کے چاروں ساتھی اسے گھیر لیتے ہیں اور اسے سمجھانے کے بہانے کھدیڑتے ہوئے ایک کونے میں لے جاتے ہیں۔)

گنپت: اے لوٹا لا.....

(اتنے میں کوئی گنپت راؤ کو لوٹا لا کر دیتا ہے گنپت راؤ لوٹا لے کر گائے کے پاس جاتا ہے۔سب لوگ دوبارہ نیم دائرہ بنا کر گنپت راؤ اور گائے کو گھیر لیتے ہیں۔ مادھو اچک اچک کر دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر اسے اندر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ڈھول والا ڈھول بجا رہا ہے.....ڈم ڈم تڑاخ سرخ روشنی فیڈ ان ہوتی ہے ایک بار پھر وہی ادھ ننگا شخص اپنے بدن پر کوڑے برساتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے۔ ہر کوڑے پر مادھو اس طرح چیختا ہے جیسے وہ کوڑے اس کے بدن پر پڑ رہے ہوں۔کوڑے والا بائیں ونگ سے باہر نکل جاتا ہے۔ مادھو ڈرا سہا سکڑ سمٹ کر ایک کونے میں اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ سرخ روشنی فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔دائرے میں کھڑے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔گنپت راؤ بیچ میں کھڑا ہے، اس کے آدمی گنپت راؤ کی 'جے' کے نعرے لگاتے ہوئے بائیں ونگ سے نکل جاتے ہیں مادھو کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا دودھ کا لوٹا وہیں لڑھکا پڑا ہے۔گائے نڈھال ہو کر ایک طرف گردن ڈالے پڑی ہے۔ مادھو کی بیوی جمنا آتی ہے۔گائے کے پاس بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگتی ہے۔ پلّو سے آنسو بھی پونچھ رہی ہے، مادھو آہستہ آہستہ اٹھتا ہے۔گائے کے پاس آتا ہے۔تھوڑی دیر تک اسے چپ چاپ دیکھتا ہے پھر اچانک ایک چیخ مار کر اپنے بال نوچنے لگتا ہے۔بیچ اسٹیج پر آتا ہے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنا سینہ پیٹنے لگتا ہے، روتا ہے۔ چلاتا ہے روتے روتے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔تھوڑی دیر بعد اسٹیج کے دائیں طرف سے ایک بار پھر ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔مادھو ونگ کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ڈھول کی آواز نزدیک آ رہی ہے۔دھیرے دھیرے پردہ گرتا ہے۔

''شعلۂ نفرت''

(روہنگیا عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے)

خاموشی پہاڑ ایسی ہے ہم کو نہ مٹا دے
آ تو مری آواز میں آواز ملا دے
ڈالا ہے نیا بیج خیالوں کی زمیں میں
ممکن ہے نئی فصل بہاروں سے ملا دے
جل جائیگا تو بھی تو مرے ساتھ ذرا سوچ
اس شعلۂ نفرت کو نہ یوں اور ہوا دے

حنیف ترین (دہلی، بھارت)

ڈایالیسس

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

محترم گلزار صاحب۔

جیسا میں نے آپ سے وعدہ اور خود سے تہیہ کیا تھا کہ اب میں اپنی تحریری صلاحیت کسی با مقصد موضوع کے لئے وقف کروں گا تو آج وعدہ وفا ہو رہا ہے۔ جب میں ۱۹۸۷ میں امریکا میں کئی سال گذار کر کراچی کے آغا خان ہسپتال میں شعبہ گردے کا انچارج بن کر تعینات ہوا تھا تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ عام مریض اور انکے اقربا تو بڑی بات ہے پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ اور طبقہ اشرافیہ کی بھی امراض کے متعلق معلومات قابل رحم تھیں اس لئے ہمیں انہیں مرض کے متعلق سمجھانے میں بہت مشکل ہوتی تھی۔ میں چونکہ تقریباً بیس سال امریکا میں پریکٹس کر کے آیا تھا اور وہاں مریض اپنی بیماری کو اس قدر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب وہ ڈاکٹروں سے اپنی بیماری کے متعلق سوال کرتے تھے تو ڈاکٹر خائف ہو جاتے تھے۔ یہ طے ہے کہ اگر مریض اپنی بیماری کو اچھی طرح سمجھ لے تو وہ اس سے بہتر طور پر مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ہسپتال کے رابطہ عامہ کی مدد سے اخبار جنگ میں کئی مضامین لکھے جو بیحد مقبول ہوئے۔ امریکا واپسی پر یہاں کے سب سے بڑے اردو اخبار میں بھی میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا جس کے متعلق مجھ سے نہ صرف بالمشافہ درجنوں لوگوں نے کہا کہ اس سے کمیونٹی کو بہت فائدہ ہوا ہے بلکہ میرے پاس سینکڑوں خط آئے۔ اب کئی سال سے یہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا مگر میری اپنی خواہش اور آپ کی حوصلہ افزائی اور اصرار پر میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر رہا ہوں۔ اس پروجیکٹ کے ذریعہ میرا ارداہ ہے کہ موجودہ دور کی ہر قابل ذکر بیماری کا آسان اردو اور سہل انداز سے تذکرہ کیا جائے جس سے ہمارے قارئین کو بیماریوں اور انکے تدارک کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔ امید کرتا ہوں یہ سلسلہ قارئین کی پسندیدگی کا باعث ہوگا۔ مزید یہ کہ چونکہ میں گردے کا ڈاکٹر ہوں اور میرا خاص علاقہ ڈایالیسس کے ذریعہ علاج تھا، اور یہ بھی کہ آج کل پاکستان میں ڈالیسس عام ہے اور لوگوں میں اسکے نام ہی سے خوف و ہراس پھیل جاتا ہے اسلئے میرا پہلا مضمون ڈایالیسس ہی پر ہے۔

☆

۱۹۹۱ کے اولیں ماہ تھے جب کلنک کی سوشل ورکر نے مجھ سے کہا کہ ایک مریض کا معاملہ سنگین ہے اور مجھے اس کے ساتھ کانفرنس کرنی ہے۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ ایک تیس بتیس سال کی عورت بیٹھی تھی جسکے چہرے پر شدید تشویس اور خوف کی علامات تھیں، ہونٹ زرد تھے اور اسکی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ یہ ''پھنگ لونگ'' تھی جو چند ہی ماہ پہلے ویٹنام سے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امریکا لائی گئی تھی۔ میرے اسٹاف نے مجھے بتایا کہ اسکے گردے ناکارہ ہو چکے ہیں اور اب اسکو ڈالیسس کی ضرورت ہے مگر یہ ڈایالیسس سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ کہتی ہے کہ مرنے کو ترجیح دے گی مگر ڈایالیسس نہیں کروائے گی۔ اس کو شاید اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ یہ تو خوش قسمت ہے کہ امریکا میں ہے جہاں اس کو اس قدر مہنگے اور جدید علاج کی سہولت حاصل ہے ورنہ ویٹنام میں شاید اسکو ڈایالیسس کے بغیر چند ہفتوں میں عدم کی طرف عازم سفر ہونا پڑتا۔ میں نے اسے سمجھایا اور پوچھا تمہاری اس وقت زندگی میں سب سے بڑی خواہش کیا ہے۔ کہنے لگی میری چھ سال کی بچی ہے اور یہ میرا خواب ہے کہ میں اسے امریکا کے ہائی اسکول سے گریجویٹ ہوتا دیکھوں۔ امریکا میں طلبہ اٹھارہ سال کی عمر میں اسکول سے فارغ ہوتے ہیں اور یہ ایک بیحد رنگا رنگ تقریب ہوتی ہے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ خواہش کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں۔ اسے ڈالیسس کے ایسے مریضوں سے ملوایا جو سالوں سے اچھی زندگی گذار رہے تھے۔ اسے اسکے اپنی زبان میں اس علاج کے متعلق فلمیں دکھائیں اور سوشل ورکر، غذائی ماہرین اور نفسیاتی کاؤنسلر سے ملوایا۔ اور پھر میری اس یقین دہانی کے ساتھ کہ وہ انشااللہ اپنی بیٹی کی گریجویشن دیکھے گی وہ ڈایالیسس کے لئے تیار ہوگئی۔

پچھلے سال یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی گریجویشن کی تقریب تھی۔ میں بھی آمیں ''پھنگ لونگ'' کے اصرار پر شامل تھا۔ پھنگ لونگ سفید گاؤن پہنے ہاتھ میں سفید پھولوں کا گلدستہ لئے اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی جو ہائی اسکول سے نہیں بلکہ ایک اعلی یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو رہی تھی اسکے رخساروں پر صحت مندی کی سرخی اور اور اسکی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔ میں نے اسکی طرف مسکرا کر دیکھا۔۔ وہ جذباتی ہوگئی اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ گذشتہ چند دھائیوں میں علم طب میں جو حیرت انگیز اور معجزاتی ترقی ہوئی ہے اس میں ڈایالیسس کی ایجاد سرفہرست ہے اس طریقہ علاج سے قبل ایسے مریض جنکا گردہ مکمل طور پر ناکارہ ہو جاتا تھا نہ صرف ناقابل علاج قرار دئے جاتے تھے بلکہ مستقبل قریب میں انکی موت یقینی ہوتی تھی۔ آج تمام دنیا میں ایسے لاکھوں مریض ڈایالیسس کے ذریعہ بڑی حد تک نارمل، پر مسرت اور با مقصد زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ آج اس مضمون میں میں ڈایالیسس کے متعلق معلومات فراہم کی جائینگی اور آئندہ مضمون میں گردہ کی پیوندکاری پر روشنی ڈالی جائیگی۔

گردہ کا فعل

انسان کے جسم میں دو گردے پیٹ میں پسلیوں سے ذرا سا نیچے ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب واقع ہوئے ہیں۔ انکا حجم مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ جسم کی سب سے بڑی شریان جسے اعورطا کہتے ہیں سے خون کی دو نالیاں ان کو خون پہنچاتی ہیں۔ گردے میں پہنچ کر خون کی یہ نالیاں درخت کی شاخوں کی طرح تقسیم ہوتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ بالکل آخیر میں یہ بال برابر رہ جاتی ہیں اور اسکے بعد بھی مزید تقسیم ہو کر اتنی مہین ہو جاتی ہیں کہ انہیں صرف خوردبین سے

ہی دیکھا جاسکتا ہے۔اس مرحلے پر یہ مہین عروق شعریہ ایک گچھے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔یہ گچھا ایک پیالے نما کیپسول میں ملفوف ہوتا ہے۔جب خون ایک خاص پریشر کے ساتھ خون کی ان مہین نالیوں سے گذرتا ہے تو خون جو ٹھوس ذرات اور رقیق پانی نما محلول کا مرکب ہے تو اس میں سے صرف محلول چھن کر اس پیالے میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ایسے لاکھوں پیالوں میں جمع ہونے والا یہ محلول مختلف مرحلوں سے گذرتے ہوئے پیشاب کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور ان پیالوں سے پیشاب جمع کرنے والی نالیاں ایک دوسرے سے جڑتی چلی جاتی ہیں اور جیسے دریائے سندھ میں بہت سے چھوٹے دریا مل کر ایک بڑا دریا بناتے ہیں اسی طرح ایک بڑی نالی بن جاتی ہے اور گردے سے نکل کر ناف کے نیچے واقع مثانے سے جاملتی ہے۔پیشاب اسی بڑی نالی کے ذریعہ گردوں سے مثانے میں پہنچتا ہے۔جہاں اس کا ذخیرہ ہوتا ہے اور بہ وقت ضرورت خارج کردیا جاتا ہے۔

گردے انسانی صحت اور زندگی کے لئے انتہائی اہم ہیں۔کہا جاتا ہے کہ چار اعضاء ایسے ہیں جنکے مکمل طور پر ناکارہ ہونے کے بعد زندگی ممکن نہیں یہ ہیں دل، پھیپڑے، جگر اور گردے۔یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ دماغ کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر اسکے مکمل طور پر ناکارہ ہونے کے باوجود بھی ایک لمبے عرصے کے لئے زندگی ممکن ہے مگر ایسی زندگی نباتاتی حیات کی طرح ہوگی۔حیات دراصل ایک کیمیائی عمل ہے۔اسے جاری رکھنے کے لئے جسم میں مسلسل کیمیائی عمل جاری رہتا ہے اور ہر کیمیائی عمل کی طرح اس کے نتیجے میں بھی کچھ ایسے کیمیائی عناصر وجود میں آتے ہیں جو ہمارے جسم کے لئے نقصان دہ ہیں۔گردہ ان غیر ضروری اور ضرر رساں کیمیائی عناصر کا اخراج کرتا ہے۔اس کے علاوہ جسم میں پانی کی مقدار کو معتدل سطح پر رکھتا ہے اور کچھ اہم ہارمون بھی خارج کرتا ہے جن میں سے ایک خون کی افزائش کے لئے ضروری ہے اور دوسرا ہڈیوں کو مستحکم رکھنے اور کیلشیم کو جسم میں جذب کرنے کا ذمہ دار ہے۔

گردے کی خرابی کے نتائج

گردے کی خرابی سے جسم میں ایسے کیمیائی مادّے جمع ہوجاتے ہیں جو ہمارے جسم کے لئے نہ صرف نقصان دہ ہیں بلکہ زہر کا اثر رکھتے ہیں۔اگر ان مادّوں کو خارج نہ کیا جاسکے تو خون میں انکی سطح اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انکی وجہ سے بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے۔اگرچہ یہ مادّے کئی قسم کے ہیں مگر عام لوگوں کے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ ڈاکٹر خون میں ''یوریا'' کی مقدار سے اس کا اندازہ لگاتے ہیں۔یوریا کا لفظ یورین سے بنا ہے اور گردے کے ناکارہ ہونے سے جو طبی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے اسے ''یوریا پائزننگ'' کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ چونکہ گردے کے کام میں انسانی جسم میں بہت سے کیمیائی مادّوں کی صحیح سطح برقرار رکھنا بھی شامل ہے اس لئے ان کے ناکارہ ہونے کے بعد ایسے کئی کیمائی عناصر جو عام حالت میں ہمارے خون کا حصہ ہیں انکی سطح خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے اور یہ زندگی کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔ایسا ایک عنصر پوٹاشیم ہے۔اگر پوٹاشیم کی سطح ایک خاص حد سے تجاوز کرجائے تو یہ زندگی کے لئے بیحد خطرناک ہوسکتا ہے۔اسی لئے گردے کے مریضوں کو خاص طور سے ایسی غذا سے سختی سے پرہیز بتایا جاتا ہے جن میں پوٹاشیم کی مقدار زیادہ ہو جیسے کیلے، ٹماٹر اور موسمی وغیرہ گردے جسم میں قدرتی طور پر پیدا ہونے والے تیزاب کا بھی سد باب کرتے ہیں اسلئے گردوں کی خرابی سے خون میں تیزابیت خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔گردے پیشاب کی صورت میں پانی کے اخراج سے جسم کو نارمل حالت میں رکھتے ہیں۔جب گردے پانی کا خراج نہیں کرسکتے تو جسم میں پانی جمع ہوجاتا ہے جس سے نہ صرف ظاہری طور پر سوجن ہوجاتی ہے بلکہ اندرونی طور پر بھی پھیپڑوں، پیٹ اور دل کی جھلی میں بھی پانی بھرنا شروع ہوجاتا ہے۔

گردے کی خرابی کے اسباب

عالمی طور پر گردوں کی خرابی کی سب سے بڑی وجہ ذیابیطس ہے۔اس بیماری کی تفصیل پر میں پھر کسی مضمون میں روشنی ڈالونگا مگر مختصراً یہ بیماری جسم کے ہر عضو کو متاثر کرتی ہے۔جسم پر اسکے اثرات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ خون کی باریک بال جیسی نالیوں کو جنہیں عروق شعریہ کہا جاتا ہے برباد کردیتی ہے۔چونکہ گردوں میں ان نالیوں کا وجود سب سے زیادہ ہے اور گردے کا کام ہی ان عروق شعریہ پر مشتمل ہے اس لئے اوسطاً سترہ سال کے بعد ذیابیطس کے بیشتر مریض گردوں کی خرابی کا شکار ہوجاتے ہیں۔اس لئے یہ بیحد ضروری ہے کے ذیابیطس کی شروعات ہی میں اس پر سختی سے قابو پایا جائے اور ہر ممکنہ کوشش کی جائے اور گردوں پر اسکے اثر کی روک تھام کی جائے۔

گردے کی خرابی کی دوسری بڑی وجہ خون کے دباؤ کی زیادتی ہے۔بلڈ پریشریوں تو ہر عمر میں مضر ہے مگر کم عمری میں بلڈ پریشر کا ہونا خاص طور سے خطرناک ہے اور اسکا فوری اور کامیاب علاج نہ کیا جائے تو یہ عام طور پر گردوں کی خرابی کا سبب بن جاتا ہے۔نوجوانوں یا بچوں میں گردوں کی خرابی کے اسباب میں ایسی بیماریاں جو جسم میں انٹی باڈیز بناتی ہیں یا پھر گردوں میں پیدائشی نقص شامل ہیں۔کچھ بیماریاں موروثی بھی ہیں جیسے پالی سسٹک کڈنی۔کبھی کبھی گردے میں پتھری، پیشاب کے بہاؤ اور اسکے راستے میں رکاوٹ اور اس میں بار بار انفیکشن ہونا بھی گردے کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں۔

بیماری کی علامات

سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بہت عرصے تک گردے کی خرابی کی کوئی علامات نہیں ہوتیں۔جب تک گردہ سنگین حد تک ناکارہ نہ ہوجائے مریض کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی اور وہ اپنے اندر سلگنے والی اس آگ سے بے خبر ہوتا ہے۔آج کے دور میں گردے کی خرابی کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔جب گردے کا کام ساٹھ فیصد اور تیس فیصد کے درمیان رہ جاتا ہے یعنی مریض اپنے گردے کے ستر فیصد کام سے محروم ہوجاتا ہے اس وقت تک اسے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔چوتھا درجہ وہ ہے جب گردہ تقریباً پچاسی فیصد کام چھوڑ چکا ہوتا ہے اس پر بھی عام طور سے کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آتی لیکن جب گردے کا کام پندرہ فیصد سے بھی کم رہ

جائے اسوقت شدید علامات ظاہر ہوتی ہیں اور یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب زندگی بچانے کے لئے یا تو ڈایالیسس یا پھر گردے کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے گردے کی خرابی سے آگاہی اور اسکے علاج کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو چاہے وہ ظاہری طور پر صحت مند کیوں نہ ہو سالانہ جنرل چیک اپ ضرور کروانا چاہئے۔

گردے کی خرابی کا پتہ عام طور سے جنرل چیک اپ کے دوران خون کی جانچ سے لگتا ہے۔ خاص طور سے ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے مریضوں کو وقتاً فوقتاً گردے کے فعل کا ٹیسٹ اور پیشاب کی جانچ ضرور کروانی چاہئے۔

گردے کی خرابی کے اعلیٰ مدارج میں بھوک نہ لگنا، غذا کی لذت سے محرومی، کمزوری، خون کی کمی اور دل مالش کرنا شامل ہیں۔ جب بیماری مزید بڑھتی ہے تو سر میں درد اور قے کے دورے پڑتے ہیں بدقسمتی سے تیسری دنیا میں زیادہ تر مریضوں کے گردوں کی خرابی کی تشخیص اسی مرحلے پر ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں چونکہ باقاعدگی سے جنرل چیک اپ کا دستور ہے اس لئے یہاں عام طور پر جلد ہی گردے کی بیماری کا پتہ لگ جاتا ہے۔

ہر مریض یہ پوچھتا ہے کہ کیا میرے دونوں گردے خراب ہیں۔ حقیقت میں جب دونوں ہی گردے خراب ہوں تبھی یہ بیماری ہوتی ہے کیونکہ ایک گردے سے انسان نارمل حالت میں مکمل زندگی گذار سکتا ہے۔

گردے کی اچانک خرابی

مندرجہ بالا تفصیلات ایک دیرینہ اور طویل بیماری کے سبب گردے کی خرابی سے متعلق ہیں۔ ایسے گردے اگر ایک دفعہ خراب ہو جائیں تو انکا ٹھیک ہونا ناممکن ہے۔ لیکن گردے اچانک بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ اسکا روشن پہلو یہ ہے کہ اگر اس اچانک خرابی سے پہلے انسان بالکل نارمل صحت کا مالک ہو اور اسکے گردے بھی ٹھیک ہوں تو عام حالت میں گردے چھ ہفتوں میں روبصحت ہو جاتے ہیں۔ مگر اس دوران جب گردے کام چھوڑ دیتے ہیں تو بھی زندہ رہنے کے لئے نہ صرف بیحد پیچیدہ علاج، مانیٹرنگ اور انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وقتی طور پر ڈایالیسس کی ضرورت بھی پڑتی ہے تاکہ جسم کی کیمیائی کیفیت اور پانی کی مقدار معمول پر رکھی جا سکے۔

دراصل ڈایالیسس کا خیال ہی پہلے پہلے اسی صورتحال کے پس منظر میں آیا تھا کہ اگر کسی طرح مریض کو اس وقفہ میں سہارا دیا جا سکے اور اسکی جان ان خطرناک تبدیلیوں سے بچائی جا سکے جو گردے کے فیل ہونے سے پیدا ہوتی ہیں تو وقت کے ساتھ گردے بحال ہو جائینگے۔ یعنی ایک مصنوعی اور وقتی گردے کی ایجاد۔ اسی لئے مغربی ممالک میں ڈایالیسس کو ARTIFICIAL KIDNEY MACHINE بھی کہا جاتا ہے۔

تشخیص

اگر جنرل چیک اپ میں پیشاب اور خون کے ٹیسٹ شامل ہوں تو گردے کی خرابی کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد عام امراض کے ڈاکٹر مریض کو ماہر امراض گردہ کے پاس بھیجتے ہیں۔ گردے کے امراض کے سرجن یورولوجسٹ اور فزیشن نیفرولوجسٹ کہلاتے ہیں۔ ڈایالیسس اور گردے کی دائمی بیماری گردے کے فزیشن کے حلقۂ عمل میں آتی ہے۔

یورولوجسٹ گردے کے سرطان، پیشاب کے بہاؤ، اس میں رکاوٹ، پتھری، مثانے اور پراسٹیٹ کے غدود کے مسائل کا علاج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ دونوں باہمی تعاون سے کام کرتے ہیں۔ ماہر امراض گردہ مریض کے معائینے کے بعد خون کے مزید ٹیسٹ، کبھی کبھی چوبیس گھنٹے کے پیشاب کو جمع کر کے اس پر کچھ ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ تجویز کرتا ہے اور چند لوگوں میں گردے کی بایوپسی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے نتائج کے بعد علاج کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ جس میں ڈایالیسس شامل ہے آئندہ اور آخری قسط میں ڈایالیسس کی تفصیلات اور مریض کے ذہن میں اٹھنے والے خدشات اور سوالات کا جواب دیا جائیگا۔

بقیہ: کھوج کا سفر

پوتے اس کاٹج میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ جمال درانی دس پندرہ دن بعد چکر لگاتے اور دیکھ ریکھ رکھتے تھے اور جب شام کے سائے پہاڑوں پر اپنے سائے پھیلانے لگے اور سورج بلند و بالا پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا تو ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا اور ہم نے شمس آغا کو خدا حافظ کہا۔ ہفتوں تک یہ غائبانہ ملاقات میرے ذہن پر چھائی رہی۔ جانے کیوں اور کیسے مجھے اس شخص سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ میں سوتے جاگتے اس کے بارے میں سوچتی۔ اس کے افسانے پڑھتی اور اسے اپنے قریب پاتی۔ تصور میں ہی اس کے کاٹج میں گھومتی جس میں اب مالی بابا کے کنبے اور اس کے برتن بھانڈے اور گندے مندے بستر بکھرے پڑے تھے۔ اس کے وسیع لان میں گھومتی رہتی۔ وقت گزرتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ اس کی یاد بھی دھندلا گئی۔ البتہ مری جاتے ہوئے گھوڑا گلی کے اس موڑ سے گزرتی تو نظر ''کاشانۂ شمس آغا'' پر پڑتی اور یادیں تازہ ہو جاتیں۔

پھر ایسا ہوا کہ میرا کنبہ سیزن گزارنے نتھیا گلی جانے لگا۔ یا اور کسی پہاڑی مقام کی راہ لیتا۔ لیکن جب مدت بعد پھر مری جانے کا اتفاق ہوا تو اس پتھر پر سفید چونا پھرا دیکھ کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔ شمس آغا کا نام وہاں سے مٹ گیا تھا۔ بنگلہ شاید کسی شوقین مزاج نے خرید لیا تھا۔ اور اس دن مجھے لگا جیسے آج شمس آغا کی موت واقع ہو گئی اور ہم نے اسے دفنا دیا ہے۔ شمس آغا مر گیا۔

جمال درانی بھائی کی تلاش میں خود بہت دور نکل گیا تھا۔ موت کی اندھیری نگری میں وہ بھی روپوش ہو گیا۔ پتہ نہیں وہاں بھی شمس آغا اسے ملا یا نہیں یا وہاں بھی وہ اسے کھوج رہا ہے؟ پتہ نہیں۔۔۔

''عشق دا جادو''

(پنجابی دے متے پر متے کوی سردار موہن سنگھ دے ''ساوے پتر'' توں چوندے پتر)

ساوے پتر

اسیں نمانے ساوے پتر،
سانوں کون خیالے۔
دو دن چھاں پھلاں دی ستے،
جاگے ساڈے تالے۔
سوہنے دے گلدستے خاطر،
جان جدوں اوہ لگے،
کھا کے ترس اساں اتے وی،
لے گئے سانوں نالے۔

○

کویتا

اپنی ذات وکھالن بدلے
ربّ نے حسن بنایا۔
ویکھ حسن دے تکھے جلوے،
زور عشق نے پایا۔
پھر یا جدوں عشق دا جادو،
دل وچ کدی مستی۔
ایہہ مستی جد بول اٹھی،
تاں ہڑ کویتا دا آیا۔

○

جنگل دا پھل

جون بندے دی چنگی ہوسی،
اپر میں پچھتاندا۔
چنگا ہندا جے ربّ مینوں،
جنگلی پھل بناندا۔
دور دریڈے پاپاں کولوں
کسے جوہ دے کھونجے،
چپ چپیتا اگدا، پھلدا،
ہسدا تے مرجاندا۔

ماں

ماں ورگا گھن چھاواں بوٹا،
مینوں نظر نہ آئے۔
لے کے جس توں چھاں ادھاری،
ربّ نے سرگ بنائے۔
باقی کل دنیاں دے بوٹے،
جڑھ سکیاں مرجھاندے،
اپر پھلاں دے مرجھایاں،
ایہہ بوٹا سک جائے۔

○

ہیر

ماں سمجھاوے مڑ جا ہیرے،
کلاں جگا نہ ستیاں۔
نہیں تاں پٹھی کھل لہا کے،
تیرا ماس کھلاواں کتیاں۔
نال خوشی دے ہسّ کے اگوں،
ہیر کیہا سن مائی۔
کھلڑی لاہسیں تاں کی ہوسی؟
میرا چاک سواسی جتیاں۔

○

دل

لکڑی ٹٹیاں کڑکڑ ہووے
شیشہ ٹٹیاں تڑتڑ،
لوہا ٹٹیاں کڑکڑ ہووے،
پتھر ٹٹیاں کھڑکھڑ۔
لکھ شاباعاشق دے دل نوں،
شالہ رہے سلامت۔
جس دے ٹٹیاں 'واز نہ نکلے،
نہ کڑکڑ، نہ کڑکڑ۔

○

پیار- پندھر

چن پنیاں تک ہس ہس ودھے،
پھیر گھٹے تے روووے۔
ادھ کھڑیا پھل کوئی نہ چھیڑے،
کھڑے تاں ہر کوئی کھوہووے۔
پوری شے نوں ڈر گھاٹے دا،
ڈر نہ ادھی تائیں،
ربا! پیار میرے دی منزل
پوری کدی نہ ہووے۔

○

چپّ

پھلّ دے کولوں بلبل پچھے-
"مینوں سمجھ نہ آئی،
توں کنج بندا ہار گلے دا؟
میں کنج پھساں پھاہی؟"
پھلّ بولیا، "جیہہ اکلڑی،
تیتھوں رکّ نہ سکے۔
سو جیہاں دے ہنڈیاں پر میں،
رکھدا بھید چھپائی۔

○

وفا

وچ سکھاں دے ساری دنیاں،
نیڑے ڈھک ڈھک بہندی۔
پر کھے جان سجن اس ویلے،
جد بازی پٹھی پیندی۔
وچ تھلاں دے جس دم سسی
بیٹھ کھرے تے روندی،
نس گیا کجلا رڑھ پڑھ جانا،
ہتھ نہ چھڈیا مہندی۔

○

ایک صدی کا قصّہ

ایل۔وی۔ پرساد

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

پورا نام ایکی نینی لکشمی وارا پرساد۔ مختصر نام ایل۔ وی پرساد۔ تیلگو اور ہندی فلموں کا ایک معتبر و معزز نام۔ ایل وی پرساد 17 جنوری 1908 آندھرا پردیش کے ضلع گودھاوری کے ایک دور افتادہ گاؤں سوما ورو پاڑو کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ ایکی نینی سری مالوا اور لبسنی اماں کی دوسری اولاد تھی۔ وہ ماں کا بہت ہی لاڈلا بیٹا تھا۔ ماں کے چاؤ چونچلے نے پرساد کو اس حد تک بگاڑ کے رکھ دیا تھا کہ وہ آلسی اور نکما بن کر رہ گیا تھا۔ گو کہ وہ بڑا تیز فہم اور ذہین بچہ تھا مگر پڑھائی میں اُسکا من ہی لگتا نہیں تھا۔ وہ پڑھائی لکھائی کے نام سے ہی بدکنے لگتا تھا۔ دن بھر یا تو ماں کی دم میں گھسار ہتا تھا یا آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تفریح کا واحد زریعہ ناٹک ہوا کرتا تھا۔ ہر شہر میں ناٹک منڈلیاں ہوا کرتی تھیں جو گاؤں گاؤں گھوم کر اپنے ناٹک دکھایا کرتی تھیں۔ پرساد جہاں بھی ناٹک منڈلی کی بو باس پاتا تھا دوڑ کر وہاں پہونچ جاتا تھا۔ علاوہ اسکے تفریح کا ایک اور زریعہ فلموں کے پرانے پرنٹ ہوا کرتے تھے جن کی نمائش کا اہتمام کسی خیمے میں پردہ لگا کر کر دیا جاتا تھا۔ یہ سبھی خاموش فلمیں ہوا کرتی تھیں۔ کرداروں کو پردے پر تھرکتے دیکھ کر لوگ خوشی سے اُچھل پڑتے تھے۔ پرساد ان فلموں کو دیکھنے سب سے پہلے پہونچ جایا کرتا تھا۔ یہیں سے اُس کے اندر اداکاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے لگا۔

1924 میں جب وہ سترہ کی عمر کو پہونچ گیا تو اُس کی شادی اپنی ماموں زاد بہن سندریا مانورما سے ہوئی۔ یہ شادی فلمی انداز سے ہوئی۔ لڑکی کے گھر والے اس شادی کے بیحد مخالف تھے لیکن پرساد ایک فلمی ہیرو کی طرح سندریا کو لے کر چلا گیا۔ بہت جلد اُنکے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ اس کے ساتھ ہی پرساد کے باپ کا برا وقت شروع ہوا۔ وہ بال بال قرضے میں ڈوب چکا تھا۔ لین دار گھڑی گھڑی اپنی رقم کا تقاضا کرنے چلے آتے تھے۔ پرساد کا والد ایکی نینی سری مالو اس طرح کی زلت اُٹھانے کا عادی نہ تھا۔ وہ نہ صرف لین داروں کے آگے بلکہ اپنے گھر کے افراد کے سامنے بھی اپنے آپ کو ذلیل و خوار ہوتے محسوس کرتا تھا۔ اپنے والد کو اس صورت حال میں دیکھ کر پرساد کا دل ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اُس نے من ہی من میں فیصلہ کیا کہ اُسے اس آڑے وقت میں اپنے باپ کی مدد کرنی چاہیے پر مسلہ یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُسے اداکاری کے سوا اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔ بہر حال اُسنے یہ فیصلہ لیا کہ وہ اسی پیشے میں قسمت آزما کر کچھ روپے کما کر لائے تا کہ وہ باپ کے قرض کے بوجھ کو کسی حد تک کم کر سکے۔ بس یہی فیصلہ کر کے وہ ایک دن کسی کو کچھ بتائے بنا گھر سے نکل گیا۔ اُس وقت اُسکی جیب میں صرف سو روپے تھے۔ اُس زمانے میں سو روپے کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ اُن دنوں فلموں کا گڑھ بمبئی شہر ہوا کرتا تھا۔ اُس نے بمبئی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ ایکدن وہ ریل گاڑی پکڑ کر بمبئی کے لئے روانہ ہوا۔ اگلے روز وہ ایک سرد سی صبح کو دادر اسٹیشن پر اُتر گیا۔ دادر اسٹیشن کے پاس ہی ایک لاج تھا۔ ''راما کرشنا لاج''۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے یہ لاج کسی سادھو انڈین کا تھا۔ اس لاج کے پاس ہی ''کوہ نور'' اسٹوڈیو تھا۔ پرساد نے اسی لاج میں ڈیرہ ڈال دیا۔ چند ہفتے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی اُسے اسٹوڑیو کے اندر داخل ہونے میں کامیابی نہ ملی اُسنے محسوس کیا کہ اُس کے لئے فلموں میں کام کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اُسکے ساتھ مسلہ یہ تھا کہ اُسے نہ ہندی آتی تھی اور نہ ہی انگریزی۔ وہ کرے تو کیا کرے۔ فلموں میں ایکٹنگ کرنے کے لئے اُردو یا ہندی زبان جاننا بہت ضروری تھا۔ ان دونوں زبانوں سے وہ بے بہرہ تھا۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے لوگوں کو رجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگ اُسے دیوانہ سمجھ کر اُس پر یا تو ہنستے تھے یا اُسکا مخول اُڑاتے تھے۔ وہ اسٹوڈیو میں گھسنے کی کوشش کرتا تھا تو گیٹ کا واچ مین اُسے ڈانٹ کر بھگا دیتا تھا۔ وہ کافی مایوس اور دل برداشتہ ہونے لگا۔ اُس کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ اسٹوڑیو کے گرد لگے ہوئی ٹین کی چادروں میں سے سوراخ ڈھونڈ کر ان ہی سوراخوں میں سے دزدیدہ نظروں سے اندر جھانک کر دروں خانہ چلنے والی شوٹنگ دیکھا کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں، گھنٹوں کے سہارے بیٹھ کر اندر چل رہی شوٹنگ سے محظوظ ہو جایا کرتا تھا۔ اسی اسٹوڈیو سے ملحق ایک درزی کی دوکان تھی۔ دوکان کا مالک کئی دنوں سے اس لونڈے کی حرکتوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اُسکی دیوانگی کو سمجھ چکا تھا۔ درزی کی دوکان پر فلمی اداکاروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پرساد نے جب فلمی ستاروں کو درزی کی دوکان پر آتے جاتے دیکھا تو وہ اُنکے پاس جا کر انہیں اپنی خواہش سے آگاہ کرتا تھا۔ کچھ لوگ تو اُس سے بات کرنا بھی کسر شان سمجھتے تھے۔ کچھ تو اُس کا مذاق اُڑا کر نکل جاتے تھے۔ کوئی اُسکی مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تو اُسکی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اُسکی حوصلہ شکنی کرنے میں آنند لیتے تھے۔ غریب اور لاچار پرساد اپنا من مسوس کر رہ جاتا تھا۔

وہ مایوسیوں کے گھور اندھیارے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اُسکی خواہشیں ایک ایک کر کے دم توڑتی جا رہی تھیں۔ ایک دن جب وہ اُداس اور نا اُمید ہو کر کہ فلمی اداکاری اُسکے بس کی بات نہیں ہے۔ اُسکے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے گاؤں لوٹ جائے۔ پرساد کا دل ٹوٹ گیا۔ اُسنے اپنے بکھرے ہوئے کپڑے لتے سمیٹے اور اپنا ٹوٹا ہوا ٹرنک کاندھے پر اُٹھا کر روتے ہوئے لاج سے نکل گیا۔ اچانک درزی کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ اُسے اس حال میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اُس نے جب اُس سے استفسار کیا تو جواب میں غریب پرساد رو پڑا اور اُسنے روتے روتے اُسے اپنی روداد سنا ڈالی۔ درزی کو اُس پر دیا آ گئی۔ اُس نے اُسے اپنی دوکان میں ٹہرنے کی اجازت دی اس شرط پر کہ وہ ہر روز صبح سویرے اُس دوکان کی صفائی کیا کرے گا اور ساتھ ہی اُسکے آنے پر اُس کا حقہ بھرا کرے گا۔ اُسکے بعد اُسے کھلی چھوٹ تھی کہ وہ کام ڈھونڈنے کے لئے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پرساد نے اُسکی ہر بات قبول کی۔

ایک دن اُسے ''وینس فلم کمپنی' میں ایک بوائے کی نوکری مل گئی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں وشاداں تھا۔ یہیں پر اُسکی ملاقات ایک پنجابی نوجوان دھرے لال سے ہوئی۔ ''وینس فلم کمپنی'' میں وہ ایک سال رہا۔ اس ایک سال میں کمپنی نے نہ کوئی فلم بنائی اور نہ ہی پرساد کو کبھی تنخواہ ملی۔ اُسکی قسمت کا ستارہ پھر سے اندھیرے میں کہیں گم ہوگیا۔ دھرے لال نے پرساد کو ایک کارنیوال میں کام دلا دیا۔ یہاں پر اُسے تھوڑی بہت اداکاری کرنے کا موقع مل گیا۔ اسی بیچ وہ 'انڈیا پکچرس'' میں ایک بوائے کی حثیت سے داخل ہوگیا۔ اُس وقت وہ ایک فلم کی تیاریوں میں لگے تھے۔ فلم کا نام تھا ''اسٹار آف دی ایسٹ''۔ اس فلم کے ہدایت کار اختر نواز نے اُسے ایک چھوٹے سے رول کے لئے منتخب کیا۔ یہ خاموش فلم تھی۔ فلم بن کر تیار ہوگئی مگر کبھی ریلیز نہ ہوئی۔ دھری لال کی بہن موتی ''امپیریل فلم کمپنی'' میں کام کرتی تھی۔ اُس نے آردیش ایرانی کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں اُسے ایک چھوٹا سا رول دلوا دیا۔ پرساد کو ماہانہ تیس روپے ادا کئے گئے۔ ساتھ ہی جہاں بھی کسی پنڈت یا چوکیدار کا رول ہوتا وہ پرساد کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ ''امپیریل فلم کمپنی'' میں ایک دن اُس کی ملاقات ایچ۔ ایم۔ ریڈی سے ہوگئی جو پولیس کی نوکری چھوڑ کر فلموں میں قسمت آزمائی کرنے چلا آیا تھا۔ پرساد کی ایچ۔ ایم۔ ریڈی سے بہت جلد دوستی ہوگئی۔

ایچ۔ ایم ریڈی نے پہلی تامل فلم ''کالیداس'' بنانے کا فیصلہ کیا جس میں اُس نے پرساد کو ایک چھوٹا سا رول دے دیا۔ یہ فلم ریلیز ہونے کے بعد ریڈی نے دوسری فلم ''بھکت پرہلاد'' بناڈالی جو کہ تیلگو زبان میں بننے والی پہلی فلم تھی۔ اس میں بھی پرساد نے کام کیا۔ اپنی کامیابی سے پھولے نہ سما کر اُس نے ایک دن اپنے گھر میں ایک تار روانہ کیا۔ وہ اپنی کامیابی کا جشن اپنے گھر والوں کے ساتھ منانا چاہتا تھا۔ گھر والے تو اُسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ جب ٹرین میں بیٹھ کر اپنے گھر پہونچ گیا تو گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اتنی بے پناہ خوشی کے ساتھ ہی اُسے یہ روح فرسا خبر ملی کہ اُسکی پہلوٹھی کی بیٹی کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ چند دن گاؤں میں گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر بمبئی لوٹ آیا۔ یہاں پر اُسکے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ آنند اور رمیش۔

اسے اتفاق کہیے یا تقدیر کا کھیل کہ پرساد کو ڈائرکٹر علی شاہ کو فلم ''قمرالزمان'' میں معاونت کرنے کا موقع مل گیا۔ اسی دوران ایک کلرک جو کہ اسٹوڑیو ورکرس کی سویرے سویرے حاضری کیا کرتا تھا۔ اُس کے لئے اتنا لمبا نام دہرانا آسان نہ تھا۔ وہ روز اس نام کو دہراتے وقت کوئی نہ کوئی غلطی کر جاتا تھا۔ ایک دن اُس نے چڑ کر اُسکا نام چھوٹا کر دیا۔ اُسنے ایک نئی لکشمی ورا پرساد راؤ سے اُسکا نام ایل۔ وی۔ پرساد کر دیا۔ اُسکے بعد وہ تاحیات اسی نام سے جانا گیا۔ اسی بیچ ''امپیریل اسٹوڑیو'' نے اپنے ورکروں کی چھٹنی شروع کر دی۔ پرساد بھی چھانٹی کی زد میں آ گیا۔ اب وہ بے کار اور بے روزگار تھا۔ آٹھ سال تک وہ کسمپرسی کی حالت میں رہا۔ چھوٹے چھوٹے رول ادا کر کے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا رہا۔ ایک دن وہ اپنے بال بچوں کو لے کر اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا۔ اُس نے من ہی من میں یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنے جان پہچان والوں اور اپنے رشتہ داروں سے تھوڑا تھوڑا قرض لے کر اپنی فلم کمپنی کھول لے گا پر گاؤں پہونچ کر یہ بیل منڈھے چڑھی ہی نہیں۔ کوئی بھی فلم کمپنی میں پیسہ لگانے کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک بار پھر مایوسی اُسکی زندگی میں در آئی۔ وہ اُمید وبیم کی اسی کیفیت سے دوچار تھا کہ ایچ۔ ایم۔ ریڈی کی طرف سے اُسے ایک تار ملا جس میں اُسے ''روہنی فلمز'' کی ایک تامل فلم ''گرہ لکشمی'' میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی تھی اور اُسے فوراً مدراس پہونچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اُس نے تار ملتے ہی چلنے کی تیاری کی اور اگلے روز وہ مدراس کے لئے روانہ ہوا۔

مدراس پہونچ کر اُسکی زندگی بدل گئی۔ اُسنے ایچ۔ ایم۔ ریڈی کو اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے اسقدر متاثر کر دیا کہ اُسنے اُسے اپنی اگلی دو تامل فلم ''تنالی راما کرشنا'' اور ''گھرانی ڈونگا'' میں اہم کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔ اسی بیچ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ جاپانی جنگی جہازوں نے مدراس پر بمباری کر دی جس سے وہاں پر کھلبلی مچ گئی۔ بیشتر پروڈیوسر مدراس چھوڑ کر پونا (مہاراشٹر) کا رخ کرنے لگے جو فلمی سرگرمیوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ ایچ۔ وی۔ ریڈی بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر پونا چلا گیا جب کہ پرساد کے لئے پونا میں جا کر بسنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ اپنے عیال کو لے کر پھر اپنے آبائی گاؤں لوٹ گیا۔ وہ بڑا بے دل اور بدحواس ہوا جا رہا تھا۔ اُسے روٹی کے لالے پڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اپنے بال بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرنا اُسے بڑا دشوار نظر آ رہا تھا۔ وجہ یہ کہ اُسے فلموں کے سوا اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔ فلمی برنس تو جنگ کہ وجہ سے ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا ایسے میں وہ اپنے بال بچوں کی کفالت کیسے کرے اُسے اس ضمن میں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

ایک بار پھر اس شب دیجور میں کہیں سے ایک روشنی کی کرن آ کر چھنکی۔ اُسے فلم پروڈیوسر تانترا سبھر انیم کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ تار ملتے ہی بمبئی پہونچ گیا جہاں اُسے فلم ''کشنا جیوی'' میں پروڈکشن سپروائزر اور معاون ہدایت کار کے روپ میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ فلم تین ریل بننے کے بعد بند کر دی گئی۔ پرساد قسمت کی ستم ظریفی پر من مسوس کر رہ گیا پراب کے اُس نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اب بمبئی چھوڑ کے کہیں نہیں جائے گا جب تک وہ کچھ بنے گا نہیں۔ اُسنے معاون ہدایت کار کے طور پر بہت ساری فلموں میں کام کیا۔ اسی بیچ اُس نے پرتھوی راج کپور تک رسائی پالی اور اُسنے پرتھوی تھیٹر کے ڈراموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی اداکارانہ بھوک کو سیر آب کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران اُس کی ملاقات راج کپور سے ہوئی جو بعد میں اُسکی پہلی ہندی فلم ''شاردا'' کا ہیرو بنا۔

سن 1943 میں اُسے فلم ''گرہ پرویشم'' میں معاون ہدایت کار کی ذمہ داری نبھانے کا موقع مل گیا۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اُسے ہدایت کاری کی کمان خود ہی سنبھالنی پڑی۔ اتنا ہی نہیں۔ اُسے خود ہی ہیرو کا رول بھی ادا کرنا پڑا۔ یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوگئی۔ اسے چالیس کی دہائی کی سب سے بہترین اور شہکار فلم کا درجہ دیا گیا۔ اس فلم کے بعد پرساد نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ 1949 میں پرساد نے اپنی تیلگو فلم ''منادیسم'' میں ایک مختصر سے رول میں ایک نئے چہرے کو متعارف کیا۔ یہ نوخیز اداکار تھا این۔ ٹی۔ راماراو جو بعد میں تیلگو فلموں کا سپر سٹار بنا۔ اتنا ہی نہیں وہ کئی دہائیوں تک آندھرا پردیش کے سیاسی اُفق پر ایک درخشان

ستارہ بن کر جگمگا تا رہا۔ آندھرا کے لوگ اُسکی پرستش کرنے لگے۔

پرساد کا ستارہ عروج کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اُسکی ایک کے بعد ایک تیلگو فلم کامیابی سے ہمکنار ہوتی جارہی تھی۔ پچاس کے وسط میں اُسنے اپنا اسٹوڈیو تعمیر کروانا شروع کردیا۔ کام کا بوجھ اُس پر اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ 1950 میں اچانک بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں کے بر وقت علاج سے اُس نے اپنی بیماری پر فوراً قابو پالیا۔ ڈاکٹروں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ چند ہفتوں کے لئے مکمل آرام کرلے پر پرساد نے ڈاکٹروں کی ایک نہ سنی اور پھر سے اپنے کام کاج میں جٹ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری دم تک اُسے دوائیوں کے سہارے زندہ رہنا پڑا۔ 1956 میں اُسنے اپنی فلم کمپنی ''پرساد پروڈکشن'' کی داغ بیل ڈال دی۔ 1957 میں اُس نے ایک فلمساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے اپنی پہلی ہندی فلم ''شاردا'' بنائی جس کا ہیرو راج کپور اور ہیروئن مینا کماری تھی۔ یہ فلم فلمی شائقین کو کچھ خاص پسند نہ آئی۔ یہ ایک سماجی فلم تھی جس میں ہیروئن کی شادی اُسکے محبوب کے والد سے ہوجاتی ہے اور ہیرو کو یہ کسی بھی قیمت پر گوارہ نہیں کہ وہ اپنی سابقہ محبوبہ کو ماں کہہ کر بلالے۔ ناظرین نے اس رشتے کو قبول نہیں کیا اور فلم ناکام ہوگئی۔ پرساد نے ہمت نہیں ہاری۔ ٹھیک دو سال بعد یعنی 1959 میں پرساد پروڈکشن کی فلم ''چھوٹی بہن'' نے کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔ نہ صرف اس فلم کی خوبصورت کہانی، بلراج ساہنی، نندہ، رحمان، اور جگدیپ کی بے مثال اداکاری بلکہ اس کے سحر آفرین موسیقی نے اس فلم کو لازوال بنادیا۔ ہر راکھی کے تیوہار پر اس فلم کا گانا ''بھیا میری راکھی کے بندھن کو نبھانا۔ بھیا میرے چھوٹی بہن کو نہ بھلانا'' اور دوسرا درد بھرا گیت ''چل اُڑ جارے پنچھی اب یہ دیس ہوا بیگانہ'' آج بھی اُتنے ہی مقبول ہیں جتنے اُس زمانے میں تھے۔۔ 1964 میں پرساد کی ہدایت میں بننے والی ایک اور فلم ''بیٹی بیٹا'' بھی خوب چلی۔ یہ فلم بھی پر اثر کہانی، بے مثال اداکاری اور لاجواب ہدایت کاری سے آراستہ تھی جسے ناظرین نے خوب سراہا۔

1966 میں ''پرساد فلمز'' کے بینر تلے بننے والی ایک اور فیملی ڈرامہ ''دادی ماں'' ناظرین کو لبھانے اور رلانے میں کامیاب ہوگیا۔ 1969 میں پرساد نے فلم ''جینے کی راہ'' بنا کر ایک بار پھر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ اس فلم میں جتیندر کی قسمت کا ستارہ خوب چمکا۔ وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔ اس فلم کے بعد 1972 میں فلم ''شادی کے بعد'' 1974 میں ''بدائی'' اور 1977 میں ''جے وجے'' کوئی خاص کمال نہ دکھا سکیں۔ حالانکہ یہ سبھی فلمیں پرساد پروڈکشن کے بینر تلے بن کے ریلیز ہوئیں اور یہ سبھی فلمیں ایل۔ وی۔ پرساد کی ہدایت میں بن کر تیار ہوئیں تھیں۔

پرساد نے 1974 میں اپنے چھوٹے بیٹے رمیش کو انجینیرنگ کرنے کے لئے امریکہ بھیج دیا۔ رمیش امریکہ سے بی۔ ای۔ ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کر کے جب وطن لوٹا تو وہ اپنے ساتھ ڈھیر سارے نئے پلان لے کے آیا تھا۔ امریکہ سے لوٹنے کے بعد اُسنے تامل ناڈو میں ''پرساد فلم لیبارٹی'' کی نیو ڈال دی۔ اس لیبارٹی کو جدید ساز وسمان سے آراستہ کیا گیا۔ اس لیب کی کامیابی کو دیکھ کر پرساد پروڈکشن نے حیدرآباد، ممبئی، بنگلور، بھونیشور اور ترویندریم میں بھی فلم لیبارٹیاں کھول دیں۔ آج یہ لیبارٹیاں اپنی کارکردگی کی وجہ سے سب سے معتبر اور بہترین لیب میں شمار کی جاتی ہیں اور بیشتر فلمیں ان ہی لیبارٹیوں میں بن کر نکلتی ہیں۔ پرساد پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی فلموں میں 1961 کی فلم ''سسرال'' نے دھوم مچائی تھی۔ راجندر کمار اور بی۔ سروجا دیوی کی یہ فلم ہر خاص وعام نے پسند کی تھی۔ اس فلم نے باکس آفس کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس فلم کا سنگیت شنکر جے کشن نے دیا تھا جنکا نام اُس عہد میں فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس فلم کی ہدایت ٹی۔ پرکاش راو نے دی تھی۔

1963 میں پرساد پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی ایک اور فلم ''ہمراہی'' راجندر کمار اور جمنا کو لے کر بنائی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راجندر کمار کا ستارہ عروج پر تھا۔ کاروباری حلقے میں اُسکا نام راجندر کمار سے جوبلی کمار پڑ گیا تھا۔ یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ راجندر کمار دلیپ کمار کی نقل کر کے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُسکی کامیاب فلموں میں ''ہمراہی'' ایک یادگار فلم تھی جسے باکس آفس پر بیحد کامیابی ملی۔ یہ ایک رومانی فلم تھی جس میں جمنا کی اچھوتی اور بے مثال اداکاری، اور راجندر کمار کی جذباتی ایکٹنگ نے فلمی شائقین کو دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اُسکے بعد 1967 میں بننے والی فلم ''ملن''، جس میں سنیل دت اور نوتن نے دلفریب اداکاری کی تھی یہ فلم بھی ناظرین کو لبھانے میں پوری طرح کامیاب رہی۔ 1968 میں فلم ''راجہ اور رنک'' بنی جو پرساد روڈکشن کے لئے خوب منافع بخش رہی۔ 1970 میں جس فلم نے دھوم مچائی وہ تھی فلم ''کھلونا''۔ اس فلم نے باکس آفس کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فلم کی کہانی ناول نگار گلشن نندہ کے مشہور ناول ''چاندنی'' پر مبنی تھی جس کا عنوان بدل کے ''کھلونا'' رکھا گیا تھا۔ اس فلم میں سنجیو کمار، جتیندر، ممتاز اور شترو گھن سنہا نے اپنے رولز خوب نبھائے تھے۔ اس میں سنجیو کمار اور ممتاز کی اداکاری کو بیحد سراہا گیا تھا۔ اس فلم میں سنجیو کمار نے ایک پاگل کا رول اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ ساری فلم انڈسٹری اس اداکار کی اداکارانہ صلاحیتوں کی قائل ہوکر رہ گئی۔ اس فلم میں ممتاز نے بھی اپنی فنی صلاحیتوں سے سب کو حیران کردیا۔ اس فلم کو کئی سارے ایوارڈس سے نوازا گیا۔

پرساد پروڈکشن کی آخری کامیاب ہندی فلم ''ایک دوجے کے لئے'' تھی۔ اس فلم میں کملا احسن اور رتی اگن ہوتری کو پہلی بار ہندی ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کے بننے کے بعد کئی مہینوں تک اس فلم کو خریدنے کے لئے کوئی ڈسٹریبوٹر آگے نہ آیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس فلم میں کوئی بکاؤ چہرہ نہیں تھا۔ جتنے بھی اداکار تھے یا تو نئے تھے یا سی۔ گریڈ کے ایکٹر تھے۔ آخر مایوس ہوکر فلمساز نے اس فلم کو خود ہی ریلیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ فلم کیا ریلیز ہوئی پورے ملک میں جیسے ایک طوفان آگیا۔ جسے دیکھو وہی اس فلم کے گانے گنگنا رہا ہے۔ فلم نے باکس آفس کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فلم کے بعد پرساد پروڈکشن کے بینر تلے ''سواتی'' اور فلم ''میرا گھر میرے بچے'' بنیں جو بری طرح ناکام رہیں۔

22 جون 1994 کو پرساد پروڈکشن کا معمار ایل۔ وی۔ پرساد ملک عدم سدھار گیا۔ سو روپے کو لے کر اپنی تقدیر سنوارنے والا اپنے پیچھے عربوں کی جائیداد چھوڑ کر چلا گیا۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

میرے پاس نہ خوشی منانے کا طریقہ ہے اور نہ وہ الفاظ دستیاب ہیں جو میں آپ کے بین الاقوامی معیار کے حامل (چہارسو) کی تعریف میں رقم کر سکوں۔ اللہ نے آپ کو تدوین، ترتیب اور تزئین کا خاص وصف عطا کیا ہے جس کے باعث چہارسو ادب کی اوج پر ایک نمایاں چمکدار ستارے کی مانند ضوفشاں ہے جس میں لفظ لفظ پر سچائی، ایمانداری کو سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ مجھ گمنام شاعر کی طرح آپ نے بے شمار قابلِ قدر افسانہ نگار، ادیبوں اور شاعروں کی جس فراخ دلی سے حوصلہ افزائی کی ہے اور جس طرح دور دراز سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تخلیقاروں کو متعارف کرایا ہے میرے خیال میں اس سے بڑھ کر ادب کی کوئی خدمت نہیں ہوسکتی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے اور آپ کی توفیقات میں برکت عطا فرمائے۔

شوق انصاری (فیصل آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات!

چہارسو کا تازہ شمارہ آن لائن پڑھا اور شوق انصاری صاحب کے بارے میں آپ کے قرطاسِ اعزاز سے متاثر ہوا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے انھیں بالکل نہیں پڑھا تھا اور پہلی بار آپ کے جریدے کے ذریعے ان کے شہرِ سخن کی سیر کی اور سہلِ ممتنع میں ان کی خوش گوئی سے جی خوش ہوا۔ حسب معمول تازہ شمارے میں بھی اچھے اچھے مضامین، افسانے اور شعری تخلیقات پڑھنے کو ملیں۔ آپ کا افسانہ 'مولانا گاؤدی' خوب تھا۔ مہندر پرتاب چاند نے کشمیری لال ذاکر کے زرخیز ادبی سفر پر قابلِ تعریف مضمون لکھا ہے۔ حیدرآباد (دکن) کے ادبی اڈوں کے بارے رؤف خیر کا مضمون بہت دلچسپ تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف 'دستک اس دروازے پر' غالب عرفان نے فکر انگیز تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب واقعی ایسی ہے جس نے قاری پر وزیر آغا کی ہمہ جہت فکری اور تخلیقی سوچ کے در وا کیے ہیں۔ پروین شیر کی تحریر 'جورنی اور مونے' اور نوید سروش کی ترجمہ شدہ کہانی 'گیانی میرا یار' اثر انگیز تھیں۔

نجم الحسن رضوی (امریکہ)

محترم گلزار صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ شوق انصاری کا گوشہ پسند آیا۔ یہ ایک بڑا قدم ہے جس سے معلوم ہوا کہ چہارسو کسی لابی پر یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ جینوئن ادیب کو دامن میں جگہ دیتا ہے۔ شوق اس کے مستحق بھی تھے۔ سرورق معنی خیز ہے۔ شوق کی تصویر کیپس منظر میں ملگجے اندھیرے میں ابھرتی ہوئی شبیہ۔۔۔ فنطاسی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی۔۔۔ کچھ خواب سا بنتی ہوئی۔۔۔ اندھیرے میں روشنی کی تلاش۔۔۔ یہی شوق کی شاعری کا حاصل بھی ہے۔ باقی معمولات زیر مطالعہ ہے۔

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو شمارہ جولائی وصول ہوا۔ آپ کمال کے غواص ہیں جو ادب کے سمندر سے بیش بہا موتی تلاش کر لاتے ہیں اور پھر یہ آپ کا طرہ امتیاز ہے کہ ان قلمکاروں کو خاص طور سے گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر انکو متعارف کرواتے ہیں میرا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے کہ دس سال پہلے شاید میں کبھی کبھار کہیں شائع ہو جاتا تھا مگر آپ نے مجھے چہارسو کے ذریعہ قارئین سے روشناس کروایا۔ شوق انصاری صاحب فیصل آباد کے قریبا ایک گاؤں سمندری میں پیدا ہوئے اور خیاطی کے پیشے سے منسلک ہیں مگر قیامت کی شاعری کر رہے ہیں۔ انکے اپنے الفاظ میں ''میں اب ساٹھ سال کا ہونے کو ہوں مگر مجھے کسی ریڈیو، کسی ٹی وی، آرٹس کونسل یا کسی سرکاری ادارے سے کسی بھی طرح کی کبھی کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ مگر میرے لئے چہارسو کی وجہ سے پہلا دروازہ اب کھلا ہے'' تو آپ نہ صرف ادب کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ جو ادب کی خدمت کر رہے ہیں آپ ان کی خدمت کر رہے ہیں اور میرے خیال سے یہ بڑی حد تک صدقہ جاریہ ہے۔ شوق صاح کی شاعری نے مجھے چونکا دیا۔ اس میں کڑوی حقیقت نگاری ہے، باغیانہ جذبات ہیں معاشرے پر کڑی چوٹیں ہیں۔

کچھ اشعار دل کو لگتے ہیں:

چمن کی خستہ حالی کہہ رہی ہے
چمن کا باغباں اچھا نہیں ہے

یا پھر

یا پھر ظلم کو یوں پوجتے ہیں لوگ
ظلم ہی معبود ہو جیسے
میرے گھر کی فضا سلگتی ہے
تیرے گھر کی بہار پر لعنت

ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے

رات کتنی طویل ہو جائے
شوقِ سورج تو مر نہیں سکتا

اسی کے ساتھ یہ کہتا چلوں کہ شوق انصاری پر جمیل قمر صاحب کا مختصر

تبصرہ بعنوان ''مفلس کے بچے'' نے بھی بہت متاثر کیا اس دور میں جب ادب میں مشہور تو بڑی بات ہے متعارف ہونے کے لئے کسی بڑے کاندھے کی تلاش ضروری ہے آپ کی یہ پرخلوص جستجو کہ ان لوگوں کو متعارف کروا رہے ہیں جو خاموشی سے کسی غیر معروف کونے میں بیٹھے اپنے کلام کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

صادقہ نواب سحر (انکا نام پہلی دفعہ دیکھا ہے۔۔خوش آمدید صادقہ) کا افسانہ بیچ ندی کا مچھیرا دلچسپ تھا تحریر خوب تھی مگر مجھے لگا کہ وہ شاید کسی جنوبی ہند کی زبان کی تخلیق ہے اور انہوں نے اسکو اردو کا جامعہ پہنا دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔

شمع خالد کی کہانی گہرے پانیوں کی دوستی مجھے بہت پسند آیا اس لئے کہ مجھے بھی کراچی میں سمندر کے کنارے بلکہ بڑی حد تک سمندر کے اوپر بنا یہ ریسٹورنٹ بہت پسند ہے۔شمع نے اسکی منظر کشی بہت ہی خوب کی ہے۔ یہاں کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لئے غروب آفتاب کے جھٹ پٹے میں جانا ضروری ہے۔ جب کچھ سال پہلے میں یہاں پہلے پہل گیا تھا تو میرا دل اس کی خوبصورتی سے جھوم اٹھا تھا اور میرے دل سے کراچی کے لئے دعائیں نکلی تھیں کہ اللہ کراچی کو اسی طرح شاد و آباد رکھے اور اس کی رونقیں اسی طرح دوبالا ہوتی رہیں۔

آپ کا افسانہ مولانا گاؤدی بہت تیز اور طنز سے بھرپور کہانی ہے جس میں آپ کا اپنا خاص اسلوب جھلکتا ہے۔ آپ اس طرح کی تحریر پر خوب قادر ہیں اپنی بات بہت اثر اندازی سے کہتے ہیں۔

نظم کے حصے میں الگ الگ تبصرہ طویل ہو جائیگا۔ مختصراً ڈاکٹر ریاض کا درد کے رشتے، یوگی بہل کا خیال کا پرندہ، مہتاب چاند کی غزل، نسیم سحر کا دہشتگردی اور آئیل ٹینکر کے المئیے پر اظہار خیال اور شگفتہ نازلی کی مختصر نظم زیر زمیں قابل ذکر ہیں۔ نوید سروش اور پنجابی ترجمہ بھئی واہ۔۔۔اور کیا کہوں!!!

فیروز عالم (نیویارک)

مدیر محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

بہت دیر کر دی میں نے شکریہ ادا کرنے میں اُن تمام دوستوں اور مہربانوں کا جنہوں نے ''چہارسو'' میں میری دوبارہ آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور میری تحریر کو شرف قبولیت بخشا تھا۔ زندگی کے سفر میں کئی پڑاؤ ایسے پڑتے ہیں کہ جہاں ادھر اُدھر مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ گو میں دیارِ بین ستم ہائے۔۔۔ گونا گوں۔۔۔مگر میرا قلم سے ناطہ کبھی ٹوٹا نہیں۔قلم میری پہلی اور آخری منزل ہے۔

ان تمام گذشتہ چند سال میں ''چہارسو'' برابر میرے مطالعے میں رہا۔ اور میں تمام پرانے و نئے ادیبوں اور شاعروں کو پڑھتی رہی، سراہتی رہی۔ اس لیے کسی کا نام یا کسی کی تحریر میرے لیے اجنبی نہیں۔ سب سے پہلے میں خراج پیش کرتی ہوں ادبی پرچوں کے مدیرانِ کرام کو۔۔۔آج کے دور میں ادبی پرچہ نکالنا، گھر پھونک تماشا دیکھنا ہے کیونکہ ایک ادبی پرچہ نکال کے میں اس تجربہ سے گذر چکی ہوں۔ یہ ادبی پرچوں کا قارئین پر ہی نہیں ادیبوں پر بھی احسان ہے کہ اس مشینی اور سائنسی دور میں جبکہ نئی نسل کے لیے ایک لفظ بھی لکھنا دوبھر ہے۔ ادیب باقاعدہ لکھ رہے ہیں اور ادبی پرچے باقاعدہ انہیں شائع کر کے نہ صرف قارئین تک پہنچا رہے ہیں بلکہ ادیبوں اور شاعروں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔

''چہارسو'' میں بلاشبہ بہت معیاری ادب چھپ رہا ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ادبی دنیا کے لاتعداد مشاہیر، فراموش کردہ و گوشہ نشین قسم کے ادیبوں اور شاعروں کے خصوصی نمبر نکالے۔ اس میں ''چہارسو'' نے کوئی تخصیص نہیں برتی۔۔۔جہاں جس ملک میں کوئی گوہر نایاب نظر آیا یا جس کے کام نے چونکایا اسے تلاش کر کے چہارسو کے صفحات کی زینت بنا دیا۔ خاص طور سے انڈو پاک کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ یہ ''چہارسو'' کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ جس کے لیے میں گلزار جاوید کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ میں اپنے مہربانوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ جب عزت مآب سید ضمیر جعفری نے گلزار جاوید کے ساتھ مل کر ''چہارسو'' نکالنے کا پروگرام بنایا تھا تو سب سے پہلے میرے پاس آئے تھے۔ قلمی تعاون کے لیے اور تحریروں کے لیے۔۔۔مجھے یاد ہے کہ سب ذرا ذرا۔۔۔کسی دن لکھ بھیجونگی۔

زندگی تو ہر فرد کی بہت مصروف ہو گئی ہے دن لمحوں کی طرح گذرنے لگے ہیں مگر یہاں لاہور کی ادبی و سماجی سرگرمیاں چین نہیں لینے دیتیں۔ ہر ماہ ''چہارسو'' کا مطالعہ کر کے خط کئی تحریروں کی ستائش میں لکھنا چاہتی ہوں وقت جُل دے جاتا ہے۔ خاص طور سے مجھے اپنی بہن رینو بہل کا بے حد شکریہ ادا کرنا ہے وہ ہمیشہ مجھے محبت بھرے انداز میں یاد کرتی ہیں۔ میں ان کے افسانے شوق سے پڑھتی ہوں۔ ماشاءاللہ کیا خوب انداز ہے۔ ان کا نیا ناول ''گرد میں اَٹے چہرے'' اپنے نام کی طرح خوبصورت ہے۔ وقت نکال کر میں نے اس کو پڑھ لیا ہے۔ اپنے سامنے رکھا ہوا ہے۔ کتنے دنوں سے اس پر تبصرہ لکھنا چاہ رہی تھی اتنے ہی دنوں سے مصروفیت نے جکڑ رکھا ہے۔ آج سوچا کہ خط کے ذریعے ہی اپنے جذبات کا اظہار کر دوں۔ لکھنا بہت ہوتا ہے مجھے۔۔۔قسطیں، کالم، دیباچے، فیلپ، مضامین اور اب پہلے جیسا عالم بھی نہیں ہے۔ گھریلو جکڑ بندیاں عورت کو کسی عمر میں بھی کسی قسم کی چھوٹ نہیں دیتیں۔۔۔اور جی جان سے لکھی جانے والی چیزیں بعض اوقات التواء کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔

کاش کوئی ایسا جہان ہوا جہاں صرف قلم اور کاغذ ہوتا، گھنے درخت کی چھاؤں تلے چٹائی کے اوپر بیٹھ کر دن رات من چاہی چیزیں لکھا کرتے اور ہر صبح کوئی کچی مٹی کے کورے پیالے میں ٹھنڈا پانی اور چند کھجوریں رکھ جاتا۔ زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی۔ مگر زندگی اپنا چلن ساتھ لے کر آتی ہے۔ محترمہ جمیلہ شبنم صاحبہ نے کتنی محبت اور اپنائیت سے فرحت رشید اور بشریٰ رشید کو یاد کیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جمیلہ شبنم صاحبہ آپ کو تو معلوم ہوگا فرحت رشید (بیگم فرحت شجاع الرحمٰن) مجھے چھوڑ کر چلی بھی گئیں ''خیر قسمت میری نصیب میرے''

''چہارسُو''

میں بہت چھوٹی تھی جب مدرسہ البنات میں پڑھتی تھی۔ چند چہرے اور چند نام یاد ہیں بس۔۔۔اب کے میں اسلام آباد آئی تو آپ سے ملوں گی آپ کی تحریروں میں آپ کی شخصیت و کردار کا سارا حسن ہوتا ہے جو بھی آپ سے مل کر آتا ہے آپ کی فطری خوبیوں میں رطب اللسان ہوتا ہے۔شوق سا بڑھ رہا ہے آپ سے آ کر ملنے کا۔۔۔بہت سی باتیں کرنے کا۔۔۔اللہ آپ کو صحت وسلامتی سے رکھے۔آمین۔

میں تمام قارئین اور محترم ادیبوں، شاعروں کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کیونکہ ان کی وجہ سے میں لکھ رہی ہوں۔دعاؤں کی تمنائی ہوں کہ قلم کا حق ادا کرسکوں۔

بشریٰ رحمٰن (لاہور)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

مولانا گاؤدی کی اٹھان وسعت اور موضوع ایک ناول کی سی ہے۔ جسے جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ الہ دین کے جن کو دوبارہ بوتل میں بند کرنے کی سعی ہے۔افسانے میں Existensial analysis بھی ہے۔ مولانا گاؤدی اور صباحت اس معاشرے کے وہ کردار ہیں جو گوادر کے پہاڑ بائیل کی مانند استادہ ہیں۔سمندری طوفان، لہریں ٹکراتی ہیں مگر بلبلاتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور بائیل بدستور سر تانے کھڑا ہے۔واحد متکلم میں افسانہ یا ناول لکھنا عموماً دشوار ہوا کرتا ہے جس کے باعث Third Person میں ہی افسانے لکھے جاتے ہیں۔خروج میں ہدایت ہے''تو اپنے باپ اور ماں کی عزت کرنا تا کہ تیری عمر میں اس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہو۔ دراز ہو'' (آیت ۱۲/۲۰) لیکن وطن عزیز میں جو طوفان آئے، اسی کے سبب ایک تو Ideology کوئی نہیں ملی۔ سیاسی تقسیم کو مذہبی تقسیم کا نام دے کر ایک اسلامی ملک بنا دوسرا ہندو۔ بھارت میں انڈسٹری کے باعث امکانات تھے کہ ایک زبردست لیبر فورس سامنے آتی۔مگر وہاں برہمن ازم پھیلایا گیا اور یہاں ملا ازم دونوں ملکوں کے مفاد میں نہیں کہ مذہبی ہم آہنگی کو جگہ دی جائے۔ کشمیر کا نہ حل ہونے والا مسئلہ دونوں ملکوں میں مضبوط فوجوں اور برتر اسلحے کا متقاضی ہے۔اگر مسئلہ حل ہوتا ہے تو اسلحہ خریداری اور عسکری طاقت کا جواز نہ رہے گا۔زمانہ طالب علمی میں پاکستان کی پہلی لٹھ مار تنظیم جمیعت طلباء اسلام داڑھی رکھنے کی تعلیم دیا کرتی۔حوصلہ افزائی بھی کرتی۔لیکن زوال روس کے بعد اب کلین شیو ہونے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں ماں کا ادارہ توڑ دیا گیا۔ماں لوری دیا کرتی اللہ اللہ! اب ماں Day Care Centre میں بچے چھوڑ کر ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ 2007ء میں جب میں فرانس میں تھا تو ماں کا ادارہ دوبارہ مستحکم کرنے کے لیے ماؤں کو بدھ کے روز ایک اضافی چھٹی دے کر تلافی کی صورت نکالی۔جرمنی میں تعلیم کے دوران دیکھا کہ اکثر جرمن جھینکتے کہ تم لوگ اپنا ملک بھی ساتھ لے آئے ہو۔چھوٹا پاکستان ساتھ لے آئے ہو۔مسلمان اپنے فلیٹ میں اپنا ملک قائم کرتے ہیں، سوڈان کا ایک مسلمان کھڑکیوں کو کالے کاغذ لگا کر بیوی بچوں کو ایک ہفتے کی خوراک دے کر بند کرتا گیا تو پولیس نے انہیں باہر نکالا۔یہی حال یورپ کا ہے جہاں ہماری حرکتوں کے باعث ہمیں ناپسند کیا جاتا ہے۔افسانے میں صباحت پہ دباؤ پڑتا ہے کہ وہ حجاب لینا شروع کردے۔اس پہ تشدد بھی ہوتا ہے مگر وہ جھکتی نہیں۔ارسطو کی Three Unities کو انگلش ڈرامہ قبول نہ کر پایا۔بعینہٖ یہ افسانہ دراصل ستر برس کو لپیٹے ہوئے ہے۔زیریں طور پر ایسا تاثر بھی ابھرتا ہے کہ زمان ومکاں کو محبت پر دسترس حاصل نہیں۔ ہیرو دور بھی رہا تب بھی اس کی شخصیت بدستور صباحت کے لیے باعث طمانیت رہی۔ یہ تین نسلوں کے ذہنی الجھاؤ کی کہانی ہے۔ اس میں تکنیکی طور پر Logical handling ہوئی ہے جو کہ افسانے کے مروجہ انداز سے میل نہیں کھاتی۔جبکہ البیر کامیو اور دیگر Radical لکھاری تو کرداروں، تھیم کے بنا ہی ناول لکھنے کا درس دیتے ہیں۔اختتام میں سسپنس تو ہے مگر سبھی اپنے اصل کی جانب لوٹ آئے صباحت کو اخلاقی فتح حاصل ہوئی ایک Positive Note کے ساتھ افسانہ مثبت موڑ پر خوبصورتی کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ چہارسو نظر نواز ہوا جس کے لیے ممنون ہوں حسب سابق ''ایک صدی کا قصہ'' میری پہلی ترجیح رہا اس میں شک نہیں کہ گرودت جیسے نامی گرامی اداکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر تھے اُن کی کچھ فلمیں یقیناً ناکامی کا شکار ہوئیں لیکن یہ سب تو فلمی دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ دیپک کنول نے اُن کی موت کو صرف خودکشی لکھ کر ٹال دیا جبکہ ان کی خودکشی کا واحد سبب گرودت کی وحیدہ رحمان سے اتھاہ محبت تھی جس کے انکار سے وہ دل برداشتہ ہوگئے اور خودکشی کرلی بات وحیدہ رحمان کی ہو رہی ہے تو گرودت کا ذکر کیسے نہ آئے گرودت کی فلم مسٹر اینڈ مسز 55 جو 1955ء میں ریلیز ہوئی وہ ''ہندو کورٹ بل'' (جو اسی زمانے میں ہندوستانی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا) پر ایک خوبصورت طنز تھا اس فلم میں مدھو بالا اور للیتا پاوار کی اداکاری نے جان ڈال دی تھی بہرحال۔

اس شمارے کا بہترین افسانہ ''ماہِ کامل'' جسے مسرت کلانچوی نے انتہائی فن کاری سے صرف پانچ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ افسانہ نگار مرد ہے یا عورت۔ویسے افسانے کا ٹریٹمنٹ تو یہ ظاہر کررہا ہے کہ موصوف خاتون ہیں انسانی نفسیات بھی کیا چیز ہے جس کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔مولانا گاؤدی میں گلزار جاوید نے موڈرن معاشرت کی عکاسی کی ہے اور خوب کی ہے سارا منظر نامہ حتیٰ کہ مکالمے تک کو موڈرن بنا دیا ہے۔ یہ اپنا ملک چھوڑ کر ڈالر اور پونڈ کمانے والوں کی کہانی بیان کرتا ہے اور خوب ہے۔نگہت یاسمین بہت دنوں کے بعد نظر آئیں اور ایک خوبصورت افسانے کے ساتھ۔حسن منظر کا ''انگریزی الفاظ اردو میں'' پہلا حصہ پسند آیا دوسرے کا انتظار ہے!!

غالب عرفان (کراچی)

''چہارسُو''

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

قومی سفر کے ستر (۷۰) سالہ جشنِ آزادی کی مبارک و پُر مسرت تقریب سعید کے آس پاس جولائی و اگست کا ''چہارسُو'' ملا جو کہ شوق انصاری صاحب سے منسوب اُن کے تفصیلی تعارف، ادبی خدمات، شعری و نثری تخلیقات و ناقدین کی نگارشات پہ مشتمل تھا۔ البتہ سرورق یاسیّت اور کچھ پر اسراریت کی دھُند میں لپٹا ہوا محسوس ہوا۔

مولانا گاؤدی کے مرکزی کردار عابد اور صباحت اپنی اپنی فیملیز کے جھمیلوں میں اس طرح اُلجھے رہے کہ اُنہیں اپنی زندگی سلجھانے و سنوارنے کا کوئی لمحہ ہاتھ ہی نہیں آیا تاوقتیکہ کینڈل لائٹ ڈنر کی پُرکشش آفر اور خوشگوار ماحول نے اُنہیں نہ صرف اپنے بارے بلکہ ایک دوسرے کے متعلق سوچنے اور فیصلہ کرنے کا نایاب موقع بھی فراہم کیا جو گذشتہ تاخیر کی تلافی کے روشن امکانات کے ساتھ مطالعے کو ریلیف کا جواز بھی مہیا کرتا ہے۔۔۔

اُفق کے اُس پار کی کہانیوں کے انتخاب و تراجم کی خصوصیات میں آج کے قاری کے ذہنی انہماک و نفسیاتی دلچسپی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ پنجابی سے اُردو میں ترجمہ بھی اچھا اضافہ و تنوع ہے۔ ''دھرتی دامان'' کی نظمیں پسند آئیں۔۔۔ ''حیدرآباد کے ادبی اڈے'' عہدِ رفتہ کے اُدبا و شعراء کی اُس وقت کی تہذیبی و تخلیقی روایات و اخلاقیات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں جبکہ موجودہ ادبی منظرنامے کا تقابل کرنے لگیں تو بہت تفاوت و تضاد محسوس ہوتا ہے اور یوں اُن پہ گزرے لوگوں کی باتوں اور ملاقاتوں کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ ''ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'' کے حوالے سے قلم کے دریاؤں سے وادیٔ فن کو سینچنے والے اور خوشبو غم و دعا کو گھر کے اثاثے سے تعبیر کرنے والے محترم کشمیری لال ذاکر صاحب کو ذاتی و فنی تبحّر کے اعتبار سے بہت عمدہ خراجِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔ ان جیسے ہمہ جہت وصفات تخلیق کار یہ کہنے میں حق بجانب رہے کہ۔۔۔

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں، فسانے لگتے ہیں

''یار زندہ صحبت باقی'' کی کامیابی پیروڈی ''باس زندہ ذلت باقی'' شگفتہ اسلوب میں مضحک صورتِ حال کا بیانیہ ہے اور طنزیہ پیرائے کے باوجود دلچسپی کے تسلسل کو برقرار کیے رہی۔ وحیدہ رحمٰن بہت اچھی مسئلہ رہی ہیں بالخصوص گائیڈ میں اُن کی پرفارمنس بلاشبہ سراہنے کے لائق رہی۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

چہارسو کے توسط سے رؤف خیر صاحب کی خدمت میں سلام۔ اُن کی یادوں سے کشید کی گئی دلچسپ تحریر ''حیدرآباد کے ادبی اڈّے'' نے بہت لطف دیا۔ اگر وہ مزید یادوں کو بھی قلم بند کر سکیں تو کیا ہی اچھا ہو۔۔۔ فراق کی سرد مہری پر خورشید احمد جامی کا جملہ بہت غضب کا ہے۔

چند سیپیاں سمندروں سے چننے والوں میں میں بھی شریک ہوں۔ سفرنامہ کیا ہے ایک طلسم جو دھیرے دھیرے حیاتی آگاہی کے دریچے کھول رہا ہے۔ پچھلا شمارہ نہ دیکھ سکا سو کچھ سیپیاں مٹھی میں نہ آ سکیں۔ ''نہ جانے کیوں؟'' ایسی دل گداز تحریر کو آنسوؤں کا خراج دیے بغیر پڑھنا ممکن نہیں۔

ذوالفقار عادل کی خوبصورت غزل پر ازور شیرازی کا جاندار مضمون جہاں پڑھنے کو ملا وہیں نوید سروش صاحب نے بطور مترجم سامنے آ کر منظر کو اور خوش کن بنا دیا ہے۔ جناب شاہین، خالد اقبال یاسر اور فرح کامران کی غزلیں اپنے اپنے اسلوب میں خوب ہیں۔ محترم آصف ثاقب صاحب کا یہ شعر بے اختیار اپنی طرف کھینچ رہا ہے:

میں اپنے دل کو راضی کر رہا ہوں
ہمارے درمیاں جھگڑا ہوا تھا

عبدالرحمٰن قاضی (عارف والا)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ اپنی اعلیٰ روایات کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ آپ کی تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری ہے قرطاس اعزاز ایک ایسے منفرد سخنور کے نام کیا ہے جس کی شاعری تلخ حقیقتوں کی ترجمان ہے انہوں نے محروم طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ ملک میں طبقاتی کشمکش اور سماجی ناہمواریوں کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے اُن کا کلام کہیں بھی ''نعرہ'' نہیں بنا۔ اُن کے کلام میں عصری سچائی اور خلوص ہے۔ میرے لیے شوق انصاری کا نام نیا ہے۔ میرا خیال ہے میرے حلقۂ احباب بھی اس نام اور کام سے کم کم واقف ہیں آپ نے ایک بار پھر ہمیں حیران کر دیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں شوق انصاری صاحب نے بڑی سادگی اور سچائی سے آپ کے سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ شوق انصاری کے سوانحی کوائف کی کمی محسوس ہوئی۔ دامن انصاری، سید ایاز مفتی اور شموئل احمد کے مضامین خصوصاً اہم ہیں جو اُن کی فکر کو آگے بڑھاتے ہیں۔

محمد امین الدین ایک کامیاب افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں اُن کے ناول ''کراچی والے'' اور ''بارِ خدا'' نے خوب پذیرائی حاصل کی ہے چار افسانوں کے مجموعے ہیں۔ چہارسو میں شامل ''دو ادھورے سائے'' میں رشتوں کی اہمیت، بیٹے کی جدائی کا دکھ اور اپنا ہونے اپنا بنانے کا احساس جلوہ گر ہے۔ نیّر اقبال علوی نے ''بھنور'' میں ایک طبقے کی مشکل زندگی، عورت کی غربت میں مختلف ذمہ داریاں اور پڑوسی ملک کی انسانی حقوق کی پائمالی کو پیش کیا ہے۔ علوی صاحب کا مشاہدہ کمال کا ہے۔ تقریباً بتیس (۳۲) برس پہلے پی ٹی وی پر ایک ڈرامہ اسی کہانی سے قریب قریب کا پیش ہوا تھا کہ ایک خاتون کا شوہر اچانک غائب ہو جاتا ہے تلاش و کوشش کے بعد نہ ملنے پر خاتون کی جس دن دوسری شادی ہو رہی ہوتی ہے پہلا شوہر واپس آ جاتا ہے۔ نیر اقبال نے افسانے میں بڑے خوبصورت موڑ دیے ہیں تجسس بھی ہے۔ جان جمالی کی آمد اور محبت، فیقر لکھیو کی لاغر جسم کے ساتھ واپسی

ماروی کی کشتی اور درندوں کا اُس پر حملہ، محترمہ شمع خالد کا افسانہ ''گہرے پانیوں سے دوستی'' کا ماحول نیئر اقبال علوی کے افسانے کے قریب ہے۔ مچھیروں کے مسائل غربت وغیرہ۔ شہناز خانم اور نگہت یاسمین کے افسانے اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے توجہ حاصل کرتے ہیں۔ گلزار جاوید بھائی کا افسانہ ''مولانا گاؤدی'' میں مشرقی و مغربی تہذیب کا موازنہ کمال کا ہے۔ صرف داڑھی رکھنے کو اسلام سمجھنے والے حقوق العباد اور خصوصاً والدین کی خدمت کرنا کیسے بھول جاتے ہیں۔ جوان بہن ملازمت کرتی بری لگ رہی ہے مگر کنواری بہن کی ذمے داری اٹھانے اور اُس کے جذبات کو سمجھنے کو تیار نہیں۔ قول و فعل کا تضاد اسلام کو بدنام کر رہا ہے۔ اسلوب کی سادگی اپنی جگہ ہے۔

ڈاکٹر رؤف کی تحریر ''حیدر آباد کے ادبی اڈے'' میں ماضی کو پیش منظر میں لاکر زندہ کر دیا ہے۔ آپا جمیلہ شبنم کی تحریر محبت، یاد اور غم کے پس منظر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مہندر پرتاپ چاند کے کشمیری لال ذاکر کے لیے مضمون میں خلوص اور عقیدت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ مستقل سلسلہ ''ایک صدی کا قصہ'' اس بار وحیدہ رحمان جیسی منفرد اداکارہ سے سجا ہوا ہے۔ پروین شیر نے ''جورنی اور مونے'' میں مونے کی داستان اپنے انداز میں سنائی ہے۔ تبسم انوار، ملک زادہ جاوید، حسنین اقبال، عطا الرحمان قاضی اور فرح کامران کی غزلوں کے اشعار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ منظر ایوبی کی غزل جوان ہے نسیم سحر کی غزل کے اشعار پاکستانیوں بلکہ دردمند انسانوں کے احساسات کے ترجمان ہیں۔ غالب عرفان اور خالد اقبال یاسر کی غزلیں فکری حوالے سے اہم ہیں جس میں عصری آگہی بھی نمایاں ہے:

مری کھوج میں چار سو لشکری ہیں
میں ہر گام رشتہ بدلتا رہوں گا
(خالد اقبال یاسر)

آصف ثاقب صاحب کی غزل سادگی و پرکاری کا مرقع ہے:

میں اپنے دل کو راضی کر رہا ہوں
ہمارے درمیاں جھگڑا ہُوا تھا
نہیں بھولا تھا میں اوقات اپنی
برابر آئینہ رکھا ہوا تھا

نظم ''حرفِ ملامت'' ہمیں مسلسل سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ یونس شرر نے بیان کی سادگی میں گہری باتیں کی ہیں۔ عبداللہ جاوید کی نظم ''نہ ہوتے ہوئے بھی جو ہے'' یوگیندر بہل تشنہ ''خیالات کا پرندہ'' اور پرویز شہریار کی نظمیں اپنے موضوع میں دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

عزیز ترین گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چاہت و محبت، ہمدردی اور غمگساری، اُلفت و اخوت، رحمت و برکت، سلاست اور سادگی، وجد و سرور کا مجموعہ ''چہارسُو'' بڑی باقاعدگی سے ہمارے دامنِ زندگی کو مالا مال کرتا ہے اور اس کے صلے میں ''روپہلی چمک دمک'' کی بجائے ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' یہ بانی چہارسو کے بے لوث محبت کی کرامت ہے۔ محبت تخلیق ذات بھی اور تکمیل ذات بھی۔

قرطاس اعزاز شوق انصاری نے اپنے اصل نام شوکت علی کی شان و شوکت کو برقرار رکھتے ہوئے نپے تلے سادہ انداز میں چھوٹی بحر میں کمال کی شاعری کی ہے جس سے میں بے حد متاثر ہوئی۔ مجھے ناصر کاظمی یاد آ گئے۔ شوق کتنے سادہ اور پُر اثر انداز میں کہتے ہیں

جو نویدِ بہار دیتا ہے
باغبان اُس کو مار دیتے ہیں
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
درد جو غمگسار دیتے ہیں

ایک تابناک سیّارہ، دلوں کو جوڑنے والا شاعر، رنج کو تقسیم کر لو، مصلحت کے چراغ، نظم و ضبط کا استعارہ، شاعرِ انقلاب، شعر یکدم نہیں ہوتا چہارسو کے اوراق میں سجی یہ آٹھ تحریریں ہر قاری کے لیے انمول ادبی سرمایہ ہیں۔ آپ کا حسنِ انتخاب قابلِ داد ہے۔

نظر لگے نہ تیرے دستِ قلم کو

''ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'' مہندر پرتاپ چاند کی اثر انگیز تحریر۔ پدم شری کشمیری لال ذاکر کا ذکر خیر دستور وفا کا آئینہ دار ہے۔

جن کے سینے میں درد جلتا ہے
وہ کبھی بے وفا نہیں ہوتے

ڈاکٹر ریاض احمد ''درد کے رشتے'' محبت کی پاکیزہ لڑی میں پروئے لافانی جذبے جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔

جو درد کے رشتے جان گیا
وہ فرض اپنا پہچان گیا

نیئر اقبال علوی خلوص و محبت کا علمبردار ان کا افسانہ 'بھنور' ایک معاشرتی درد بھرا المیہ ہے۔ ماروی، لکھیو اور جان جمالی غربت زدہ معاشرے کے زندہ کردار۔

امن کی آشا کا خیر سگالی کا پیغام
جان جمالی کا ماروی کو شادی کا پیغام
سات سال بعد گم شدہ رفیقِ زندگی کی واپسی کا پیغام
ہجر کی ماری ''ماروی'' کے لیے روح پرور وصل کا پیغام

قاری دم بخود ہو کر لکھاری، تخلیق کار کی سحر انگیز تحریر میں ڈوب ڈوب کر اُبھرتا ہے۔ لیکن بدنصیب ماروی سمندری پانیوں پر انسانی ہاتھوں سے کھنچی گئی غیر فطری و غیر مرئی سرحدوں کی حرسات میں ڈوب جاتی ہے۔

اسی دیوار میں ثاقب کجی تھی
میں جس کے سائے میں سویا ہوا تھا

شمع خالد نے بڑے مؤثر انداز میں ''گہرے پانیوں سے دوستی'' کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے ''ہماری حکومتوں کے دل سمندر جیسے گہرے اور وسیع کیوں نہیں۔''

گلزار جاوید آپ نے بڑی دیدہ دلیری سے اس موضوع پر چھ صفحات پر محیط ''مولانا گاؤدی'' پیش کر کے میرے مضطرب اور بے قرار دل کو سکون اور آسودگی عطا کی ہے۔ ورنہ میرا تو یہ حال ہے کہ ''اُف اللہ ہم کچھ کہہ بھی نہیں سکتے'' جہاد کا واقعہ پڑھ کر مجھے بھی ماضی کا ایک قصہ یاد آ گیا۔

ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹے اور بہو کے ساتھ موٹر میں بیٹھی موٹروے پر رواں دواں ہے۔ بیٹا محتاط انداز میں موٹر چلا رہا تھا۔ موٹروے پولیس کے اشارے پر موٹر رک گئی۔ بیٹے نے سٹ پٹا کر کہا ''یہ کیا۔۔۔ میں نے تو کوئی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی'' موٹر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور جلد ہی پولیس کے اشارے پر چل پڑی۔ بیٹے نے غصے سے کہا یہ کیا بدتمیزی ہے۔ پہلے روکا اور پھر چلنے کا حکم دے دیا۔ پچھلی سیٹ سے بہو نے اپنی کراری آواز میں کہا ''وہ دراصل میں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے فوراً اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا پولیس والے تو نقاب پوشوں کے جانی دشمن ہیں'' یہ واقعہ پڑھ کر چہارسو کے لیے کا ٹا لگا دیں تو میں بُرا نہیں مناؤں گی۔ مجھے آپ کی خوشنودی مطلوب ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ اور آصف ثاقب کی شکر گزار ہوں۔ یہ بے لوث توصیفی کلمات میرے لیے توانائی کا ٹانک ہیں۔

''نہ جانے کیوں؟'' نمناک آنکھوں سے پڑھا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے اگست میں برسی ہوتی ہے اور اگست میں ہی اس کا نوحۂ غم آپ نے شائع کر کے ہم سب کو شکر گزاری کا موقع دیا۔

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

محترم گلزار صاحب، آداب۔

تازہ شمارہ شوق انصاری کے نام قرطاسِ اعزاز دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ فیس بک پر تو ان کا کلام پڑھنے کو مل جاتا تھا آپ کے توسط سے اُن کی منتخب شاعری پڑھنے کا موقع ملا۔ حسبِ معمول براہِ راست دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ شوق صاحب کی سادہ طبیعت نے بڑا متاثر کیا۔ اُن کی چھوٹی بحر کی شاعری میں ایمانداری، درد، انقلاب، احتجاج، حوصلہ سبھی عناصر موجود ہیں۔ کتنی سادگی سے کہتے ہیں:

اپنا حق میں چھین بھی سکتا ہوں
خود ہی دو گے تو عنایت ہو گی

کس کس شعر پر داد دیں لکھنا مشکل۔ شخصیت کے انتخاب کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔ چہارسو ایسا پلیٹ فارم/انسٹی ٹیوٹ ہے جس نے ادب سازوں، گمنام ہستیوں سے آشنا کرایا۔

اس بار تو افسانہ پڑھنے والوں کی آپ نے عید کرا دی۔ دس افسانے اور سبھی دلچسپ۔ صادقہ نواب سحر کا افسانہ پہلی بار چہارسو میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اُن کا افسانہ ''پیچ ندی کا مچھیرا'' اور نیئر اقبال علوی کا ''بھنور'' کا پس منظر ایک جیسا ہے مگر دونوں کا اسلوب اور بیان اپنی اپنی جگہ عمدہ۔ اس بار تو شمع خالد صاحبہ نے بھی سمندر کی خوب سیر کروائی۔ رومانہ رومی کے ''کرارے نوٹ'' نے تو معاشرے میں پھیلی کرپشن کی وبا کو بے پردہ کر دیا۔ ''دوادھورے سائے'' میں محمد امین الدین نے بڑی خوبصورتی سے میاں بیوی کے رشتوں کی نفسیات سے پردہ اٹھایا ہے۔ عام سے موضوع کو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ''مولانا گاؤدی'' میں گلزار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں معاشرے کی بدحالی کا تیکھی نظر سے جائزہ لیا ہے اور مذہبی ٹھیکیداروں کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی خوبصورت کوشش کی ہے جس میں وہ ہمیشہ کی طرح کامیاب رہے۔ ''گیانی میرا یار'' (پنجابی کہانی کا ترجمہ) دلچسپ رہا۔

زہریلے سانپ کی اگلی قسط کا انتظار شروع ہو گیا۔ ''افق کے اُس پار'' کا تبصرہ پسند آیا کیوں کہ اس میں شامل بیشتر افسانے چہارسو میں پڑھنے کا موقع مل چکا ہے۔ ''نہ جانے کیوں؟'' آپا جمیلہ شبنم کا مضمون دل کو اداس کر گیا۔ گھر کے بچے کا اچانک بے وقت رحلت کر جانا ساری عمر کے لیے پیچھے والوں کے دل پر داغ چھوڑ جاتا ہے۔ ہاتھ خالی ہو جاتے ہیں تو رہ جاتی ہے صرف یادیں۔

''ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'' ذاکر صاحب پر لکھا چاند صاحب کا بھرپور مضمون ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور اُن کی ادبی خدمات کی پوری تفصیل اس میں شامل ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

''رس رابطے'' ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد صاحب کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انہیں میرا ناول پسند آیا اور انہوں نے میرے دوسرے ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' کا پیش لفظ لکھ کر نہ صرف حوصلہ بڑھایا بلکہ مجھے اعزاز بخشا۔ باقی مضامین اور شاعری کا مطالعہ جاری ہے۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

طویل انتظار کے بعد جولائی، اگست کا ماہنامہ چہارسو نظر نواز ہوا کیونکہ مئی جون کا شمارہ انتظار میں ہی کہیں گم ہو گیا اس لیے یہ دن بڑی بے سکونی میں گزرے۔ تازہ شمارے نے یہ گرد و غبار دھو ڈالے آپ کا بے حد شکریہ۔ قرطاسِ اعزاز شوق انصاری کے نام کر کے آپ نے ایک منفرد شاعری کو متعارف کرانے کی بے حد قابل داد کوشش کی ہے۔ ایسی شاعری بہت کم اہل فن کو عطا ہوتی ہے۔ افسانوں میں یوں تو سب افسانے اپنی جگہ خوبصورت ہیں لیکن ''مولانا گاؤدی'' اپنے موضوع کے اعتبار سے سب افسانوں میں ایک اچھوتا افسانہ ہے۔

تابش خانزادہ کا ناول ''زہریلا انسان'' بڑی کامیابی سے آگے بڑھ

رہا ہے۔ پروین شیر کی تحریر کا عنوان فہرست میں اور ہے اندر کے صفحات میں عنوان تبدیل ہے بہرحال معلوماتی تحریر ہے۔ جناب رؤف خیر کی تحریر ''حیدرآباد کے ادبی اڈے'' میں بہت سے اہل ادب سے ملنے کا موقع ملا۔ غزلیات میں نسیم سحر، خالد اقبال یاسر، شگفتہ نازلی، روپا صبا، نظر الدین نظر کا کلام پسند آیا۔ ڈاکٹر ریاض احمد کی پسندیدگی اور خلوص ومحبت کا شکریہ۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

صاحبِ چہارسو، پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

جب ملو گے تو عید کر لیں گے
چاند کب بام پر نہیں آتا

ضرور آتا ہے بام پر شوق انصاری صاحب۔ آپ کے اسی شعر سے ہماری تو عید ہوگئی۔ محترم گلزار جاوید! آپ نے شوق انصاری کو ہمارے لیے ''جیسا'' کر کے ''عید شعر'' سے نوازا۔ حاصل گزارش یہ کہ شوق کلام اور خیالات پڑھ کے گونہ اطمینان ہوا۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ شوق انصاری صاحب خوب کہتے ہیں اور خوب بولتے ہیں۔ خالد اقبال یاسر سے تو یاداللہ پرانی ہے مگر ملاقاتیں کم بہت کم ہوگئی ہیں۔ بلکہ ہیں ہی نہیں۔ خوب کہا ہے:

عدو سے مری فوج ہی جا ملی ہے
میں ہر رات خیمہ بدلتا رہوں گا

چہارسو کی ساری چیزیں اچھی ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین کے خط سے خوشی ہوئی۔ وہ ''توقیر قلم'' کے دھنی ہیں۔ ان کی علمی کاوشیں سدا بہار ہیں۔ زندہ رہنے والی اور ہمہ دم لائقِ مطالعہ۔ پیارے یوگیندر بہل، ڈاکٹر ریاض احمد، نوید سروش کی نوازشیں جاری ہیں۔ میں بھی تو ان کا دلدادہ ہوں۔ ڈاکٹر ریاض احمد پشاور کے ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور کے بعد پشاور کا دبستان ادب یاد افروز ہے بلکہ یادگار ہے۔ اس باب میں کراچی کو علمی ادبی استحکام حاصل ہوا ہے۔ مشہور افسانہ نگار آغا گل کے خط سے رس رابطے میں اور رسیلہ پن در آیا ہے۔

دیپک کنول صاحب نے وحیدہ رحمان کی بات کی ہے اور خوب کی ہے۔ فلم ''دل دیا درد لیا'' میں دلیپ کمار کے بالمقابل اس کی اداکاری زبردست ہے اور دلیپ کمار کے وہ ڈائیلاگ جو غصے میں وحیدہ رحمان سے بولے گئے تھے کیا غضب کے تھے۔ میں نے لتا منگیشکر کے متعلق ایک نظم کہی تھی بعنوان تقویم جو رسالہ ''پیامی'' لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ آپ کے لیے یہاں خط میں وہ لکھتا ہوں۔

ملے جادوگری کا حسن لے میں
ساعت میں بپا ہے رام لیلا
لبِ پرنور ہے جھرنا صدا کا
پری موسیقیوں کی پرفشاں ہے
گلے میں شاعری کا فن رواں ہے
محبت اور شرافت سر بسر ہے
جلی ہے شمع پروانوں کی خاطر
غِنا پیکر ہے انسانوں کی خاطر
تلطف خیز کاشانوں کی خاطر
نگار میں ہے یہ ویرانوں کی خاطر
مدھرتا، وسعتِ اردو زباں ہے
یہی تقویم نغموں سے عبارت
سروں میں ایک دنیا ہے سراپا
سنو لوگو لتا جی گا رہی ہیں

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کے جولائی اگست کے شمارے میں آپ نے ایک ایسے شاعر کا ہاتھ تھاما ہے جسے اس قدردانی اور حوصلہ افزائی کی بجا طور پر ضرورت تھی اور یوں آپ نے شوق انصاری کو چہار کی جانب سے پہلا ایوارڈ عطا کیا ہے جو آپ کی مردم شناسی اور ادب نوازی کا ثبوت ہے۔ شوق انصاری کی شاعری عام آدمی کے دکھ درد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نظام کے جبر وتشدد کے خلاف زبردست اور موثر احتجاج کی صدا بھی بلند کرتی ہے۔

شمارہ میں آپ نے کافی محنت کر کے جن افسانوں ومضامین کا انتخاب کیا ہے وہ محنت یوں رنگ لائی ہے کہ بعض افسانوں اور مضامین کو دوبارہ پڑھ کر بعض فیملی ممبرز کو سنایا تاکہ وہ بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ آپ کا اپنا لکھا ہوا افسانہ ''مولانا گاڈی'' ایک بہترین تحریر ہے جو بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز اور باعثِ عبرت بھی ہے۔ اگر لوگ اعتدال میں رہتے ہوئے اپنے وطن کو اپنا اصلی گھر سمجھ کر اپنے فرائض ادا کریں اور اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لیں تو غیروں کے ملک میں دوسرے درجے کے شہری اور ناپسندیدہ اجنبی کی حیثیت سے بچ کر باعزت اور مطمئن زندگی گزار سکتے بشرطیکہ محنت سے کام کریں کیونکہ محنت اور لگن کا کوئی متبادل نہیں۔ افسانہ کا اختتام بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔

رؤف خیر کا مضمون ''حیدرآباد کے ادبی اڈے'' ایک دلچسپ تحقیقی مقالہ کی مانند ہے جو ادبی دنیا سے متعلق شخصیات کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہے۔ اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ پروین شیر کی مہم جوئی اور سفرنامے بڑے گہرائی اور تفصیلی مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں جن کو پڑھتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے جیسے وہ اپنی نظروں سے مشاہدہ کرتے ہوئے شریک سفر ہے۔ اس بار بھی ''جورنی اور مونے'' حسبِ سابق ایک دلچسپ اور خوبصورت تحریر ہے اور اپنے مشاہدات قارئین ''چہارسو'' سے شیئر (Share) کرنے پر وہ شکریہ کی مستحق ہیں۔

''پنجرے میں بند چڑیا'' نگہت یاسمین کی ایک دلچسپ اور جذباتی تحریر ہے جسے پڑھ کر دیر تک دل اُداس رہتا ہے۔ طاہر نواز کا افسانہ ''جنرل وارڈ'' میں جنرل وارڈ کے مریضوں کے حالات وواقعات اور مشاہدات کی سو فیصد صحیح

تصویر کشی کی گئی ہے۔ نیز شدتِ جذبات کے موقع پر انسانی جذبوں کا خوبصورت پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے جیسے ''نعیم کی ماں نے ہچکیوں کو روکنے کے لیے دوپٹے کا پلّو سختی سے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ نیّر اقبال علوی نے 'بھنور' میں مچھیروں کی جفاکش زندگی اور ان کے ساتھ پیش آنے والے اندوہناک حالات کا بڑے موثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ ''کرارا نوٹ'' رومانہ کی ایک لاجواب تمثیلی اور تصوراتی (Immaginative) تحریر ہے جس میں پانچ ہزار روپیہ کا نیا نوٹ کن کن ہاتھوں میں سفر کرتا ہے وہ ہر کسی کے تصور سے باہر ہوتا ہے ایک نوٹ کی عام عمر پانچ چھ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ آج جو نوٹ آپ بینک سے لائے ہیں کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ کیا کیا مناظر دیکھتا ہوا اور کن کن ہاتھوں سے ہوتا ہوا اپنے انجام کو پہنچے گا۔

شمع خالد نے ''گہرے پانیوں سے دوستی'' میں نئے انداز سے سمندر کی رومانوی خوبصورتی اور غریب مچھیروں کے سماجی اور معاشی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ان تلخ تجربوں کا ذکر کیا ہے جو غلطی سے سمندری حدود کراس ہو جانے کی صورت میں پڑوسی ملک کی جیلوں میں ان غریب مچھیروں کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں۔ ''ماہِ کامل'' مسرت کلانچوی کی ایک دلچسپ جذباتی اور سبق آموز تحریر ہے جو اردگرد کے واقعات سے لی گئی ایک کہانی ہے جس میں بڑی عمر میں بچوں کی موجودگی میں تنہائی پر قابو پانے کے لیے دو افراد کی افسوسناک شادی کا ذکر ہے جو افسوسناک انجام کی وجہ سے قاری کو اداس کر دیتی ہے۔ ''نہ جانے کیوں'' آپا جمیلہ شبنم کی لکھی ہوئی درد ناک اور حقیقی کہانی ہے جو دلوں کو چھوتے ہوئے بار بار اُداس کر دیتی ہے۔ ایس ایم معین قریشی کا طنز و مزاح سے بھرپور مضمون ''باس زندہ ذلت باقی'' پڑھ کر لطف آیا۔

شاعری میں آصف ثاقب، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، یوگیندر بہل تشنہ، شگفتہ نازلی، روپا صبا، یونس شرر، مناظر عاشق ہرگانوی، فرح کامران کے کلام نے بہت متاثر کیا۔ اور سب سے آخر میں اس تمام ادب کو ایک خوبصورت رنگ دے کر ''چہارسُو'' کی صورت میں قارئین تک پہنچانے پر آپ کے لیے محبت اور احترام کے جذبات کے ساتھ دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترمی گلزار جاوید، تسلیمات۔

میرے لیے یہ امر انتہائی خوشی کا باعث ہے کہ آپ نے میرے بھائی شوق انصاری پر چہارسو کا خاص نمبر ترتیب دیا۔ انصاری صاحب سے میری انسیّت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرے والدِ گرامی قدر حضرت سید عبدالستار مفتیؒ کے قابلِ فخر شاگردِ رشید ہیں جو مفتیؒ کا نام چاردانگ عالم میں روشن کیے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے کہ میں انصاری صاحب کی مکمل شخصیت کا احاطہ کرنے میں ناکام رہا بہرگام جو میں لکھ سکا یقیناً کچھ دوسرے احباب کی نظروں میں ان کے پہلو نمایاں ہوئے ہوں گے لیکن میں اگر نہ لکھتا تو میرے نزدیک یہ ناقابلِ معافی جرم ہوتا۔ امیدِ واثق ہے کہ دوسرے جرائد بھی ''چہارسو'' کی روش پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ ذرائع ابلاغ اور میڈیا کی جانب سے ایک اچھے استاد شاعر کے ساتھ جو مسلسل زیادتی ہو رہی ہے اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔

سوشل میڈیا پر شوق انصاری عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکے ہیں۔ حبیب جالب بھی اس ڈگر کے شاعر تھے مگر شوق انصاری صاحب اردو کی دنیا میں ادبی محاذ کے مجاہد کے نام سے یکساں جانے جاتے ہیں۔ شوق انصاری نمبر شائع کرنے پر آپ کو بہت بہت مبارکباد۔

ایاز مفتی (امریکہ)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

سب سے پہلے برادرم کو شوق انصاری نمبر شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کئی سالوں سے شوق انصاری صاحب کی فکری جہات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر شوق انصاری میرے خیال کی سرحدوں سے باہر وسعت اختیار کرتے رہے۔ قلم کا پرچم بلند کرتے ہوئے شوق انصاری نے استحصال اور حق تلفیوں کے خلاف ایک جنگ ہی نہیں لڑی بلکہ جہاد کا بھی آغاز کیا۔ حق پسندوں کو ان کی آواز کا اس قدر احترام نہیں جس قدر ہونا چاہیے اس جہاد میں انصاری صاحب نے کما حقہٗ اپنا کردار خلوصِ دل سے ادا کیا۔ شوق انصاری کا یہ فریضہ اس درجہ کمال کو پہنچ چکا ہے کہ اب باقاعدہ اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرا کر مقالے لکھے جائیں اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو اردو ادب ایک بڑے سرمائے سے محروم رہ جائے گا۔ ''چہارسو'' نے میرے خیال سے ایک نیک کام کا آغاز کر دیا ہے اور یہ ایک اہم کام اور نیک فال ہے۔

امین جس پوری (بھارت)

گلزار جاوید صاحب، احترام۔

آپ کے مجلّے نے مجھے ناچیز کو بھی شوق انصاری کے کلام اور شخصیت پر لکھنے کا اعزاز بخشا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ شوق انصاری کی فکری جہات کو تحریر کر سکوں مگر کوشش کے باوجود مطمئن نہیں ہو سکی۔ میں سوچتی ہوں کہ ماہنامہ ''چہارسو'' نے بہت بڑا کام کیا کہ میرے شہر کی نایاب شخصیت (شوق انصاری) کی آواز کو الفاظ کے پہناوے میں محفوظ کیا۔ اس بارے میں، میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں اور جمیل قمر صاحب (کینیڈا) کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے آرٹ کونسل فیصل آباد میں اپنی کتاب ''سکوت بولتا ہے'' کی تقریب رونمائی کے موقع پر مجھے شوق انصاری صاحب سے متعارف کرایا۔ انصاری صاحب کو مبارک کہ ابھی گلزار جاوید صاحب جیسے حقیقی ادب شناس پاکستان میں موجود ہیں جو آپ جیسے شعراء کی آواز کی گونج کو بلند اور زندہ رکھے ہوئے ہیں اور گلزار جاوید صاحب کو بھی اس عظیم کارنامے پر بہت بہت مبارکباد۔

پروفیسر صفیہ حیات (فیصل آباد)

..... پسِ اشک (ناول) .....

گزشتہ کل ہماری بیٹی نے ہم سے اچانک دریافت کیا''ابو جان! تایا جان ہندو ہیں یا مسلمان؟''ہم نے انجان بنتے ہوئے دریافت کیا کون سے تایا جان؟ تو بیٹی نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا''انل تایا'' تمہارا مطلب بھائی انل ٹھکر صاحب سے ہے؟ بیٹی نے جواب میں''جی'' کہا تو ہم نے بالکل سپاٹ لہجے میں اُسے بتلایا کہ اگر میں تمہیں اُن کا مذہب بتلا دوں تو تمہارے اور ٹھکر صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی۔بس اتنا جان لو کہ تمہارے تایا بھائی انل ٹھکر سراپا انسان ہیں۔اُن کا اوڑھنا، بچھونا حتیٰ کہ مذہب بھی انسانیت ہی ہے۔ہمارے جواب کو سن کر بیٹی کچھ اس طرح سر مارتے ہوئے چلی گئی کہ

؎ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سو جناب یہ تو ہم سرِ دست بتلانے سے قاصر ہیں کہ''پسِ اشک'' بھائی انل ٹھکر کا کون سے نمبر کا ناول ہے مگر''پسِ اشک'' کا مواد ہمیشہ کی مانند اوّل درجے کا ہے جسے شروع کرنا شرط ہے اور اختتام تک اُس سے جدا ہونا آپ کے، میرے یا''پسِ اشک'' کے قاری کے بس میں قطعی نہیں ہے۔ہماری رائے کی حقیقت جاننے کے لیے''پسِ اشک'' کا مطالعہ اور اولین فرصت میں اس لیے ضروری ہے کہ''پس اشک''ایک ناول ہی نہیں بلکہ برفی کی ایسی قاشیں ہیں جس میں انسانوں کے دکھ، سکھ، آشا، نراشا، کامیابی اور ناکامی بڑی نفاست اور سجاؤ کے ساتھ پیش کی گئی ہیں جو ہر مزاج اور ذوق کے قاری کو کبھی ہنساتی، کبھی رلاتی اور کبھی مصنف کے مطالعے اور مشاہدے پر چونکاتی بھی ہے۔ .....انوار شریف

اشاعت:۲۰۱۷ء، قیمت:۴۰۰روپے، دستیابی: ماڈرن پبلیشنگ، دریا گنج، دہلی۔

..... دشتِ وفا (ناول) .....

''مجھے آغا گل کے افسانے بہت پسند ہیں کیونکہ بلوچستان نے مجھے ہمیشہ Fascinate کیا ہے۔میں بلوچستان میں چند ایام گزار چکی ہوں۔ بلوچستان کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔فکشن تو بالکل نہیں دیکھا۔آغا گل کے افسانوں میں Humani Tarianism کی جو زیریں لہریں ہیں اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے آج کل یہ صنف ہمارے ادب میں مفقود ہوتی جا رہی ہے۔یا اسے مختلف النوع معنی پہنا دیے گئے ہیں۔مجھے ان کے افسانوں میں''روپے کا جن'' سب سے زیادہ پسند ہے۔جہاں تک ناول کا سوال ہے تو اس باب میں بھی آغا گل اپنا الگ اسلوب رکھتے ہیں اور معلومات کے ایسے خزینے پیش کرتے جو قاری کی دلچسپی کے ساتھ تہذیب کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ .....قرۃ العین حیدر

اشاعت:۲۰۱۷ء، قیمت:۳۰۰روپے، دستیابی: فکشن ہاؤس۔لاہور۔

..... شبلی اور جہانِ شبلی .....

علامہ شبلی کا دائرہ کار بے حد وسیع اور متنوع ہے۔علم وادب، شعر ونقد، تاریخ وسیاست، تعلیم وتدریس، سیرت وسوانح، کلام وعقائد ان کے بنیادی موضوعات تصنیف وتالیف تھے۔علاوہ ازیں ملی دردمندی اور مسلمانانِ عالم کے لیے جدوجہد گویا ان کے خون میں شامل تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے دائرہ کار میں وسعت اور نیرنگی پیدا ہوتی چلی گئی اور انہوں نے ملت کے لیے ایسے لازوال کارنامے انجام دیے جس کی داستان مستقل کتابوں کے علاوہ معاصر رسائل وجرائد کے صفحات میں بھی محفوظ ہے۔زیرِ نظر کتاب''شبلی اور جہانِ شبلی'' میں اس نوع کے چند مطالعے وتجزیے بھی شامل ہیں۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالۂ وگل سے کلام پیدا کر

.....محمد الیاس الاعظمی

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۲۵۰، دستیابی: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، بھارت۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
نملوس کا گناہ
اور دوسری کہانیاں
شموئل احمد
بات کہی نہیں گئی
سیمیں کرن
میرے ہونے میں
کیا برائی ہے